نیاز فتح پوری

شخصیت اور فن

ڈاکٹر عقیلہ شاہین

انجمن ترقی اردو پاکستان

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان 521
ISBN- 969-403-059-5

سالِ اشاعت: 1995ء
تعداد: پانچ سو
قیمت: -/200
طابع: فضلی سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ
اردو بازار۔ کراچی

(دیگر سرکاری امداد یافتہ اداروں کی طرح
انجمن ترقی اردو کو بھی اشاعتِ کتب کے لیے
اکادمی ادبیات پاکستان کے توسط سے امداد ملتی ہے)

انتساب

اپنی پیاری اُپی، اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری
کے نام جن کی محبتیں زندگی کی کڑی دھوپ
میں میرے لیے گھنا سایہ ہیں۔

فہرست



بک ٹائپنگ (ان پیج اُردو) کارنر

خواہش مند حضرات اپنا مضمون، مقالہ، تحریریں، تھیسیز یا کتاب ان پیج اردو ٹائیپ ورک کے لیے رابطہ کریں۔

مہر محمد مظہر کاٹھیا۔

03037619693

نعمانِ کتب (آن لائن کتب خانہ)

حالی حال ان تمام موضوعات کی کتب کی فراہمی

ادبیات	اقبالیات	غالبیات	لسانیات	مقالات
تحقیقات	انتقادیات	مکتوبات	اسلامیات	طب
عروض و آہنگ	انشائیے	افسانے	ڈرامے	ناول
سوانح	آپ بیتی	خاکہ نگاری	تاریخ	خطوط
دیگر اصناف	تہذیب و تعلیم	لغات (تہذیب کی)	[redacted] کشکول	تاریخ ادب اردو
اردو جنرل۔ سہیل بختی	فرہنگ و اصطلاحات	شعری مجموعے /مختلف رسائل نمبر	نقوش نگار، فنون نمبر کے شمارے	قدیم و جدید شعراء کے دواوین و کلیات

ان کے علاوہ:

☆ (IUB)ایم اے اردو (سال اول و دوم) کے حل شدہ پیپرز 2018 تک دستیاب ہیں۔

☆ انڈیا سے درآمد شدہ کتب کی فراہمی کی سہولت۔

☆ ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی سکالر حضرات کے لیے خصوصی حوالہ جاتی کتب کی فراہمی کی سہولت۔

☆ لائبریری آرڈر اور شائقین کتب والے حضرات رابطہ کریں۔

﴿نوٹ﴾

☆ آرڈر بذریعہ واٹس ایپ یا کال پر نوٹ کروائیں۔

مہر محمد مظہر کلتھیا

0303-7619693

مہر محمد مظہر کاٹھیا
چشتیاں منڈی پنجاب،پاکستان-
0303-7619693

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

حرفِ چند

علامہ نیاز فتح پوری کبھی کے ایک ادارہ بن چکے ہیں۔ ان پر پاک ہند جامعات اور علمی حلقوں میں برابر کام ہوتا رہتا ہے۔ "بزم نیاز و نگار" کراچی ان کی کئی تصانیف کے نئے ایڈیشن شائع کرتی رہتی ہے۔ یہی بزم گزشتہ پندرہ برسوں سے ایک سالانہ نہایت موقر اجتماع منعقد کرتی ہے جس میں پاک ہند سے مدعو ایک مہمان کلیدی مقالہ پڑھتا ہے اور حاضرین سے اہم سوال و جواب کا ریکارڈ بھی محفوظ کرلیا جاتا ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری جیسے بڑے ادیب اور مفکر جس طرح ذہنوں کو نسل در نسل متاثر کرتے ہیں اس کی تحقیق بجائے خود ایک بڑا اور نہایت دلچسپ مرحلہ ہے۔ ابھی تک ہمارے ہاں ایسی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ مثلاً ول ڈوراں نے "تہذیب کی کہانی" میں مغرب کی پوری اٹھارہویں صدی کو والٹیر کی صدی کہہ دیا تو صرف ایک جذباتی یا برتائے عقیدت ذاتی کوئی فیصلہ نہ تھا بلکہ اس نے اس باب میں یہ بات بے شمار شواہد کے ساتھ ایک بھرپور تجزیاتی اور تقابلی مطالعے کے بعد کہی ہے۔ پاک ہند مسلم دنیا میں کسی لحاظ سے یہ صدی اقبال صدی کہلانے لگی ہے۔ جزواً غالب صدی بھی کہلاتی ہے کیونکہ خالص فکری ادب کے حوالے سے علامہ اقبالؒ اپنے عظیم مقام کے علاوہ، چند جہتوں میں، غالب کی عظیم ترین توسیع بھی ہیں۔ لیکن یہ گزارش محض اس موقف سے منسلک ہے کہ ان کی اور ان کے بعد کی نسلوں پر علامہ نیاز فتح پوری کے اثرات ایک معقول حد تک تلاش اور نشاندہی کے بعد کسی "فہرست" میں مرتب نہیں ہوئے۔ پوری تلاش اور نشاندہی اول تو ممکن نہیں اور جاری بھی رہتی ہے اور ضروری نہیں کہ کوئی صدی کسی سے منسوب ہو۔ بعض صدیاں اس باب میں بنجر بھی رہی ہیں۔ بعض میں کئی کئی نابغہ روزگار پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی صدی کو بھی متاثر کیا اور بعد میں کئی کئی صدی تک متاثر کرتے رہے...... آج تک متاثر کرتے ہیں۔ نیاز صاحب کے انتقال پر ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ مقالہ مکمل ہونے کے سال تک بائیس برس ہوئے تھے۔

لیکن احباب محسوس اور تسلیم کر چکے ہیں کہ ان کی بہت سی ادبی صفات سے متاثر ہونے کے علاوہ تیسری دہائی میں ہی علامہ نیاز فتح پوری کی تحریک خرد افروزی نے بہت جلد پاک ہند کے اردو داں طبقے کو کئی فکری جہتوں میں اپنانا شروع کر دیا تھا اور ان کا یہ مشن آج بھی جاری ہے۔ دراصل یہ اثر بیشتر غیر شعوری طور پر اذہان و قلوب میں سرایت کرتا ہے۔ گو ایک مدت کے بعد اس کی کھلی شناخت بھی ہو سکتی ہے جیسی کہ (مثلاً) دل و دماں نے کی تھی۔ علامہ اقبالؒ کے اثرات تو واضح طور پر شناخت ہوتے جاتے ہیں۔

یہاں ہم ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا خصوصی شکریہ ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے خاص اپنی کاوشوں اور بعض معتقدین نیاز کے تعاون سے، جن میں یہ حیثیت ادارہ انجمن بھی شامل ہے نیاز صاحب کو فیض عام رکھنے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ کسی بڑے ادیب بڑے مفکر کا مشن عام ہوتے رہنے کے لیے صرف اس کی تصنیفات کی اولین اشاعتیں کافی نہیں ہوتیں۔ یوں تو وہ پہلی نسل قارئین کے توسط سے بھی آگے چلتی ہے لیکن اگر نئی نسلوں کو مسلسل اصل متن تصانیف میسر ہے تو وہ بزرگوں کی رائے کے ساتھ خود اپنے راست مطالعات کے ذریعے صاحب تصنیف سے قریب تر رہ کر اپنے فیصلے کرنے میں آسانی محسوس کرتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے آج تک تو نیاز صاحب کی اکثر تصانیف عام دسترس میں کر رکھی ہیں اور غالباً ایسا انتظام بھی ہو رہا ہے کہ آئندہ بھی تصانیف، خطوط کے مجموعے، غیر مطبوعہ مواد بھی وقفے وقفے سے شائع ہوتے رہیں۔ لازم ہے کہ ہماری نئی نسلوں کے سامنے اس عظیم شخصیت کا پورا پورا خاکہ موجود رہے تاکہ وہ پورے تاریخی، جدید اور آئندہ، تناظر میں نیاز صاحب کی فکری اہمیت کا جائزہ لیتی رہیں جو صرف اس صدی کے پہلے نصف تک محدود نہیں تھی بلکہ جو آج بھی خرد افروزی کے حامیوں کا ایک سرمایۂ جاریہ ہے، اس بات پر زور اس لیے دیا گیا کہ ہمیں حضرت جوش ملیح آبادی جیسے منفرد شاعر کی تصانیف کے بارے میں ایک بڑا تلخ تجربہ ہو رہا ہے۔ یہ کہ مدتوں سے ان کے نئے ایڈیشن نہیں آ رہے۔ وہ صرف پرانے قارئین اور بعض کتب خانوں کے پاس ہیں۔ نئی نسل ان سے صرف بالواسطہ متعارف ہو رہی ہے۔ خود بڑی مشکل کے بغیر ان کی کتابیں حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ موجودہ ان کے جانشین ان کی نئی اشاعتوں کی اجازت نہیں دیتے اور کاپی رائٹ قانون کی رو سے کاپی رائٹ کے اول مالک کے انتقال سے پچاس برس بعد تک قانونی اجازت کے بغیر نئی اشاعت خلاف قانون قرار پاتی ہے۔ ہاں اسی قانون میں یہ گنجائش ہے کہ اگر حکومت وقت کسی تصنیف کو (یا مسودے کو بھی) قومی مفاد میں حاصل کر کے شائع کرنا ضروری سمجھے تو وارثین کو مناسب معاوضہ ادا کر کے اس پر قبضہ کر سکتی ہے...... سو ہماری کسی بھی حکومت کو تاحال اپنے اس بنیادی فرض کا احساس نہیں ہوا۔ آگے حد ادب ہے۔

ڈاکٹر عقیلہ شاہین کا یہ پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ جس میں خود ایک بڑے واقف و عاشق نیاز ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رہنمائی شامل تھی۔ نیاز صاحب پر اب تک سب سے جامع بڑی تحقیقی دستاویز

ہے۔ ہم اسے پورا یا سب سے بڑا جائزہ تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ ایک ایسے ہمہ جہت نابغہ پر کوئی ایک محقق، مبصر، ناقد ایک کتاب میں اس کا پورا جائزہ لے ہی نہیں سکتا خاص طور سے جبکہ ایسے نابغہ کی تفہیم ایک رواں عمل ہو۔ اس کا دور ختم بھی نہ ہوا ہو اور اس کے اثرات کی سائنٹفک نشاندہی کے لیے ابھی اور بہت وقت درکار ہو لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا علامہ نیاز فتح پوری مرحوم پر یہ اب تک سب سے زیادہ جامع تحقیقی دستاویز بھی ہے۔ اس میں ان کی سوانح سے لے کر ان کی فکر و تصنیف کے تمام ابواب پر ممکن الحصول مواد بڑی احتیاط کے ساتھ تلاش و ترتیب کے مراحل سے گزر کر کتابیات کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔

ان قارئین کے لیے جو نیاز صاحب سے اچھی طرح واقف نہیں ایک غیر رواجی مشورہ حاضر ہے۔ ہم چاہیں گے کہ وہ پہلے اس کتاب کا آٹھواں باب "نیاز کا مرتبہ اردو زبان و ادب" میں ملاحظہ کر لیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں یا انہیں محترمہ مصنفہ کی تمام آرا سے اتفاق ہو۔ بلکہ یہ باب ان حیرت انگیز جہتوں اور اوصاف کے ایک خلاصے جیسی تحریر ہے جن سے موضوع مقالہ متصف تھے۔ اس نتیجے کے بعد "حقائق و دلائل" کا مطالعہ جو پچھلے سات ابواب میں ہیں شاید زیادہ لطف دے۔ عام طریقہ ہر حال یہ ہے کہ کتاب ابتدا سے پڑھی جائے۔ اس طرح مقدمات ایک ترتیب سے قائم ہوتے جاتے ہیں جن کے بعد ان سے نتائج کی منزل آتی ہے۔ لیکن نیاز صاحب جیسی مستند شخصیت کے بارے میں ہمارا تجویز کردہ طریقہ اختیار کرنے میں بھی ہرج نہیں...... اور صاحب مطالعہ کے لیے تو بہر حال ہر باب پڑھنا ہی ہے۔ اس کتاب میں کوئی باب غیر ضروری یا فروعی نہیں۔

یہی کتاب اپنی جگہ ایک رہنما دعوت بھی ہے آئندہ مطالعات نیاز کی...... وہ ہوتے تو ہیں لیکن اگر اس کی روشنی میں ہوئے تو مختلف ادوار میں کام کرنے والے ان کئی زحمتوں سے بچ سکتے ہیں جو مطلوبہ مواد سے ناواقفیت کے سبب پیش آ سکتی ہیں۔

راقم الحروف نے اس حرفے چند میں خود نیاز صاحب پر اپنی گزارشات پیش نہیں کیں۔ اگر جرأت بھی کی جاتی تو کم از کم اتنا ہی بڑا مقالہ ضروری ہوتا جو اس کتاب کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ آج کے دور میں راقم الحروف کسی مطالعہ نیاز میں ان کے، ہماری رائے میں اہم ترین پہلو خرد افروزی پر ایک سیر حاصل گفتگو کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور اس گفتگو میں مغرب کے دور خرد افروزی (Enlightenment) کے بہت سے حوالے ضروری ہو جاتے۔ جو قارئین نیاز صاحب کے اس مقام سے مغربی تناظر میں واقف ہونا چاہیں ان کے لیے کم از کم ایک چار جلدی...... جلدیں ضخیم نہیں...... تالیف:

THE ENLIGHTENMENT
NORMAN HAHPSON

ملاحظہ کرنا نہایت مفید ثابت ہوگا۔ اس کے بعد شاید وہ راقم الحروف کے دعوے سے بڑی حد تک اتفاق کر سکیں کہ جنوبی ایشیا میں جو تحریک خرد افروزی ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے نیاز صاحب

ابتدائیہ

زیرِ نظر کتاب حقیقتاً وہ تحقیقی مقالہ ہے جسے مَیں نے شعبۂ اردو جامعہ کراچی کی طالبہ کی حیثیت سے پی۔ایچ۔ڈی کے لیے جمع کیا اور جس پر جامعہ کراچی نے ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی۔ یہ کام مَیں نے تقریباً ڈھائی سال میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی نگرانی میں مکمل کیا۔ اس اعتبار سے طباعت و اشاعت میں قدرے تاخیر ہوگئی۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

مقالے کی طوالت اِس بات کی متقاضی تھی کہ اِس پر دوبارہ نظر ڈالی جائے۔ اِس کے متن و مباحث پر ایک بار اور غور کیا جائے اور حسبِ ضرورت اِس کی ضخامت کو بھی کم کیا جائے۔ چنانچہ مَیں نے بھی یہی کیا۔ کتابت و طباعت کے مرحلوں نے بھی خاصا وقت لیا۔

اپنی تحقیق کے لیے مقالے کے موضوع کا انتخاب مَیں نے خود کیا تھا اِس کا سبب یہ تھا کہ گوئٹے نے کسی جگہ کہا ہے کہ فن کی انتہا حیرت ہے اور مجھے متحیر کر دینے اور چیلنج بن جانے والی شخصیتوں سے شروع ہی سے محبت رہی ہے۔ نیاز فتح پوری نے بھی اِتنا

اپنی زمانی اور وسائلی محدودات کے باوجود حیرت انگیز طور پر اس مختصر سے کارواں کے ایک ایسے رہنما مسافر ثابت ہوئے ہیں جس کی نظیر ایک تنہا فرد کی صورت میں پورے مغرب میں بھی مشکل سے ملے گی۔

امید ہے آج کے مخصوص ماحول میں جب کہ اردو دنیا میں فکر جدید کو سرسید، حالی، شبلی اور علامہ اقبال کے بعد نیاز صاحب جیسے آزاد ذہن اور اپنے منفرد انداز اظہار کے ذریعے اثر پذیر مفکر سے استفادے کی ضرورت ہے یہ کتاب ان کی توسیعاتِ فکر کا ایک بڑا باب بھی ثابت ہوگی۔ نیاز صاحب علامہ اقبالؒ سے کتنے متاثر تھے اس کا اندازہ ان کی دوسری تحریروں اور نگار کے اقبال نمبر (1962ء) کے علاوہ ان کے ان جذبات سے لگایا جاسکتا ہے۔ جو صفحہ 254 پر ان کے ایک خط میں نظر آتے ہیں۔

> آپ کیا پوچھتے ہیں کہ یہ حادثہ کتنا بڑا ہے۔ میری عمر میں بہت کم واقعات ایسے ہیں جنھوں نے اچانک صدمہ پہنچایا ہو۔ سنتے ہی دماغ چکرانے لگا۔ پیشانی پر پسینہ آگیا اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے تیز روشنی گل کر کے دفعتاً اندھیرے میں ڈال دیا ہے...... آپ صدیاں کہتے ہیں میں کہتا ہوں یہ جگہ پر ہو ہی نہیں سکتی...... اقبال کی جگہ بدستور خالی رہے گی۔"

انجمن اس اشاعت کو بڑے فخر وانبساط اور ڈاکٹر عقیلہ شاہین کے لیے ایک خصوصی ہدیہ سپاس کے ساتھ پیش کر رہی ہے۔ امید ہے اس کی ایسی پذیرائی ہوگی جو نیاز صاحب کا حق ہے۔

1995ء

ہی تو کہا تھا کہ وہ چشمِ بینا رکھتے ہیں۔ اُن کی آنکھ دیکھ سکتی ہے اس لیے پورا نابینا شہر اُن پر ٹوٹ پڑا۔ اُن کا دعویٰ صرف اتنا تھا کہ فتح حاصل کرنا چاہتے ہو تو صرف صداقت سے کام لو، طاقت سے نہیں۔ صداقت کو زہر تو پینا ہی پڑتا ہے لیکن زہر پلانے والے تو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں اور زہر پینے والا اَمر ہو جاتا ہے۔ اِس جذباتی وابستگی کے ساتھ ساتھ اِن کی قد آور ادبی اور صحافی شخصیت نے میرے دل و ذہن کو روشنی عطا کی۔ میں نے ابتدا میں صرف انھیں پڑھے، ان کی تحریروں پر غور و فکر کرنے اور پھر بالآخر تحقیقی کام کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ جوں جوں میری نظر سے اِن کی رومانویت، انشائے لطیف، شعری ورثہ، افسانہ نگاری، مکتوبات، مضامین، تنقید، مذہبیات، صحافت اور نگار گزرتے گئے، اِن کی ادبی اور فن کارانہ عظمت کا نقش میرے دل پر پختہ ہوتا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ نیاز فتح پوری کا قلم اتنا پختہ اور با اعتماد تھا کہ ادب کے جس میدان کا رُخ کیا اپنی انفرادیت اور علمیت سے اہلِ ادب کو چونکا دیا۔ اُنھوں نے نہ صرف تخیل و تصور بلکہ فکر و استدلال کی نئی راہیں ہموار کیں، تقلیدی، روایاتی اور گھسی پٹی باتوں کے بجائے عقل و منطق اور سائنٹیفک نقطہ ہائے نظر پیش کیے۔ اگرچہ اس طرزِ فکر کی ابتدا سر سید احمد خاں کر چکے تھے اور اِن کی خدمات معمولی نہیں، غیر معمولی ہیں۔ بایں ہمہ ان کی بیشتر توجہ قوم کی اصلاح و تعلیمی ترقی اور حکومتِ وقت سے مطابقت پیدا کرنے، نیز عوام کو ذہنی طور پر حکومت کے قریب لانے میں صرف ہوئی۔ اُنھوں نے مقصد و استدلالِ عقلی کو بطورِ خاص پیشِ نظر رکھا نتیجتاً خالص ادب و شعر کی آواز اِن کی تحریک و تحریر میں دبی دبی سی نظر آتی ہے۔ اس عقلی و مقصدی فضا کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اردو میں رومانوی تحریک منظرِ عام پر آئی۔ سجاد حیدر یلدرم اور مہدی افادی کے زیرِ نظر علامہ نیاز فتح پوری اس تحریک کے ہراول دستے میں شامل ہو گئے

لیکن رومانیت کے ساتھ ساتھ اِن میں عقل و منطق، تحقیق و تنقیدی صلاحیتیں بھی بدرجہ اُتم موجود تھیں۔

زیرِ نظر مقالے میں نیاز کی زندگی و شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ زندگی اور فن کا ہر گوشہ زیرِ بحث آیا ہے، لیکن اہم اور غیر اہم میں فرق کیا گیا ہے۔ اتنی بات تو سارے ادب دوست جانتے ہیں کہ نیاز فتح پوری نے سماجی، معاشرتی اور تہذیب و کلچر کے حوالے سے زندگی، ادب اور دنیا سے جو رابطہ استوار کیا ہے وہ بالخصوص توجہ کا طالب ہے۔ جرأتِ اظہار اور حریتِ قلم کی پاسداری کا جو انداز نیاز کے ہاں ملتا ہے وہ اردو ادب میں بہت کم نظر آتا ہے۔

خاص طور پر مذہبیات و سماجیات کے سلسلے میں نیاز کا بے خوف و بے باک قلم ایسے ایسے مسئلوں کو سامنے لایا ہے کہ انھیں ہاتھ لگانا آسان نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہوا، اور اس کے کیا اسباب تھے، میں نے اِس مقالے میں اس کا جواب تلاش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ "عورت" اور "مولوی" کے حوالے سے نیاز فتح پوری نے زندگی کے خیر و شر، مثبت و منفی پہلوؤں اور محبت و نفرت کی انتہاؤں کو چھونے کی جو کوشش کی ہے اس کا جواز اور تجزیہ بھی میرے پیشِ نظر رہا۔

علامہ نیاز فتح پوری کی شخصیت اور ان کی تحریروں سے متعلق ناقدین کی غلط فہمیوں نے بھی مجھے سوچنے اور غور و فکر پر مجبور کیا کہ کیا واقعی وہ ایک دہریہ، خود سر، بے دین اور مغرور آدمی تھے اور کیا حقیقتاً اُن کی تحریریں اردو ادب میں حسین لفظوں کے کھیل کے سوا کچھ نہیں ہیں؟ اس سوال کا مدلل جواب بھی آپ کو اس مقالے میں ملے گا اس لیے کہ میں نے حقیقتوں کے اظہار سے کبھی بھی انحراف نہیں کیا۔ وہ دراصل جو کچھ تھے اور جیسے تھے میں نے ویسا ہی انھیں پیش کر دیا ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری عالم بھی تھے اور فن کار بھی، سماجی مفکر بھی تھے اور رومانوی

شاعر و افسانہ نگار بھی۔ بے خوف ناقد بھی تھے اور نڈر صحافی بھی۔ اعلیٰ درجے کے
مقالہ نویس بھی تھے اور فسوں طراز مکتوب نگار بھی۔ ان سارے فکری و فنی مباحث
کے تناظر میں ان کی تصانیف کا بنیادی محور و موضوع تلاش کیا جائے تو وہ زندگی
اور اس کے مثبت و منفی پہلو کا مطالعہ نظر آئے گا لیکن کہیں بھی مایوسی، شکست
اور زندگی سے فرار کا رویہ نہیں ملتا، بلکہ ہر جگہ ایک امید افزا، بااعتماد، مقابلہ کرنے
اور حوصلہ بڑھانے والی فضا ہے جس میں کہیں سرخوشی و سرمستی ہے تو کہیں تفکر و تعقل۔
غرضکہ بیسویں صدی میں وہ ایک ایسی متحیر کر دینے والی شخصیت ہیں جس نے اردو ادب
پر گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔

علامہ نیاز فتح پوری جیسی ہمہ جہت اور قد آور شخصیت کو سمیٹنا یقیناً ایک مشکل
مرحلہ تھا۔ نیاز نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ ہندوستان میں گزارا۔ وہاں جانا
اور ان کے عزیز و احباب سے ملاقات میرے بس میں نہ تھی۔ پاکستان میں بھی صرف
بیگم گلزار نیاز، مجنوں گورکھپوری اور قومی عجائب گھر کے اراکین سے مل سکی،
لیکن اس سلسلے میں جو مدد اور تعاون مجھے ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے حاصل ہوا وہ
بے مثال ہے۔ مجھے اس ادھورے پن کا احساس شدت سے تھا چنانچہ اپنی تحقیق کے بنیادی
نکات کے سلسلے میں میں نے "نگار" کے پورے فائل کا ورق ورق چھان ڈالا کیوں کہ
ان اوراق میں علامہ نیاز کی شخصیت کے بہت سے رُخ موجود تھے۔ نیاز کی تصانیف
کے مختلف نسخے تو مجھے دستیاب ہو گئے لیکن ان پر نہ تو سنین درج ہیں اور نہ یہ کہ
اوّلاً یہ تصانیف کس ادارے کی طرف سے شائع ہوئیں۔ سن اور ادارے کے تعین میں
مجھے "نگار" میں چھپنے والی کتابوں کے اشتہارات سے بہت مدد ملی۔ نیاز کی بہت سی
ایسی تحریریں اور مضامین جو "نگار" کے علاوہ ان کی کسی بھی تصنیف میں موجود نہیں ہیں،
انھیں میں نے خصوصی توجہ دی اور بڑی محنت و غور و خوض سے "نگار" کے فائل کا مطالعہ

کیا اور اس وسیع ادبی ذخیرے سے اپنے کام کی چیزیں اخذ کیں۔

اس مقالے میں نیاز فتح پوری کی شخصیت اور ان کی تمام تحریروں کو تناسب
و توازن اور ادب کی مختلف اصناف میں اضافے اور اثرات کو حتی الوسع سامنے لانے
کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل مختلف موضوعات کے ابواب میں ملے گی۔

مذہبیات کے سلسلے میں علامہ نیاز فتح پوری کا نقطۂ نظر عقلی، منطقی اور استدلالی
تھا۔ اس سائنٹیفک کسوٹی کے باوجود "مولوی" سے اختلاف میں ان کا نقطۂ نظر بہت
انتہا پسندانہ ہے۔ اس کا سبب دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ صحافی ہونے کی وجہ سے
ان کا قلم بہت بے باک اور نڈر تھا۔ اس لیے جو کچھ لکھتے بغیر کسی تعصب اور فرقہ پسندی کے
بے دھڑک لکھتے۔ لیکن مذہبی اُمور کے اختلافی مسائل چھیڑنے کی وجہ سے علامہ نیاز نے
اپنے راستوں میں بہت سے کانٹے بو لیے اگرچہ وہ ان مسائل کی طرف اُس وقت
متوجہ ہوتے تھے جب کوئی خود ان پر حملہ کرتا۔ طبعاً نیاز تخلیقی ذہن کے مالک تھے فطرت
کی طرف سے نازک اور فنکارانہ صلاحیتیں لے کر آئے تھے اگر مذہبیات کو ترک کر دیتے
تو اردو ادب کو اور بھی اعلیٰ درجے کی تخلیقات دے سکتے تھے۔ مذہب کی اسی ہمہ گیری
کی وجہ سے وہ شعری ادب اور تنقید کی طرف بھی زیادہ توجہ نہ کر سکے۔

نیاز فتح پوری کی شاعری کے ابتدائی رنگ کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اگر
وہ شعر و شاعری کی طرف متوجہ رہتے تو بہت کامیاب ہوتے۔ اسی طرح تنقید کے
باب میں بھی ایک قابلِ توجہ مقام پاتے۔ تاہم وہ اردو ادب میں اتنا بڑا نام رکھتے
ہیں جسے کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس یہ کہ ابھی تک انھیں وہ مقام
نہیں ملا جو ملنا چاہیے تھا۔ کراچی، لاہور، ملتان اور بہاولپور کی کسی لائبریری میں ان
کی تمام تصانیف دستیاب نہ ہو سکیں۔ چنانچہ کراچی میں لیاقت لائبریری، انجمن ترقی اردو،
غالب لائبریری، اردو ڈکشنری بورڈ، انڈیا آفس لائبریری اور قومی عجائب گھر کے کتب خانے

سے استفادہ کیا۔ لکھنے لکھانے اور تحقیق کا زیادہ تر کام میں نے جامعہ کراچی کے کتب خانے میں کیا ہے۔ کراچی کے بعد مجھے سب سے زیادہ تعاون اور نیاز کی تصانیف سینٹرل لائبریری بہاول پور میں میسّر آئیں۔ جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے کتب خانے سے مجھے وہ سب کچھ مل گیا جو کسی بھی کتب خانے سے دستیاب نہ ہو سکا مثلاً مختلف شخصیات کے نام نیاز کے خطوط اور اُن کی ڈائری کے اوراق۔

مجھے اپنے استادِ محترم ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور مرزا ابنِ حنیف کی شفقتوں اور محبّتوں کے لیے "شکریہ" کا لفظ بہت چھوٹا محسوس ہوتا ہے کیوں کہ ان کی رہنمائی، خلوص اور تعاون میری زندگی کا بیش قیمت عطیہ ہے۔ اِس سنجیدہ کام میں پروفیسر مہدی مخدوم کی شفقت نے بھی میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں اپنے امّی، ابّو، آپی، خالد مسعود اور سعد کی محبّتوں کا شکریہ نہ بھی ادا کروں تو کوئی بات نہیں، اِس لیے کہ مجھے ان سے اور بھی بہت کچھ لینا ہے۔ میں اپنے سب محبّت کرنے والوں کی بے حد ممنون ہوں اور آخر میں اُس خالق کے سامنے جھکتی ہوں جس نے مسافتوں کے مشکل گردِ سفر میں مجھے تازہ ہمّتوں اور حوصلوں کی خوشبو عطا کی۔

عقیلہ شاہین

باب ۱

سوانح اور شخصیت

اُنیسویں صدی اُردو زبان و ادب کے لئے بہت مردم خیز ثابت ہوئی ہے۔ اس میں ایک دو نہیں، حرف و صوت کی سوغات بانٹنے والے متعدد صاحبانِ فکر و نظر سامنے آئے۔ اُن میں کچھ لوگ پُرسکون جھیل کی طرح تھے اور کچھ لوگ اپنی روح میں مضطرب سمندر کی طرح۔ سرسیّد، حالی، شبلی، آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور اکبر الٰہ آبادی کی بھرپور خدمات کو کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی ہی نامور شخصیتوں میں ایک شخصیت علّامہ نیاز فتح پوری کی ہے، جو سرسیّد، شبلی، آزاد اور نذیر احمد کے فکر و فن کی مشعل کو لے کر آگے بڑھے۔ مُنہ زور آندھیوں اور بپھرے طوفانوں نے اِس مشعل کو بُجھانے کی لاکھ کوشش کی لیکن ناکام ہوئے۔ نیاز فتح پوری جیسے آگہی و بصیرت کے مالک ادیبوں نے اِس مشعل کو پوری آب و تاب کے ساتھ روشن رکھا، بلکہ اِس روشنی میں ایسی رنگا رنگی پیدا کر دی کہ وہ رُومانوی و عقلی دونوں حلقوں کے ادیبوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔

نیاز فتح پوری شاعر بھی تھے اور خوب صورت باتیں کرنے والے رُومانوی افسانہ نگار بھی۔ وہ کامیاب انشا پرداز بھی تھے اور علومِ عقلیہ کے نکتہ شناس بھی۔ انہیں اعلیٰ درجے کا مذہبی اسکالر بھی کہہ سکتے ہیں اور سیاسی شعور رکھنے والے مبصر بھی۔ وہ ذہن کی اتھاہ گہرائیوں تک پہنچنے والے ماہرِ نفسیات

بھی تھے اور ایک بے باک مؤرخ بھی۔ وہ محقق بھی تھے اور زبان کے رمز شناس بھی۔ وہ ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے اور ایک نڈر تنقید نگار بھی۔ اُن کا قلم کہیں "ذاتِ الیہ" کی باریکیوں کو منظرِ عام پر لاتا ہے تو کہیں جنسیات کی گہرائیوں کو۔ کہیں معلوماتِ عامہ کا عظیم دفتر کھولتا ہے تو کہیں فنونِ لطیفہ کا مفسر بن جاتا ہے۔ غرض نیاز فتح پوری اپنی ذات میں ایک پورا عہد ہیں۔ اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایسے تاریخ ساز لوگ روز روز نہیں گاہے گاہے پیدا ہوتے ہیں۔ ہرچند کہ اُن کے عہد کے لوگ بہت جلد اُن کے نیاز مندوں میں شامل ہو گئے۔ لیکن خود نیاز اپنے آپ سے بے نیاز رہے۔ تبھی انھوں نے ہمیشہ اپنے بارے میں کچھ کہنے سے گریز کیا۔ چنانچہ نیاز سے جب کبھی اپنے بارے میں کچھ لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ وہ بڑی خوب صورتی سے اسے ٹال گئے۔ محمد طفیل۔ مدیر "نقوش" کے پُرزور اصرار کے جواب میں لکھتے ہیں۔[1]

"مہربانی سے آئندہ اِس موضوع پر لکھنے کی فرمائش مجھ سے نہ کیجئے۔ یہ سُن کر چھینٹیں مارنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کو کیا خبر اِس وقت تک مَیں نے کتنے گناہ کئے ہیں اور ان سے زیادہ کتنے اور ناکردہ گناہوں کی حسرت اب بھی دل میں لئے ہوئے ہوں۔ پھر آپ ہی بتایئے کیا اِن سب کو اپنی سوانح سے علحدہ کر دوں اور اگر ایسا کروں تو پھر مجھ میں کیا رہ جائے گا ——— پروانہ ہوں نیم داغ و نیمہ خاکستر اسی حال میں رہنے دیجئے، چھیڑیئے نہیں۔"

نیاز کے مطابق اُن کی داستانِ حیات طویل اور پیچ در پیچ ہے۔ بہت تکلیف دہ اور دُکھ پہنچانے والی ہے۔ اِسی لئے انہوں نے ہمیشہ اپنے بارے میں کچھ لکھنے سے گریز کیا۔

نیاز کے آباؤ اجداد کون تھے؟ سلسلۂ نسب کہاں جا ملتا ہے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟۔ فتح پور میں کب قیام پذیر ہوئے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو نیاز کی شخصیت سے متعلق بہت اہمیت رکھتے ہیں

[1] "نقوش" آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء ص ۱۰۱، ادارہ فروغِ اُردو۔ لاہور

وہ چاہتے تو سوانحِ عُمری اور آپ بیتی کے باب میں بھی اپنے جوہر دکھا سکتے تھے لیکن عظیم لوگوں کی طرح اپنی ذات سے بے نیازی کا عُنصر اُن میں موجود رہا۔ ۱۹۶۳ء میں جب "نگار" کے نیاز نمبر کی تجویز پیش ہوئی تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے پُرزور اصرار پر انہوں نے اپنے بارے میں کچھ اہم معلوم فراہم کیں چنانچہ اپنے خاندانی حالات اور آباؤ اجداد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"خاندانی حالات کے سلسلہ میں عموماً و رسماً تین باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ علو نسب وجاہت و ثروت اور علم و فضل، سو بدقسمتی سے مَیں اور میرا تمام خاندان اِن میں سے کسی بات پر فخر نہیں کر سکتا۔ نہ بہ لحاظ نسب مَیں اپنے آپ کو فاروقی، صدیقی، یا تیموری یا چنگیزی کہہ سکتا ہوں۔ نہ دولت و امارت کے لحاظ سے اپنے خاندان کے کسی فرد کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔ رہا علم و فضل، سو اس کا ذکر ہی فضول ہے کیونکہ میرے آبا و اجداد سب معمولی پڑھے لکھے تھے اور سب سے پہلے جس کی ذات سے معنی میں علم کی روشنی میرے گھر پہنچی وہ میرے والد محترم تھے۔"[1]

والد کی شخصیت نے نیاز کے ذہن و دل پر بھرپور اثرات مرتب کئے۔ وہ جو کچھ بھی بنے اُس میں اُن کے والد کا بہت بڑا حصہ ہے۔

نیاز کے والد محمد امیر خاں، جو امیر محمد خاں کہلاتے تھے، مذہباً حنفی مگر آلِ فاطمہؑ سے گہری عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ فتح پور ہسوا اُن کا آبائی وطن تھا۔ فتح پور کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے ۱۱۹۳ء میں معز الدین بن سام غوری کی حکومت ختم ہوئی تو آخری فرمانروا جے چند نے خزانہ یہیں منتقل کر لیا۔ عہدِ مغلیہ میں یہاں دو بار جنگ ہوئی۔ پہلے ۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب اور شاہ شجاع کے درمیان پھر فرخ سیر اور عز الدین جہاندار کے بیٹے کے درمیان ۱۷۵۰ء تک مرہٹے قابض رہے ۱۷۶۵ء میں انگریزوں نے پچاس لاکھ میں نواب وزیر اودھ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ۱۱ جولائی ۱۸۵۶ء

[1] "والد مرحوم، مَیں اور نگار" نیاز نمبر حصہ اوّل۔ ص ۱۹۰

میں لکھنؤ کی حکومت ختم ہونے پر سارے علاقے پر انگریزوں کی مستقل حکومت قائم ہوگئی۔ یہی شدید طوفانوں کی زد میں آنے والا فتح پور، نیاز کے آباواجداد کا مسکن رہا۔ اُن کے والد سے پہلے، اُن کے خاندان اور اعزا و اقربا کا ذریعہ معاش سپاہ گری تھا۔ یہ لوگ جاہل پٹھان تھے اور ایک گڑھی سی بناکر اُس میں رہا کرتے تھے۔ امیر محمد خان پہلے شخص تھے جنہوں نے تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اُن کی والدہ نے اپنا زیور اور گھر کا تمام اثاثہ بیچ بیچ کر اُن کی تعلیم کے اخراجات پورے کیے۔[1]

نیاز کے والد امیر محمد خان، فارسی و اُردو کے بہت اچھے انشا پرداز اور شاعر، امیر تخلّص تھا۔ بہت اچھے خطّاط و خوشنویس تھے۔ فارسی زبان سے فطری مناسبت تھی۔ اُردو کے مقابلے میں فارسی کو ترجیح دیتے تھے۔ دلی اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا صہبائی سے اِستفادہ کیا۔ ایران کا شاہزادہ اعجاز خسروی، امیر محمد خان کا ہم سبق و ہم درس تھا۔ اُنہیں فارسی نظم و نثر پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔ کلاسکل شعرا کا گہرا مطالعہ تھا۔ فردوسی، خاقانی، انوری، نظامی، سعدی، عرفی، نظیری، جامی، حافظ، بیدل اور غالب کے ہزاروں اشعار اُنہیں زبانی یاد تھے۔ حافظہ اتنا قوی کہ جو پڑھتے ہمیشہ یاد رہتا۔ خود بھی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ قصیدہ محبوب صنفِ سخن تھی لیکن صرف نعت و منقبت کی حد تک۔ کسی امیر یا رئیس کا قصیدہ انہوں نے نہیں لکھا۔ فطرتاً مشکل پسند تھے۔ اسی لیئے شاعری میں عرفی سمرقندی کے طرح اور نثر میں ظہوری کو پسند کرتے تھے۔ اُردو شاعری کی طرف توجہ کم تھی پھر بھی میر تقی میر مینائی کے معترف تھے۔ نیاز کے والد بہت اچھے مقرّر اور انشا پرداز بھی تھے۔ مذہبی اور تاریخی مطالعہ اِتنا وسیع تھا کہ بڑے بڑے علما، پر چھا جاتے تھے۔ فکر میں گہرائی تھی اور زبردست قوّتِ اِستدلال کے مالک تھے۔ مولوی فرخی (نواب حامد علی خان کے آتالیق) مولانا معرب محمد طیّب (مدرسہ عالیہ رامپور کے صدر) سنجر ایرانی (درباری شاعر) مولانا ظہور الاسلام (بانی مدرسہ اسلامیہ فتح پور) مولانا نور محمّد (مدرس اعلیٰ مدرسۂ اسلامیہ فتح پور) سے خاص تعلقات تھے۔ جو اُن کی علمیت، فارسی دانی، طبیعت کی صاف گوئی اور حُسنِ اخلاق کے بہت قائل تھے، نیاز نے اپنے زمانۂ طالبِ علمی میں ان سب کا بہت اثر قبول کیا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نیاز محمد خان کو علّامہ نیاز فتح پوری بنانے میں ان بزرگوں

---

[1] والد مرحوم میں اور نگار نیاز نمبر حصّہ اوّل، ص ...

اور اُستادوں کا ہاتھ ہے۔

نیاز کے والد اپنی ابتدائی زندگی میں خاصے رنگین مزاج تھے۔ طنز و مزاح کی طرف خاص رُجحان تھا۔ شعر و سُخن، رقص و سُرود، اور پتنگ بازی سے شغف تھا۔ مگر یہ رنگین مزاجی بہت دِنوں برقرار نہ رہی۔ ایک رات خواب میں مولانا شاہ عبدالسلام ہسوی کو دیکھا کہ انہیں یاد کرتے ہیں۔ خواب کا اتنا شدید اثر ہوا کہ اگلے ہی روز کانپور پہنچ کر اُن کے مرید ہو گئے۔ اَب نہ وہ رنگ رَلیاں تھیں نہ محافلِ رقص و سُرود، اور نہ ہی مشاغل لہو و لعب۔ اِس ذہنی اِنقلاب سے صوم و صلوٰۃ اور شعائرِ مذہبی کی پابندی اُن کی فطرتِ ثانیہ بن گئی۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی وہ اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ ملازمت کی جستجو میں کانپور چلے آئے۔ اُن کی فارسی دانی سے انگریز حکّام بہت خوش ہوئے۔ فوراً پیشکاری کی جگہ دے کر سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔

نیاز کے والد بہت دریا دل واقع ہوئے تھے۔ گھر میں چونکہ فراغت و خوشحالی تھی اِس لیے ہمیشہ یہ تمنّا رہتی تھی کہ کوئی ان سے کچھ طلب کرے اور وہ اُسے نہال کر دیں۔ کانپور کی پیشکاری کے بعد محکمۂ پولیس میں ملازمت کر لی اور ان کا پہلا تقرر مظفر نگر میں ہوا یہاں سے ان کا تبادلہ رام سنیہی گھاٹ ضلع بارہ بنکی، اور بعد کو لکھنؤ ہو گیا۔ حسن گنج اور سعادت گنج کے انچارج رہے۔ ۱۸۸۸ء میں پنشن ہو گئی۔ ۱۹۰۱ء میں فتح پور آ گئے اور ۱۹۰۸ء میں وفات پائی۔

نیاز کے والد نے تین شادیاں کیں، پہلی بیوی سے ایک لڑکی اور دوسری بیوی سے محمد نجابت علی خاں پیدا ہوئے۔ جن کا بارہ تیرہ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ تیسری بیوی سے نیاز اور ان کی بہن نظیر النسا، پیدا ہوئے۔

نیاز کا پیدائشی نام، والدہ نے نیاز محمد خاں رکھا۔ والد کا رکھا ہوا تاریخی نام لیاقت علی خاں (۱۳۰۲ اعداد) اور قلمی نام نیاز فتح پوری تھا۔ نیاز رام سنیہی گھاٹ ضلع بارہ بنکی ۱۸۸۴ء میں اُس وقت پیدا ہوئے جب کہ شام ادھر پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے تھے، اور مغلوں کا چراغ گُل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ نیاز کے والد نے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی

چنانچہ شروع ہی میں اِس کا معقول انتظام کر دیا۔ مولوی حبیب الدین اور مولانا صدیق حسن غازی پوری اتالیق کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ خطاطی، شہسواری، اور فنون سپاہ گری کی تعلیم کے لیے بھی استاد رکھے گئے۔ نیاز کے والد کی شدید خواہش تھی کہ دُنیا کے تمام علوم و فنون اُن کے فطری طور پر ذہین و فطین بیٹے کو حاصل ہو جائیں۔ قبل از وقت، غیر معمولی طور پر پختہ ہو جانے والی فطرت نیاز کی طبیعت کا خاصا تھی۔ ذہنی I.Q تمام لوگوں سے بہت بلند تھا۔ والد کی نگرانی اور شخصیت سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا جیسا کہ خود لکھتے ہیں:-

"عمر کے اُس حصّہ میں جب کہ عام طور پر بچے صرف کھیلتے کودتے ہیں میں تعلیم کی اُن منازل سے گزر رہا تھا جو عموماً سنِ بلوغ میں طلبہ کے سامنے آتی ہیں۔ اور میری یہی فطری خصوصیت تھی جس نے آگے چل کر مجھے قدامت پرستی کا مخالف بنا دیا۔۔۔ اچھی آواز اور اچھی صورت میری کمزوری تھی جو ہمیشہ میرے ساتھ رہی اُس نے میری زندگی کو رنگینی بھی بخشی اور داغدار بھی کیا۔ میری راہ میں کانٹے بھی بچھائے اور پھول بھی برسائے۔"[1]

جیسا کہ اس بیان سے ظاہر ہے نیاز کی شخصیت کی تعمیر میں نیاز کے والد امیر محمد خان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اُس زمانے میں دیہات میں شرفا اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام خود کرتے تھے۔ ہر خاندان کا ایک مکتب ہوتا جس میں خاندان کے تمام بچے تعلیم پاتے تھے۔ تعلیم قرآن مجید سے شروع ہوتی۔ پھر عربی و فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ زیادہ تر فارسی زبان پر زور دیا جاتا تھا، اِس لئے کہ ابھی تک فارسی سرکاری زبان تھی۔

نیاز نے ایک پُر آشوب ماحول میں آنکھ کھولی۔ قُدرت نے ذہنِ رسا عطا کیا تھا۔ فطری فہم و فراست کی وجہ سے ابتدائی تعلیم کے مدارج بہت جلد طے کر لئے۔ والد نے ہندوستان و ایران کے مشاہیرین کا کلام پڑھایا مثنویات، آٹھ سال کی عُمر ہی میں اُنہیں "گُلستان"، "بوستان" کے اسباق اَزبر تھے۔

۱؎ والد مرحوم، میں اور نگار۔ نیاز نمبر حصّہ اوّل۔ ص ۲۰۔

بارہ سال کی عُمر میں ۱۸۹۶ء میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں داخل ہوئے۔ اس مدرسے کی بنیاد ۱۸۰۲ء میں ندوۃ العلماء کے گمنام بانی مولانا سیّد شاہ ظہور الاسلام نے ڈالی تھی۔ علی گڑھ کے بعد یہ غالباً پہلا مدرسہ تھا جس میں عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مولانا ظہور الاسلام مختلف علوم کے ماہر اور زبردست فہم و فراست کے مالک تھے۔ انہوں نے اُس نازک اور کڑے وقت میں انگریزی تعلیم کو جائز قرار دیا تھا جب اکثر علماء سرسیّد کو کافر و ملحد اور انگریزی تعلیم کو ناجائز و حرام ثابت کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ مولانا ظہور الاسلام بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:-

"اُنیسویں صدی کے زبردست عالم، سماجی مصلح اور تعلیمی مفکر تھے۔ یہ دراصل اُنہیں کے فیضِ صحبت اور تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ اس مدرسے نے مولانا عبدالرزاق کانپوری، حکیم مولوی عبدالحیٔ، مولانا حسرت موہانی، مولانا حسن الدین خاموش اور علّامہ نیاز فتح پوری جیسے نامور مورخ، مفکر اور شاعر و ادیب پیدا کئے۔"[1]

نیاز، مولانا ظہور الاسلام سے بہت متاثر تھے۔ اُن کے علم و فضل اور شخصیت سے انہوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ مدرسۂ فتح پور تین خاص شعبوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک میں عربی کی تعلیم دی جاتی تھی دوسرے میں انگریزی علوم پڑھائے جاتے اور تیسرے میں قرآن مجید حفظ کرایا جاتا۔ ان تینوں شعبوں کے صدر خود مولانا ظہور الاسلام تھے۔ مولانا نور محمد مدرسہ کی عربی شاخ کے مالک و مختار تھے۔ نیاز نے مولانا ظہور الاسلام اور مولانا نور محمد کی صُحبتوں سے اپنے ذہن کو منوّر کیا۔ اور دونوں کے مُثبت و مَنفی رجحانات کا گہرا اثر قبول کیا۔ مولانا ظہور الاسلام بہت نرم دل اور رقیق القلب تھے۔ فارسی شعر و ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ عفو و درگذر اُن کے مزاج کا جزوِ اعظم تھا لیکن بقول نیاز فتح پوری:-

"مولانا نور محمد متقی ہونے کے باوجود سراپا ہیبت و جبروت، پیکرِ تقشف و بوس سختی کا یہ عالم کہ طلباء کو سخت جسمانی ضرر پہنچانے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔"[2]

۱؎ "ملاخطات" نگار پاکستان جون ۱۹۶۶ء، ص ۴۰۔

۲؎ والد مرحوم، میں اور نگار۔ نیاز نمبر حصّہ اوّل ص ۲۰۔

ان متضاد و مخالف رویوں کے درمیان نیاز نے ابتدائی تعلیم کے مدارج طے کئے۔ منفی و مثبت دونوں اثرات قبول کئے۔ اُن کی ذہنی ساخت اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اِس تضاد کا گہرا اثر پڑا۔ شخصیت، فکر، جذبے اور عمل کا مجموعہ ہے۔ یہ ذات کا آئینہ بھی ہے اور پردہ بھی۔ گرد و پیش کے ماحول سے ہر طرح کے اثرات قبول کرتی ہے۔ نیاز مدرسۂ فتح پور میں فقہ، حدیث، عربی صرف و نحو، منطق و فلسفہ بھی پڑھتے تھے اور انگریزی شعبہ میں علوم عمرانی و ریاضیات کے ساتھ ساتھ انگریزی کا درس بھی لیتے تھے چنانچہ دو مختلف تاثرات قبول کئے۔ خود کہتے ہیں:-

"میں نے اپنی عربی تعلیم کا بڑا حصہ اس دوعملی میں بسر کیا اور میری ذہنیت پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ میں ایک ہی وقت میں مولانا نور محمد صاحب سے عربی بھی پڑھتا تھا اور انگریزی شاخ میں انگریزی بھی اور دو مختلف کیفیات لے کر گھر لوٹتا تھا۔"[1]

مولانا نور محمد کے ہاں جمالیاتی ذوق کی کمی تھی۔ طلبہ پر بے جا سختی اور مذہب میں تنگ نظری اور رجعت پرستی کا نیاز نے منفی اثر قبول کیا۔ اس قسم کی تعلیم اور سختی، فطری ذہانت کے لئے سم قاتل ہوتی ہے۔ اور مذہب سے دوری اور بیزاری کا باعث بن جاتی ہے۔ چنانچہ مذہب اور مذہبیت سے انحراف کی جو کیفیت نیاز کے ہاں پیدا ہوئی، اس کی ذمہ داری اسی ماحول پر تھی۔ مدرسہ کا حافظ خانہ جہاں قرآن مجید حفظ کرائے کے سلسلے میں بچوں پر سختیاں کی جاتی تھیں، اُس نے بھی نیاز کو ابتدا ہی میں کچھ بددل سا کر دیا تھا۔ اور وہ سوچنے لگے کہ اگر اسلام یہی ذہنیت پیدا کرتا ہے تو کوئی معقول مذہب نہیں۔ مختصر یہ کہ مدرسۂ فتح پور نے نیاز کی طبیعت و فطرت، مذاق و مزاج، ذوق و ذہن اور علمیت و ادبیت میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُن کا ذہن روایاتی مذہبی نظریات کو قبول نہ کرتا تھا۔ وہ روایت و درایت کو ساتھ ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے مولانا نور محمد سے اکثر بحث میں اُلجھ پڑتے تھے۔ مولانا کے دبدبہ اور خوف کی وجہ سے جماعت میں کوئی اُن کا ساتھ نہ دیتا۔ مولانا نے اپنے مُنہ زور و مُنہ پھٹ شاگرد سے، جو مذہب کے معاملے میں محض سُنی سُنائی باتوں کو آنکھیں بند کر کے قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا، بڑے نالاں تھے۔ اکثر گھور کے رہ جاتے۔ اور نیاز کئی دفعہ ان کے ہاتھوں پٹتے

[1] [...] حوم، میں اور نگار، نیاز نمبر حصہ اول ص ۲۸

پٹتے بچے۔

مولانا ظہور الاسلام کی سادگی، وسیع القلبی اور وسیع النظری کے ساتھ ساتھ حافظ قادر بخش اور محمد حسن جیسی سخت گیر و تنگ نظر شخصیات نے نیاز کی شخصیت پر گہرا اثر کیا۔ گھر پہ اپنے والد وفا حبیب الدین سے فارسی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ حسرت موہانی اُن کے ہم درس اور ہم سبق تھے۔ نیاز نے مدرسۂ اسلامیہ میں سات سال تک تعلیم پائی۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں نیاز کے دو خاص مشاغل تھے۔ فارسی شاعری اور غیر مذہبی کتابوں کا مطالعہ۔ غالب کی فارسی شاعری سے متاثر ہوئے۔ لیکن بیدل اُن کا پسندیدہ شاعر ٹھہرا۔ تصوف کی کتابوں سے دلچسپی بڑھی تو ابنِ عربی کی "فصوص الحکم" کا ترجمہ شروع کر دیا۔ اسی دَور میں کبھی فارسی اور کبھی اُردو میں شعر کہنے لگے چونکہ مولانا حسرت کا ساتھ تھا اس لئے اُن کے رنگِ تغزل سے بہت متاثر ہوئے اور ابتدا میں اُسی انداز کو اپنایا۔ فتح پور میں منعقدہ مشاعروں میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے۔ ابھی ذہن ناپختہ تھا اور تجربے محدود تھے۔ اس لئے عورت اور محبوب کا تذکرہ محض روایاتی حیثیت رکھتا تھا۔ بعد میں غالب کی فارسیت اور میر کی سادگی دل و دماغ پر چھا گئی۔ اسی زمانہ میں مولانا نور محمد سعادتِ حج کے لئے تشریف لے گئے تو مولانا محمد حسن خاں دیوبندی علم حدیث کی تحصیل کے لئے بُلائے گئے۔ نیاز چونکہ مولویانہ قسم کی ذہنیت سے چڑتے تھے اس لئے مولانا محمد حسن سے بھی نہ بنھ سکی۔ مولانا مذہبی مسائل و مباحث میں عقل و منطق اور درایت و دلائل سے کام لینے کے لئے قطعاً تیار نہ ہوتے۔ اُدھر نیاز کو خلافِ عقل بات سُننا گوارا نہ تھی۔ مولانا نے جب اس حدیث کا تذکرہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ آسمان میں ایک اژدہا ہے جب وہ اپنی سانس دُنیا کی طرف چھوڑتا ہے تو گرمی ہو جاتی ہے۔ اور جب سانس کھینچتا ہے تو سردی ہو جاتی ہے۔ یہ حدیث سُنتے ہی یکدم نیاز کی زبان سے نکلا "غلط" مولانا کا غصہ نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے کہ بدتمیز رسول اللہؐ کو غلط کہتا ہے۔ نیاز نے جواب دیا حدیث کو غلط کہتا ہوں رسول اللہؐ ایسی خلافِ عقل بات کہہ ہی نہیں سکتے۔ مولانا ڈنڈا اُٹھا کر مارنے کو دوڑے مگر جرأت مند لڑکا ہاتھ

نہ آیا۔

نیاز کا تعلق اُس نوجوان نسل سے تھا جو سرسیّد اور اُن کے روشن خیال رفقاء کا اثر قبول کرتے ہوئے تعصّب، جہالت، اور مذہبی تنگ نظری کے دائرہ سے نکلنا چاہتے تھے۔ مولانا محمد حسن ایسے بزرگوں میں سے تھے جو سرسیّد تحریک کو ملک و ملت کے لئے زہرِ ہلال گردانتے ہوئے دہریہ، کافر، نیچری، اور کرشان کا فتویٰ صادر کر رہے تھے۔ یہ تنگ نظری کی تاریکیوں کے مقابلے میں وسعت کے اُجالے زیادہ پُرکشش ہوتے ہیں لہٰذا اس تحریک نے نوجوانوں کو بہت متاثر کیا۔ نیاز بھی بہ حیثیت ایک پختہ اور باشعور نوجوان کے ان نظریات میں بے حد کشش محسوس کرتے تھے۔ جو ترقی پسندی، وسیع خیالی اور روشن دماغی کی طرف لے جاتے تھے۔ ابتدا کی اسی تعلیم و تربیت اور ماحول ہی نے نیاز محمد خاں کو علامہ نیاز فتح پوری بنایا جیسا کہ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:۔

"نیاز کے کارناموں کو سمجھنے کے لئے سرسیّد کی تحریک کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔
سرسیّد نے مولوی شبلی کو علامہ شبلی بنایا ہو یا نہ ہو نیاز محمد خان کو علامہ نیاز فتح پوری
ضرور بنا دیا۔"[1]

مذہب کے معاملے میں تامل و تفکر سے کام لینے کے لئے اُس دور کا روایاتی "مولوی" ہرگز تیار نہ تھا۔ چنانچہ نیاز کی عقیدت و محبت، ایسے فلسفی اور منطقی عالموں سے بڑھنے لگی جنہیں وہ مولوی کم اور صوفی زیادہ سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں رام پور کے مولانا وزیر محمد خان سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا۔ احترام کا سمندر موجزن تھا۔ مثبت سے منفی اور منفی سے مثبت قدروں کا پیدا ہونا، ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ "مولوی" کے منفی رویے سے یہ مثبت و صحت مند نتیجہ نکلا کہ آپ نے مذہبی مطالعہ میں گہرائی اور وسعت پیدا کی۔ مسائلِ مذہب میں عقل و منطق سے کام لینے کا سلیقہ آگیا۔ اس طرزِ فکر نے اُن مولویوں سے اور بھی متنفر کردیا جنہوں نے مذہب کی اصل و حقیقی شکل و صورت مسخ کر رکھی تھی۔ ایسی ہی فطرت رکھنے والے، تنگ نظر

[1] "نیاز کی یاد میں" نگار پاکستان جشنِ طلائی نمبر۔ ص۔ ۱۱

ناپختہ عالموں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جس حد تک اخلاق کا تعلق ہے میں نے اِن میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جسے بعید ترین تاویل کے بعد بھی اسلام اور بانیِ اسلام کی بلند تعلیم اخلاق سے منسوب کیا جاسکے۔ میں جس وقت ان کے بطون کا تصوّر کرتا تھا تو وہ مجھے بالکل سیاہ پتھر کی طرح نظر آتا تھا اور میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ اُن کی رُوح بالکل اُجاڑ ہے اور اُن کا دل ویران۔ رُوحانی لُطف اور جمالیاتی تسکین، ذوق کے لحاظ سے ان کی ہستی بالکل "وادی غیر ذی زرع" کی حیثیت رکھتی ہے۔"[1]

نیاز کے ذہنی تغیّر اور ادبی رُجحانات کا تعلق اِسی "مولوی" سے ہے۔ شعر و سخن سے دلچسپی طبیعت میں جمال اور رُومانیت "عورت" کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ مدرسہ کے ماحول سے بددل ہو کر نیاز اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔ نیاز کے والد تربیتِ اخلاق کے سلسلے میں بچوں پر بے جا پابندیاں لگانے کے قائل نہ تھے۔ اُن کا نظریہ تھا کہ انسان فطری طور پر باصلاحیت ہوتا ہے اُس کی ذہانت اور صلاحیتوں میں اُس وقت نکھار آتا ہے جب اُسے آزادی سے سوچنے اور غور و فکر کرنے کا موقع دیا جائے۔ خواہ مخواہ کی روک ٹوک اُس کے ذہن و شخصیت کو کمزور کر دیتی ہے۔ نیاز کے والد جنسی داعیات کو بھی ذہنی و جسمانی نشو و نما کا صحیح ذریعہ قرار دیتے تھے۔ لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں طوائف کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ طوائف کا کوٹھا، تہذیب و شائستگی کا مرکز تھا۔ امراء و رؤسا تعلیم و تربیت، تہذیب، ادب آداب سیکھنے کی خاطر یہاں بلا روک ٹوک آتے۔ رقص و نغمہ کی محفلوں میں سماجی روایات و اقدار آدابِ گفتگو، اور نشست و برخاست کے سلیقہ سے روشناس ہوتے۔ نیاز کے والد کی وسیع الخیالی اور روشن دماغی اُنہیں اس آزاد، رنگین اور معطّر فضا میں لے آئی۔ لکھنؤ میں اُس وقت چودھرائن کے گھرانے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ جہاں کی شان و شوکت پر دربار کا سا گماں گزرتا۔ روز محفل سجتی

[1] "والد مرحوم، میں اور نگار" نیاز نمبر حصّہ اوّل۔ ص۔ ۳۴۰

اور اس محفل میں شعر خوانی، داستان گوئی، لطائف و ظرائف، ضلع جگت، رقص و سرود، سب کچھ ہوتا۔ عشق و محبت کے لئے فضا خوشگوار و سازگار تھی۔ محبت کی رنگین داستانیں بنتی بھی تھیں اور بگڑتی بھی تھیں۔ رنگ و بُو کے اِس ہوش رُبا ماحول اور ہنگامۂ حسن و شباب میں نیاز نے اپنے ذہن کے تاریک گوشوں کو منوّر کیا۔ اور اپنے جذبات و احساسات کو عشق کی بھڑکتی اور صبر و ضبط کی بجھتی آگ میں کُندن بنایا۔ نیاز کا ذہن لکھنؤ کی "زہرِ عشق" والی فضا میں رنگین و معطّر ہوتا چلا گیا۔ اُن کی تحریروں میں جو رنگینی رُومانیت، جمال پرستی اور عورت کے حُسنِ شباب سے مسحور کر دینے والی کیفیت ملتی ہے، اُس کی ابتدا یہیں سے ہوئی تھی۔

لکھنؤ میں نیاز کا قیام زیادہ عرصہ نہ رہ سکا اس لئے کہ سنہ ۱۹۹۶-۹۷ء میں اُن کے والد نے پنشن لے کر رام پور میں وکالت شروع کر دی۔ چنانچہ نیاز اُن کے ساتھ رام پور چلے آئے، مولانا وزیر محمد خاں جیسے عظیم عالم و فلسفی سے یہیں ملاقات ہوئی۔ اُن کے وسیع مطالعہ، عادات و خصائل اور اندازِ تدریس سے نیاز بہت متاثر ہوئے۔ اسی اثنا میں فتح پور چلے آئے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد سنہ ۱۹۰۰ء میں غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ روزگار کی طرف متوجہ ہوئے اور سنِ مذکورہ میں پولیس انسپکٹر کے لئے نامزد ہوئے اور مراد آباد میں پولیس ٹریننگ مکمل کی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں سترہ سال کی عُمر میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ پہلی بیوی کے بطن سے چار بیٹیاں پیدا ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں پہلی بیوی جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں دوسری شادی بمقام لکھنؤ، مختار بیگم سے ہوئی، جن سے ان کی چہیتی اور لاڈلی بیٹی شوکت جہاں آرا پیدا ہوئیں۔ نیاز کو شوکت سے بے پناہ محبت تھی۔ اُن کی شادی لکھنؤ میں مجدّد نیازی سے ہوئی۔ مجدّد نیازی، نیاز کے بہت گہرے اور قریبی دوست اخوند فیض محمد فاروقی کے بیٹے تھے، جن کا تعلق ڈیرہ اسماعیل خان سے تھا۔ وہ سُخن فہم و سُخن شناس تھے اور شعر و ادب کا سچا ذوق رکھتے تھے۔ نیاز اور نگار دونوں سے انہیں بہت محبت تھی۔ نیاز کی محبتیں بے لوث تھیں۔ سنہ ۱۹۲۵ء سے نگار کے عملۂ ادارت میں اُن کا نام بھی چھپنے لگا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں مجدّد کی والدہ کا انتقال ہوا تو اخوند فیض محمد فاروقی اِس خیال سے شادی نہ کرتے تھے کہ نجانے سوتیلی ماں کا مجدّد کے ساتھ کیا

سلوک ہو۔ نیاز کی عالی ظرفی دیکھئے کہ انہوں نے مجدّد کو اپنے پاس رکھنے کی پیش کش کی۔ کیونکہ وہ گھر کی خوشی، مسرّت اور سُکون کے لئے عورت کا وجود بہت ضروری خیال کرتے تھے۔ اُن کے خیال میں عورت سے ہی گھر محبت اور امن کا گہوارہ بنتا ہے۔ نیاز نے مجدّد کو بالکل اپنی اولاد کی طرح پالا۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ محبتوں کے ایثار کی اِس بارش میں فاروقی صاحب کے مشورے سے اپنی جان سے عزیز بیٹی شوکت جہاں کا عقد بھی مجدّد نیازی سے کر دیا۔ اُن کے دو بیٹے جاوید و جرّاد اور ایک بیٹی ہوئی۔ بچّے ابھی چھوٹے ہی تھے کہ اچانک شوکت جہاں ۲۷ اگست سنہ ۱۹۵۲ء میں انتقال کر گئیں۔ نیاز کے لئے یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ اُن کے دِل و دماغ کی رگیں ٹوٹ سی گئیں۔ خود لکھتے ہیں:۔

"ایک وقت تھا جب مَیں نے تمہارے سَر پر سہرا باندھا تھا اور آج بارہ سال کے بعد تم کو کفن پہنا کر بھی اور آخری بار گھر سے رخصت کر رہا ہوں شادی کے بعد رُخصتی کی رَسم ادا ہوا کرتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ رسم اِس طرح بھی پوری کی جاتی ہے، مجھے معلوم نہ تھا۔ خیر اِس زخم کے مندمل ہونے کا سوال ہی نہیں ــــ گھر کے دَر و دیوار، گھر کی ایک ایک چیز، گھر کا ذرّہ ذرّہ تمہیں پکار رہا ہے اور میں ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتا ہوں کہ تمہارے قدموں کی آواز تو نہیں وہ میرے ساتھ تمہاری سمندر کی سی گہرائی رکھنے والی خاموش محبت، جس کے سہارے مَیں اپنی زندگی کے آخری دِن پورے کر رہا ہوں، اب کہاں! ــــ اچھا ہوا اُسکا بھی ساتھ لے گئیں ــــ ڈوبنا ہے تو دیر کیوں ہو؟[1]"

لیکن نیاز مردِ آہن تھے اِس جانکاہ صدمے کو فطرت کا ایک وار جان کر بڑے صبر اور خندہ پیشانی سے جھیل گئے۔ اِس لئے کہ وہ موت اور زندگی کے مسائل پہ خوش ہونے یا آنسو بہانے کے عادی نہ تھے

[1] "ملاحظات نگار" سنہ ۱۹۵۳ء ص ۵ جلد ۶۴ شمارہ ۳

بلکہ ان اٹل فیصلوں کو حقیقت جان کر قبول کرنے والے تھے۔ نسیم انہونی کا بیان ہے کہ اُسی شام وہ تعزیت کو پہنچے۔ شوکت سے بے انتہا محبت کی وجہ سے اُن کا خیال تھا کہ نیاز پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہوں گے لیکن نیاز صبر و ضبط کا خاموش پہاڑ بنے تھے۔ وہ ابھی تعزیت کے لئے لفظ ہی ڈھونڈ رہے تھے کہ نیاز کتاب چھاپنے کی بات کرنے لگے۔[1]

گویا نیاز اپنی ذات میں گہرے سمندر تھے۔ جو غم کے اظہار کو انسان کی توہین سمجھتے تھے۔ مصائب و آلام اور زندگی نے ہر طرح سے امتحان لیا لیکن نیاز اس امتحان میں سُرخرو رہے۔ دوسری بیوی مختار بیگم کا انتقال ۱۹۴۰ء میں ہوا۔ مختار بیگم کی چھوٹی بہن گلزار بیگم بیوہ تھیں۔ چار بیٹوں محمد یوسف خاں، محمد آصف خاں، محمد عارف خاں، محمد قمر خاں اور ایک بیٹی کی ماں تھیں۔ مختار بیگم کے انتقال کے بعد نیاز کے نکاح میں آگئیں۔ ان سے دو لڑکے محمد سرفراز خاں نیازی اور محمد ریاض خاں نیازی ہیں۔

نیاز عورت کی اہمیت و عظمت کے قائل تھے گھر کے آنگن میں اُس کی نرم و مسحور کُن آواز کے شیدائی۔ بقول محمد فاروق کے مجدّد نیازی سے لے کر محمد ریاض خاں تک وہ اپنی اولاد سے بہت محبت کرتے تھے۔ مشفق باپ کی حیثیت سے وہ عظمت کا مینار تھے۔ سب سے سلوک یکساں تھا۔ کسی سے بھی کبھی کوئی زیادتی نہ کی۔ محبت کا جواب محبت سے پاتے تو جی اُٹھتے۔ یہی محبتیں قدم قدم کی سخت رکاوٹوں میں انہیں زندہ رکھے ہوئے تھیں۔

نیاز نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ ملازمت میں گزارا۔ ملازمت کی ابتدا پولیس کے محکمے سے کی۔ ۱۹۰۱ء میں پولیس انسپکٹر کی ٹریننگ مکمل کر کے تھانہ ہیڈیا ضلع مراد آباد میں تعینات ہوئے۔ افسروں سے مخالفت کی وجہ سے نیاز پر رشوت کا جھوٹا مقدمہ بنا دیا گیا۔ یہ بات نیاز جیسے بے باک نڈر اور سچے انسان کی انا پر ایک زبردست چوٹ تھی۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۰۲ء میں پولیس

[1]۔ نگار پاکستان جولائی ۱۹۶۶ء ص ۱۲۰

کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اُن کی اُفتادِ طبع اور سرشتِ مزاج اصل میں اس ملازمت کے لئے موزوں ہی نہ تھا۔ اس کے بعد نیاز فتح پور آ گئے اور ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک مدرسہ اسلامیہ کی انگریزی شاخ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ یہاں سے مستعفی ہو کر ۱۹۰۶ء میں نواب ریاض الحسن خاں کے عہد میں باونی اسٹیٹ کے دور میں شہر کوتوال اور پرائیویٹ سیکرٹری کے عہدوں پر مامور رہے۔ اس کے بعد ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان اجے گڑھ اسٹیٹ بندیل کھنڈ میں پولیس سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ یہاں ایک سال رہنا پڑا اور نیاز کے مطابق یہ سال اُن کی زندگی کا عجیب و غریب سال تھا۔ لکھتے ہیں:

"یہاں قدم قدم پر سیتا اور رادھا کا سامنا ہے اور اس خصوصیت کے ساتھ بے پردگی دیوانہ طرح انقلاب انگیزش راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں۔ بلند و بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیز، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بندی، اب آپ سے کیا کہوں کیا چیز ہیں۔"[1]

نشہ بخش زندگی کے اس رنگین، چکاچوند دور میں نیاز نے یہاں کے حُسن اور اپنے اندر کی عشقیہ کیفیات سے متاثر ہو کر کچھ نظمیں بھی کہیں یہاں سے ہانسی ضلع حصار اسکنر اسٹیٹ میں بطور سیکرٹری کام کرنے گئے۔ یہ زمانہ ۱۹۰۸ء کا ہے۔ ادبی رسائل و جرائد کے مطالعہ اور اہلِ علم و ادب کی محفلوں میں بیٹھنے کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ اسی زمانہ میں "مخزن" سے بہت لگاؤ اور دلچسپی پیدا ہوئی سید سجاد حیدر یلدرم سے ملاقات اور ان کی تحریروں سے متاثر ہونے کا یہی زمانہ ہے۔ وہ اُن دنوں ترکی "انشائے عالیہ" کے تراجم پیش کر رہے تھے۔ اس کا "خارستان" "گلستان و شیراز" شائع ہوا تو نیاز نے متعدد مضامین اسی رنگ میں لکھے: "ایک شاعر کا انجام" "پارسی دوشیزہ" "رقاصہ" اور "عورت" اسی

[1]۔ والد مرحوم، میں اور نگار، نیاز نمبر حصہ اوّل، ص ۳۷

تاثر کا نتیجہ تھے۔

۱۹۱۰ء میں نیاز دوبارہ مدرسۂ اسلامیہ فتح پور میں انگریزی شاخ سے منسلک ہوگئے۔ ڈپٹی
عبدالرؤف عشرت اور آفتاب علی خاں کرتی اِسی زمانہ کے ہونہار شاگرد تھے۔ اِسی دَور میں مولانا ظفرعلی
خاں کی دعوت پر "زمیندار" سے منسلک ہوگئے باقاعدہ طور پر صحافتی دُنیا میں "زمیندار" کے توسط سے
ہی قدم رکھا۔ مولوی وحیدالدین سلیم کی صحبت حاصل ہوئی کہ وہ ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ حُسنِ اتفاق
۱۹۱۱ء میں مسوری میں سجاد حیدر یلدرم اور نیاز کو کچھ عرصہ اکٹھا رہنے کا موقع مِلا۔ سجاد پولیٹیکل ملازمت
کے سلسلے میں افغانستان کے ایک امیرزادہ کی نگرانی پر مامور تھے۔ اور نیاز اسکنر اسٹیٹ سے وابستہ
تھے۔ زیادہ وقت علمی و ادبی گفتگو میں کٹتا۔ دونوں ایک دوسرے سے فیض یاب ہوتے۔ قاری سرفراز
حسین دہلوی (سیاحِ چین و جاپان) بھی یہیں آگئے۔ اور بڑا اچھا وقت گزرنے لگا۔ ۱۹۱۲ء میں مادرِ علمی
کی کشش نے پھر کھینچا۔ مولانا ظہورالاسلام اور شہر کے دیگر معززین کی خواہش پر مدرسۂ اسلامیہ کو ترقی
دینے کی خاطر ہیڈ ماسٹر بننا منظور کرلیا۔

نیاز شفیق و علیم اُستاد تھے۔ جن کی قابلیت اور علمیت مسلّمہ تھی۔ ہونہار طالب علموں کا خاص
خیال رکھتے اور اُن کی ممکنہ مدد میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے۔ برتاؤ میں شفقت و محبت کے ساتھ ساتھ
جاہ جلال بھی تھا۔ اُن کی آمد سے شعبہ انگریزی کو بہت فروغ حاصل ہُوا۔ اکثر طلبہ گورنمنٹ سکول
سے نام خارج کرکے مدرسۂ اسلامیہ میں داخلے کو سعادت و کامرانی سمجھتے تھے۔ نیاز طالب علموں
کو اپنی ذات کا حصّہ سمجھتے ہوئے بہت محنت و شفقت سے پڑھاتے تھے۔ جس کی وجہ سے
طالب علم اُن سے گہری عقیدت و محبّت رکھتے تھے۔ بقول آفتاب علی خاں :-

نیاز صاحب کی شفقت، عظمت، قابلیت اور صلاحیت کے باعث اُن
کے شاگرد اُن کی ذات سے گہری عقیدت رکھتے تھے ـــــ وہ بغیر کسی امتیاز
کے ہر شاگرد کو ایک جیسا سمجھتے تھے۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ
بعض اولاد، بعض باپ کو، بعض صفات کی بنا پر زیادہ پیاری لگنے لگتی ہے

لیکن ایک باپ کی نظر میں سارے بچے بچے ہی ہوتے ہیں۔ طلبہ کی اخلاق
نگرانی، اُن کے سرپرستوں کی ہدایت، اُن سے برتاؤ۔ نیاز صاحب کی یہ
ساری خوبیاں ناقابلِ فراموش ہیں[1]"۔

۱۹۱۴ء میں نیاز حکیم محمد اجمل خاں کے انگریزی سکول کے ہیڈ ماسٹر بن کر دِلّی تشریف لائے۔ یہ
انگلش اسکول حکیم اجمل خاں نے اپنے لڑکے حکیم جمیل خاں اور اپنے خاندان کے دوسرے لڑکوں کے لئے
کھولا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز پر نیاز صاحب کو اس کا ہیڈ ماسٹر مقرر کیا گیا۔ یہی وہ وقت
تھا جب بقول مُلّا واحدی :-

"ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈپٹی عبدالرؤف، نورالرحمٰن، نیاز کے ادبی معتقد ہوئے
اور اُن سے مِلنے کے لئے دِلّی کے پھیرے کیا کرتے تھے[2]"۔

اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ نیاز مُلّا واحدی کے اخبار "خطیب" میں علمی، ادبی و مذہبی
مضامین لکھنے لگے۔ اِس زمانے میں اُن کی مذہبی تحریریں، ادبی تحریروں کی طرح پسند کی جاتی تھیں اور
ان کی ادبیت کا آفتاب طلوع ہوچکا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں حکیم اجمل خاں کے انگریزی سکول سے مستعفی ہوکر
بھوپال چلے گئے۔ بہ حیثیت صحافی و ادیب نیاز کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ لوگ اُن کی
تحریروں کے منتظر رہتے اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے۔ بھوپال میں محکمۂ اوقاف کے افسرِ اعلیٰ ملک
حبیب احمد اُن کے طرزِ تحریر کے بہت قدردان تھے۔ اور نیاز کو محکمۂ اوقاف میں ملازمت کی پیشکش
کی۔ نیاز نے یہ ملازمت قبول کرلی مگر اُن کے مزاج و طبیعت سے مناسبت نہ رکھتی تھی۔ اپنی
علمی و ادبی صلاحیتوں، فطری ذہانت و قابلیت کی بنا پر دفتر تاریخ "دارالمصنفین" میں منتقل ہوجانے
کا موقع مِلا۔ یہاں نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کی ہدایت کے مطابق تاریخی، مذہبی

۱؎ "اُستادِ گرامی" "نگار" نیاز نمبر حصہ اول ص۔ ۷۸
۲؎ "نیاز اور دِلی" "نگار" نیاز نمبر ص۔ ۸۰

معاشرتی و سماجی کتابیں تصنیف و تالیف ہُوا کرتی تھیں۔ مولوی محمد امین زبیری، مولوی عبدالرزاق، اور مولوی محمد مہدی اسی ادارہ سے منسلک تھے۔ چنانچہ دفترِ تاریخ، نیاز کی زندگی کا پہلا زینہ ہے جس نے ان کی صلاحیتوں، تحقیق اور مطالعہ کو بے پناہ وسعت بخشی۔ اسی علمی و ادبی ماحول نے نیاز کی فطری صلاحیتوں کو بے پناہ حُسن و نکھار بخشا۔ چنانچہ "گہوارۂ تمدن" "صحابیات" "مسئلہ شرقیہ" "تاریخ الدولتین" محمد تہمیہ" عمدہ یا بریک" اسی دور کی اہم یادگاریں ہیں جو اہم تاریخی دستاویزات سمجھی جاتی ہیں۔ بیگم صاحبہ بھوپال کی ہدایت کے مطابق نیاز کا ہر طرح سے خیال رکھا جانے لگا لیکن فوری طور پر وظیفہ کے سلسلے میں کچھ مشکلات کا سامنا ضرور کرنا پڑا بقول مدیرِ "نقوش" محمد طفیل صاحب :-

"نیاز صاحب بھوپال پہنچے تو فوری طور پر کچھ نہ ہُوا۔ مجبوراً انہیں محکمۂ اوقاف میں کام کرنا پڑا جب دو برس یونہی گزر گئے تو دوستوں کے تقاضے سے انہوں نے ایک عرضداشت بیگم صاحبہ کو بھیجی —— اس میں بیگم صاحبہ پر طنز اور اپنی بڑائی کا حد درجہ احساس تھا۔ بیگم صاحبہ کا ظرف دیکھئے کہ انہوں نے اسی عرضداشت پر جمی ۱۹۱۵ء میں ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا تاکہ بزرگوار آزادانہ تصنیف و تالیف کا کام کر سکیں"[1]

اسی دوران مولوی محمد مہدی مرحوم، ارشد تھانوی، محمد یوسف قیصر، اور سرور قادری نے مل کر اساتذۂ اُردو کے کلام کا انتخاب کتابی شکل میں شائع کرنا چاہا۔ نیاز بھی اس جماعت میں شامل ہو گئے بحث و مباحثہ کے شائق۔ نیاز کے حافظہ میں کتابوں کے حوالے، اقتباسات اور بے شمار اشعار محفوظ تھے۔ چنانچہ بحث و تنقید زیادہ ہونے لگی اور کچھ دن بعد انتخاب کا یہ کام ہی ختم ہو گیا۔ بھوپال میں نیاز کا قیام ۱۹۲۶ء تک تقریباً گیارہ سال رہا بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد جانشینی کا مسئلہ شروع ہُوا تو نیاز کی مشکلات بہت بڑھ گئیں چنانچہ مارچ ۱۹۲۷ء میں وہ لکھنؤ منتقل ہو گئے تمام

---

[1] "نیاز صاحب" نگار نیاز نمبر حصہ اوّل ۱۷۱۰

سرکاری و نیم سرکاری ملازموں سے ہٹ کر اپنے آپ کو "نگار" کے لئے وقف کر دیا۔

اپریل ۱۹۲۷ء میں اُردو ہندی کی ترقی کے لئے حکومت کی طرف سے ہندوستانی اکیڈمی قائم کی گئی۔ پچاس ہزار روپیہ کی سالانہ رقم، ہندی اُردو لٹریچر کی ترقی کے لئے منظور کی گئی۔ شعبۂ اُردو کے لئے سجاد حیدر یلدرم، رشید احمد صدیقی، مرزا محمد عسکری، پریم چند، عبدالماجد دریاآبادی کے ساتھ ساتھ نیاز فتح پوری بھی مقرر ہوئے۔ گویا اُن کی علمیت و قابلیت کا کھلا اعتراف کیا جانے لگا۔

نیاز کا سلسلۂ ملازمت خاصا طویل ہے انہوں نے کئی محکمے اور کئی شعبے بدلے۔ وہ فطری طور پر مفکر و فن کار پیدا ہوئے تھے لیکن غمِ روزگار، غمِ دوراں، غمِ جاناں سے زیادہ دل فریب و قوی ہے۔ ایک انسان کی ذات کے ساتھ کئی اور زندگیاں بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ نیاز کو بھی اپنی آل اولاد کے لئے یہ سخت پاپڑ بیلنا ہی پڑے۔ اسے اُن کی بے دلی تو نہیں کہا جا سکتا مگر اسے اُن کی طبیعت کی تلون مزاجی کا ضرور پتا چلتا ہے کہ وہ زندگی کو متحرک، رنگا رنگ اور بدلتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ وہ فطری طور پر فن کار تھے۔ ایسا فن کار جو زندگی پہ ایک رنگ کا سایہ نہیں بلکہ مختلف رنگوں کی قوسِ قزح دیکھنا چاہتا ہے۔

گرد و پیش کا ماحول اور زمانہ انسان کی شخصیت کی تخلیق و تکمیل میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بعض عہد آفریں اور عہد ساز شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ماحول اور زمانے کی خالق ہوتی ہیں نیاز کی شخصیت بھی ایسی ہی جامع اور رنگا رنگ تھی۔

نیاز نے اپنی علمی و ادبی زندگی کا آغاز بطور صحافی کے کیا اور ادبی صحافت کو اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ نیاز نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۱۰ء میں مولانا ظفر علی خاں کے "زمیندار" سے کیا۔ مولانا ظفر علی خاں، نیاز کے قلم اور صلاحیتوں کے بہت معترف تھے۔ دل سے قدر کرتے تھے اسی لئے اُن کی "زمیندار" سے وابستگی کو خوش نصیبی قرار دیتے ہیں :-

"مولوی نیاز محمد خاں صاحب، نیاز فتح پوری کے نام سے ہمارے نکتہ سنج

ناظرین ناآشنا نہ ہوں گے۔ مولوی صاحب کے مضامین نظم و نثر کئی باران
اوراق کا سرمایۂ نازش ثابت ہو چکے ہیں۔ اب آپ مستقل طور سے زمیندار
سے منسلک ہو چکے ہیں اور ہم اس تعلق کو زمیندار کی خوش
قسمتی سمجھتے ہیں۔"

لیکن یہ سلسلہ چھ ماہ سے زیادہ نہ چل سکا کیونکہ نیاز اور مولانا ظفر علی خاں کے مزاج میں ہم آہنگی نہ تھی۔ ۱۹۱۳ء میں جب مسجد کانپور کا المناک و خونچکاں واقعہ پیش آیا تو مولانا ظفر علی خان کو ایک ایسے نڈر، بے باک نامہ نگار کی ضرورت تھی جو مسجد کانپور کی عدالتی کاروائی مؤثر انداز میں سچائی و صداقت کے ساتھ "زمیندار" کے لئے لکھ سکے۔ چنانچہ نیاز نے نامہ نگار کے یہ فرائض سر انجام دیئے۔ وہ مسجد کانپور کی عدالتی کاروائی مؤثر انداز میں روز بذریعہ تار "زمیندار" کے لئے روانہ کرتے۔ یہ اٹھارہ قسطیں رپورٹنگ کے انداز میں شائع ہوئیں۔ چونکہ محکمۂ پولیس سے وابستہ رہ چکے تھے اس لئے عدالتی اور دوسرے اُمور سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ مقدمہ کی کاروائی اور عدالتی تفصیلات کو خاص ترتیب سے لکھ کر عوام کو اس سے روشناس کرایا۔

"زمیندار" سے علیحدگی کے بعد ۱۹۱۱ء میں نیاز نے میرٹھ کے ہفتہ وار اخبار "توحید" کے معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ "توحید" "الہلال" اور "زمیندار" کے درجے کا اخبار تھا۔ اسے علمی، ادبی اور سیاسی رسالے کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ اس کے پہلے ایڈیٹر خواجہ حسن نظامی تھے جن کی علمی و ادبی حیثیت مسلّمہ ہے۔ چنانچہ اُن کی اور نیاز کی تحریروں نے "توحید" کا معیار بہت بلند کر دیا۔ ۱۹۱۲ء میں "بہیل" نامی رسالہ نکالنے کا خیال ہوا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اس کا اجرا نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۳ء میں مُلّا رموزی کے ہفتہ وار اخبار "خطیب" کے قلمی معاون رہے۔ "خطیب" میں نیاز کے علمی، ادبی اور مذہبی مضامین شائع ہوتے رہے۔ جو تمام حلقوں میں بے حد پسند کئے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں

ملہ: اداریہ نوٹ۔ زمیندار لاہور ص-۱، ۹ دسمبر ۱۹۱۰ء جلد ا نمبر ۲۰۴

سردار دیوان سنگھ مفتون کا اخبار "رعیت" "احسان الحق اور مُلّا رموزی کی سرپرستی میں آگیا۔ مُلّا رموزی کی دعوت اور درخواست پر نیاز نے "رعیت" کی چیف ایڈیٹری قبول کر لی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جیسے عالم مذہبی و مفکر نے اخبار "رعیت" ہی کے سلسلے میں نیاز کی شاگردی اختیار کی۔ یوں مودودی صاحب کی نیاز سے گہری نسبت رہی بقول مُلّا واحدی:-

"مودودی صاحب اٹھارہ، اُنیس برس کے ہوں گے، نیاز صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ یہ اخبار نویسی سیکھنا چاہتے ہیں۔ تنخواہ نہیں لیں گے بس ایک میز کرسی کی ضرورت ہے۔"[1]

"رعیت" کی پالیسی نرم اور معتدل تھی۔ عارف ہسوی انگریزوں کی مخالفت میں انتہا پسند تھے ان کی انتہا پسندی کے سامنے نیاز اور مُلّا رموزی کی معتدل پالیسی کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ آخر کار ملی فشاری کی بنا پر "رعیت" بند ہو گیا۔ نیاز "رعیت" کے چیف ایڈیٹر صرف تین ماہ تک رہے۔ بطور صحافی، نیاز کا قلم بہت طاقت ور تھا۔ ابتدائی زندگی میں اپنے والد سے سچائی، صداقت، حق گوئی اور بے خوفی کا جو درس انہوں نے لیا تھا وہ اب بہت پختہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جس رسالے یا اخبار کو مرتب کیا اُس پر اپنے قلم کی گہری چھاپ ثبت کر دی۔

فروری ۱۹۲۲ء میں نیاز اور "یاران نجد" نے مل کر "نگار" کا اجرا کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نیاز پر ترکی زبان سیکھنے کا جنون سوار تھا۔ نیاز ترکی زبان کی مشہور شاعرہ نگار بنت عثمان کے انقلابی خیالات اور پرجوش و خوب صورت شاعری سے بہت متاثر ہوئے۔ اسی عقیدت و محبت نے اُن کے شہرہ آفاق رسالہ "نگار" کا رُوپ دھارا۔ جو صحیح معنوں میں علمی، ادبی اور سنجیدہ ذوق رکھنے والے اہل علم کا رسالہ ہے۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:-

"میں نگار کو اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھتا ہوں جس میں تہذیب الاخلاق اور

---

[1] "نیاز اور دلی" جشن طلائی نمبر ص ۳۴۰

مخزن جیسے رسالے شامل ہیں[12]۔

اس مزاج کے اعتبار سے اس مشرقی رسالے کا مستقل معیار اور ایک اعلیٰ و سنجیدہ مسلک رہا ہے۔ اس عہد ساز اور عہد آفریں رسالے نے پرانی، فرسودہ روایات کو فکر و خیال کی نئی روشنی بخشتے ہوئے اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ یوں "نیاز و نگار" ایک ہی نام، ایک ہی تحریک اور ایک ہی ادارہ بن گئے۔ بقول فیض احمد فیض:

> "نیاز نے اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی کئی نسلوں کے فکر و خیال کو متاثر کیا اور ذوق و ذہن کی تربیت کی۔ توہم پرستی اور تعصب کی بجائے عقلیت اور روشن خیالی، تقلید کی بجائے تجدد و ابتذال کی بجائے ندرت فکر، ان سب اقدار کے ترویج میں نگار کے صفحات کا کافی دخل ہے[13]۔"

نیاز نے نگار کو اس وقت روشن خیالی، جدید تصورات اور عقلیت پسندی کا ترجمان بنایا جب اس قسم کے اقدامات کی سخت ضرورت تھی۔ نیاز نے اپنے ان اقدامات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پہلے ہی ایک حلقۂ احباب بنایا تھا۔ یہ حلقہ "یارانِ نجد" کے نام سے مشہور ہوا اور کسی نہ کسی عنوان سے نگار کے صفحات کو مزین کرتا رہا۔ "یارانِ نجد" کی اصطلاح نیاز نے مثنوی مولانا روم کے اس شعر سے لی ہے:

> باز خواں از نجد و از یارانِ نجد ؎
>
> تا در و دیوار را آری بہ وجد

نجد کی سرزمین میں عشق و محبت کی جو خوشبو بسی ہوئی ہے وہی خوشبو "یارانِ نجد" کی سرشت میں تھی۔ ان میں شاہد ناقد امینی، اکبر، لطیف الدین احمد، نذیر احمد قریشی، مخمور اکبر آبادی، عارف حسن عارف، محمد احمد ہاشمی، ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی، محمد الدین خلیق دہلوی، سید حسن عابد جعفری، بیدل

۱۲۔ "نیاز نمبر" نگار ص ۔ ۹۵

۱۳۔ نگار پاکستان جولائی ۱۹۶۶ء ص ۔ ۵

شاہجہاں پوری، مانی جائسی، عبدالرؤف عروج، امام الدین امام اکبر آبادی، ملک حبیب احمد اور مقدس نامی، اہل کمال شامل تھے۔ یہ نیاز کے احباب کا حلقۂ خاص تھا۔ چنانچہ انہی کے مشورے سے نومبر ۱۹۲۱ء میں لطیف الدین احمد کے مکان پر "نگار" کے اجرا کا فیصلہ کیا گیا۔ ہر ایک نے بیس بیس روپے جمع کئے۔ "نگار" ۱۹۲۲ء میں آگرہ سے نکلا اور پہلی اشاعت ہی سے خود کفیل ہو گیا۔ آگرہ سے بھوپال، لکھنؤ ہوتا ہوا کراچی پہنچا اور ابھی تک اپنے مخصوص علمی و ادبی مزاج کے ساتھ برابر شائع ہو رہا ہے۔ "نگار" کا سب سے بڑا اعزاز اور افتخار ہے۔

"نگار" ہی کے ذریعے نیاز کی توجہ سنجیدہ اور علمی موضوعات پر مرکوز رہی۔ اس کی معرفت ہی یہ کہ اُن کی ادبی شخصیت کو مزید چمکنے پھولنے کا موقع ملا بلکہ اب وہ ادیب سے آگے بڑھ کر ادیب ساز کے منصب پر فائز ہو گئے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے لفظوں میں:

> "نگار کے ذریعے انہیں تخلیقی و تحقیقی قوتوں کے آزادانہ استعمال کا موقع مل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے افسانہ، ناول، صحافت، مقالہ نگاری، تنقید، مکتوب نگاری اور انشا پردازی سب میں اُن کا سکہ چلنے لگا۔ اب وہ ادیب نہ رہے ادیب ساز بھی ہو گئے۔ اور اُن کی علمی و ادبی شخصیت اتنی ترقی یافتہ و واضح ہو گئی کہ ادبی تاریخ کی ترتیب و تدوین میں اُن کا کٹر سے کٹر مخالف بھی اُن کے نام کو نظرانداز نہیں کر سکتا[14]۔"

"نگار" و "نیاز" ایک ہی شخصیت کے مظہر ہو، ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ شخصیت تو بہت سارے میلانات و رجحانات، جذبے، فکر، عمل، شعور، تحت شعور اور لاشعور سب کا مرکب ہوتی ہے جو بتدریج وحدت بن جاتی ہے۔ ایسی وحدت جو کسی کا رنگ انفرادیت کی شناخت بن جاتی ہے۔ نیاز فتح پوری اسی نوع کی ہمہ جہت و ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ بقول کوثر مظہری:

۱۴۔ "ملاحظات" جشن ملاقات نمبر، ص ۔ ۲

"وہ ہشت پہل نہیں صد پہل شخصیت کے مالک ہیں۔ ہر پہلو اور ہر گوشہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہر شخصیت پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ ہر کہ دیدن میل دارد و سخن بیند مرا"[1]

عظیم شخصیات اپنی مضبوطی اور جامعیت کی بنا پر فردِ واحد نہیں رہتیں بلکہ ایک انجمن بن جاتی ہیں۔ یہ فانی لوگ تجربوں کی بے شمار منزلوں سے گزر کر تخلیق و تنقید کی وادی میں قدم رکھتے ہیں۔ نیاز فتح پوری بھی اسی قسم کے افراد میں سے تھے برہم ناتھ دت نے صحیح لکھا ہے:

"نیاز فتح پوری، اپنے اس انسانی جامے میں ایک فردِ واحد نہیں بلکہ انجمن نابغۂ روزگار ہیں۔ برائیوں اور خوبیوں کا وہ مرقع جو فانی انسانوں کو غیر فانی بنا دیتا ہے۔ ان کے متعلق بلا ارتحال حقیقت گزاری یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدرت نے انسانی ارتقا کی تمام منزلیں مارنے کے بعد ان کی تخلیق کی۔"[2]

نیاز کی شخصیت متنوع اور رنگا رنگ ہے۔ بعض لوگ انہیں ایک باغی ایڈیٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں، جس نے اپنے پُر زور قلم سے تنگ نظری اور کٹھ مُلّائیت کے خلاف زبردست جہاد کیا۔ بعض کے خیال میں وہ رُومان و جمال کے پرستار ہیں۔ بعض اُنہیں سخت گیر نقاد کے طور پر پہچانتے ہیں۔ بعض انہیں بہت اچھا سیاسی مبصر سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان تمام حیثیتوں سے ہٹ کر نیاز ایک بڑے انسان ہیں۔ زندگی نے قدم قدم پر اُنہیں کڑے امتحانات میں ڈالا۔ سنگدل زمانے نے پتھروں کی بارش کی۔ کافر، ملحد، اور زندیق ٹھہرایا۔ مگر اُن کے پائے استقامت میں لرزش پیدا نہیں ہوئی طعن و تشنیع، اور الحاد و تکفیر کے تیروں کی بارش ہوتی رہی لیکن وہ علم و دانش کا علم لئے ہوئے آگے ہی بڑھتے رہے۔ بلکہ راستے کی ہر بڑی رکاوٹ پر اپنی ذات اور رائے پر اعتماد بڑھتا ہی چلا گیا

۱۔ "نیاز فتح پوری ــــ شخصیت اور فن کے آئینے میں" نیاز نمبر حصہ اوّل۔ ص ۶۷

۲۔ "نیاز فتح پوری ــــ ایک غیر فانی انسان" نگار نیاز نمبر حصہ اوّل۔ ص ۱۵۰

گردشِ فلک نے اپنے عزیزوں اور محبت کرنے والوں کو ہمیشہ کے لئے چھینا تو گردشِ ارض نے بارہا ہاتھ قلم کرنے کی کوشش کی۔ نیاز نے فطرت اور دُنیا کی آزمائشوں کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کیا اور کامیاب رہے۔ یہاں تک کہ ظالم دُنیا کو یہ کہنا پڑا:۔

"حضرت نیاز اُن چند مانے گئے استثنائی افراد میں سے ہیں جن کے پیدا کرنے کے معاملے میں بے درد پرور آسمان ازل سے لے کر اب تک بخل کرتا چلا آرہا ہے۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ان کی ذات کے احاطے میں اتنی خلاقی کے شہر آباد ہیں، اتنے شعور کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور رامش و رنگ کی اتنی بے شمار براتیں اُتری ہوئی ہیں تو بے ساختہ جی چاہتا ہے ان کو کلیجے سے لگا لوں۔ کاش نیاز فتح پوری کا سا خالق طرز انشا پرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا لیکن کیا کیا جائے

ع ہائے وہ عقل جو نرغے میں ہو دیوانوں کی"[1]

نیاز ایک انسان، خیر و شر و خطا کی بہتات کا پُتلا، جن کا ایمان تھا کہ اگر انسان غلطی نہ کرے تو دُنیا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ فطرت سے ذہانت و فطانت کا غیر معمولی تحفہ لے کر آئے تھے۔ اور ایک نابغۂ فکر و فن کی حیثیت رکھتے تھے۔ اہلِ زبان کے ساتھ ساتھ اہلِ ضمیر بھی تھے۔ وضع داری رکھ رکھاؤ، تحمّل و بُردباری، محبّت و مروّت۔ دیانت داری، فرض شناسی، زندگی کا نظم و ضبط اور قول و عمل میں مطابقت، اُن کے کردار کے بہت نمایاں اوصاف تھے، اُن کا عقیدہ تھا کہ زندگی اس طرح بسر کرنی چاہیئے کہ انسان کی موت اُس کے ساتھ ناانصافی بن جائے اور اُنہوں نے اسی طرح زندگی بسر کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ جو کام کئی آدمی مل کر نہ کر سکتے تھے وہ تنہا کر لیتے تھے۔ نیاز کا کہنا تھا کہ کسی کی زندگی میں اگر Courage, humour اور

۱۔ جوش ملیح آبادی۔ "نگار" جشنِ طلائی نمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۹۰

ADVENTURE کو دخل نہیں تو وہ صرف جی رہا ہے زندگی نہیں گزار رہا کیونکہ زندگی نام ہے اُن کے مجموعے کا۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ نیاز بلند کردار، صاحبِ عزم اور عالی ظرف انسان تھے۔ مزاج میں پُرکاری بھی تھی اور سادگی بھی۔ جدید علوم و فنون اور فکر و نظر کے دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات کے قدردان تھے۔ صاف دل و صاف گو تھے۔ ظاہر و باطن میں یکسانیت کی وجہ سے زندگی کھلی ہوئی کتاب کی مانند تھی۔ بہت خوددار، حق گو اور مستقل مزاج تھے۔ ہر بڑے فن کار کی طرح کم گو اور کم آمیز تھے۔ لیکن جس سے ملتے تھے بڑی بے تکلفی اور خلوص سے ملتے تھے۔ اُنھوں نے زندگی کے جو اُصول مرتب کرلیے تھے، زندگی بھر اُن کے پابند رہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُصول چاہے کتنا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو برتنے سے اعلیٰ ہو جاتا ہے۔

زندگی کا معمول کچھ اس طور پر تھا کہ صبح اُٹھتے، سیر کرنے کو جاتے۔ ناشتہ کے بعد احباب کے خطوط کا جواب دیتے۔ نگار کے لیے مضامین کا انتخاب ہوتا۔ مضامین کی تصحیح کرتے، ناقابلِ اشاعت مضامین واپس کر دیتے۔ پھر کھانا کھاتے۔ کچھ آرام کے بعد پھر کام میں لگ جاتے، زیادہ وقت تصنیف و تالیف میں گزرتا۔ احباب سے گپ شپ ہوتی۔ نہ چائے کے عادی تھے نہ پان کے۔ دوستوں سے ملنا، مطالعہ اُن کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ سینما بھی شوق سے دیکھتے۔ موسیقی اور فوٹوگرافی سے بھی شغف تھا۔ ستار بجا لیتے تھے۔ اُن کی ایک تصویر کو ٹائمز آف انڈیا کی طرف سے انعام بھی ملا تھا۔ جس زمانہ میں الیسٹریٹڈ ویکلی میں معمے نکلتے تھے تو معموں کو حل کرنے میں بڑی مستعدی دکھاتے۔ کہا کرتے تھے کہ مقصد انعام حاصل کرنا نہیں صرف معمّہ حل کرنا ہے۔

کھانے میں ماش کی دال جس پر چھنکتا ہوا پیاز کا بگھار، توے سے اُترتے ہوئے گرم گرم پھلکے بہت پسند تھے۔ پھلوں میں آم اُن کا پسندیدہ پھل تھا مگر تمنّی یہ تھی کہ آم آتے گرمی میں ہیں

[1] میرے ابّا جان، سرفراز نیازی نگار پاکستان جون ۱۹۶۶ء

اور گرمی اُن کے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔ کہا کرتے تھے۔ میری موت گرمیوں میں واقع ہوگی۔ اُن کے بیان کے مطابق انہیں تین چیزیں بہت پسند تھیں، ماش کی دال، آم، عورت، بھوپال کے یوسف ہوٹل کی گرم گرم کچوریاں بھی اُنہیں بہت پسند تھیں۔ جب بھی بھوپال آتے بڑے شوق اور رغبت سے کھانے کے لیے جاتے، وقت کے ایسے پابند کہ لوگ اُنہیں آتے جاتے دیکھ کے اپنی گھڑیاں ملاتے تھے۔ خوش ذوقی اور نفاستِ طبع فطرت کی طرف سے لے کر آئے تھے۔ بقول سرفراز نیازی:-

ابّا ایک SYSTEMATIC اور ARTISTIC NATURE لے کر پیدا ہوئے تھے۔ پلنگ سیدھا بچھا نہ ہوتا تو وہ سو نہیں سکتے تھے۔ اگر میرے کپڑے یا کتابیں منتشر ہوں تو وہ خود میرے کمرے میں آکر ٹھیک کر دیتے۔ کام چاہے کسی کا ہی کیوں نہ ہو اُنہیں کرنے سے کبھی عار نہ ہوتا۔ میں نے اُنہیں جھاڑو دیتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔[1]

زندگی کے سارے مشاغل میں اُن کے فکر و عمل کا انداز یہی تھا۔ اس طرزِ زندگی کو وہ ہندوستانی فلموں میں بھی دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے۔ نیاز کو سینما بینی کا شوق آخری عمر تک رہا۔ وہ ہندوستانی معاشرہ کے لیے صاف ستھری، خوب صورت فلموں کی خواہش رکھتے تھے اور اس صنعت کی نزاکتوں اور باریکیوں سے بھی آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۲ء میں مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنی فلم "پریم درپن"[2] کے مکالموں، مناظر، ڈرامہ اور گانوں کا کام نیاز کے سپرد کیا تھا۔ قیامِ حیدرآباد کے اسباب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:-

”میرے قیام کا سبب حیدرآباد میں یہ ہے کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد صدرِ اعظم بہادر کی مثنوی ”پریم درپن“ کا گویا فلم تیار ہو رہا ہے۔ اور مکالموں، گانوں اور

[1] ”میرے ابّا جان“ نگار پاکستان جون ۱۹۶۶ء ص - ۳۰

[2] ”پریم درپن“ کا مخطوطہ جس پہ مہاراجہ کشن پرشاد کے دستخط بھی ہیں قومی عجائب گھر کراچی میں موجود ہے۔

مناظر کی نگرانی میرے سپرد ہوئی ہے۔ اِس فلم کو یہیں حیدر آباد کی لمیٹڈ کمپنی تیار کر رہی ہے — میں کوشش کر رہا ہوں کہ ہندوستانی فلموں میں جو نقائص عام طور سے نظر آتے ہیں وہ اس میں نہ پائے جائیں۔ اور ہر ممکن حد تک تمام مناظر و گفتگو وغیرہ فطری حالات میں پیش ہو سکیں یہ فلم غالباً دسمبر میں مکمل ہو جائے گا اس لیے میرا ابھی اُس وقت تک یہاں قیام ضروری ہے۔"[1]

نیاز نے اِس فلم پر سخت محنت کی لیکن بد قسمتی سے یہ تیار نہ ہو سکی۔ شکست کھانا اور حوصلہ ہار دینا نیاز نے سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ دُھن کے پکّے تھے اس لیے ضیا عباس ہاشمی کے اشتراک سے "لکھنؤ نگیز" کے نام سے فلم کمپنی قائم کرلی اور پھر بڑے انہماک سے ایک فلم کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ نیاز نے اِس دوران میں ایک فلمی کہانی بھی لکھی۔ لیکن فلمی کہانیوں کا عام طریقہ یقیناً نیاز کے ادبی رنگ سے مختلف تھا۔ چنانچہ اُن کا یہ خواب ادھورا ہی رہ گیا۔ لیکن اِس طرح کے ادھورے خوابوں نے شخصیت کی تکمیل پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ اُن کی مستقل مزاجی اور نظم و ضبطِ حیات میں کوئی فرق نہ آیا۔

نیاز وضعداریوں کے آدمی تھے جس کو ایک بار پیار کیا، تمام عُمر اسے نبھایا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر نفرت کوئی چیز ہے تو محبت یقیناً اس سے ارفع ہے۔ اگر تلخی دبے مرّوتی کوئی شے ہے تو نرمی مٹھاس و شیرینی اُس سے بلند تر ہے۔ اگر خطا کوئی حقیقت ہے تو عفو و درگذر بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی زندگی ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے جن میں اُنہوں نے نفرتوں کے جواب میں محبت اور خطاؤں کے جواب میں عالی ظرفی کا ثبوت دیا۔ رئیس احمد جعفری نے نیاز پر لادینیت دہریت اور الحاد کی تہمت لگانے میں بڑے جوش و خروش سے حصّہ لیا تھا۔ لیکن جب لکھنؤ میں وہ اُن سے ملنے گئے تو نیاز کی محبت اور ازراہ کا یہ عالم تھا جیسے اِن کے حقیقی دوست یہی ہوں۔ حتیٰ کہ پاکستان میں جب مدیر "نقوش" محمد طفیل نے لاہور میں نیاز کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تو نیاز کے اصرار پر رئیس احمد جعفری کو بھی اُس میں بُلوایا۔ اِسی طرح کی ملاقاتوں اور پُرخلوص قربتوں کے بعد جعفری صاحب نے نیاز کی شخصیت و کردار کے بارے میں جو رائے قائم کی وہ بالاختصار یوں تھی کہ:

[1]: ملاحظات نگار اکتوبر ۱۹۳۶ء ص ۸۰

"نیاز بہت اچھے اور بہت بڑے انسان ہیں۔ میں ان کے افکار و خیالات تحقیق و نظریات اور داعیات سے اختلاف کر سکتا ہوں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ایسا کیا بھی۔ لیکن جس چیز سے کبھی انکار نہیں کیا نہ کر سکتا ہوں وہ ہے اِن کی عالی ظرفی اور مقامِ انسانیت[1]۔"

یہی مقامِ انسانیت نیاز کا عقیدہ بھی تھا اور مذہب بھی۔ اُس دَور کی روایت پرستی کے بت کدے میں وہ "نگار" کا تیشہ لیے گھوم رہے تھے۔ داخلی محاذ پر فکری آزادی کی جنگ کے دیر سپاہی تھے۔ وہ ایک اچھے اِنسان تھے اور اچھا انسان بننے ہی کو سب سے اچھا مذہب خیال کرتے تھے۔ بقول مالک رام:

"نیاز نے اپنی زندگی میں بہت بُت توڑے ادبی، سماجی، مذہبی۔ کافر انھیں مومن اور مومن اُنہیں کافر سمجھتے رہے حالانکہ وہ صرف اِنسان تھے اور ایک اچھا انسان بننے ہی کو معراجِ حیات خیال کرتے تھے[2]۔"

نیاز وسیع القلب اور وسیع النظر تھے۔ اِسلام کو صرف مُسلمانوں کی میراث نہ جانتے تھے۔ اِسلام اُن کے نزدیک مذہبِ اِنسانیت تھا اور وہ اُس پر عمل کا حق سب کو دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے باب میں مالک رام کے عمیق و وسیع مطالعے سے بہت متاثر تھے۔ اوّل اوّل مالک رام کا طویل مضمون "عورت اور اسلام" بالاقساط "نگار" ہی میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ۱۹۵۱ء میں نیاز نے اپنے تعارفی مقدمہ کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا۔ مالک رام کی طرح دوسرے غیر مُسلم ممتاز اہلِ قلم نے بھی نیاز کے سچّے اور باکردار مُسلمان ہونے کا دِل سے اعتراف کیا ہے بقول فراق گورکھپوری:۔

[1]: نیاز صاحب اور اُن کی شخصیت "نگار پاکستان نیاز نمبر حصّہ اوّل ص ۹۹

[2]: "نیاز فتح پوری" رسالہ آج کل، جولائی ۱۹۶۶ء ص ۱۱۔ جلد ۲۴۔ نمبر ۱۲

"حضرت نیاز مسلمان ہیں لیکن کیسے مسلمان ہیں؟ ایک ایسے مسلمان جن کے اسلام پر ہندو دھرم بھی ناز کرے۔ خود میں بھی یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ جیسے ہندو دھرم کے سر پر دنیا کے تمام پیغمبروں اور خصوصاً پیغمبرِ اسلام کے دستِ شفقت کا سایہ ہے۔ میں نے حضرت نیاز کو ایسا مسلمان پایا جو انسان دوستی کا جیتا جاگتا مجسمہ ہے۔[1]"

نیاز نے ہمیشہ انسان کے حقِ اعمال و حقِ اخلاق کو سراہا ہے اور اسے مذہبِ اسلام کی اساس قرار دیا ہے۔ مذہبی مسائل میں وہ کورانہ تقلید کے نہیں، تفکر و اجتہاد کے قائل ہیں۔ وہ خدا کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وسیلے سے پہچانتے ہیں۔ اور انسان کی عظمتوں کے یوں قائل ہیں کہ انسان کو خدا تک رسائی انسان کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اُن کی اسی روشن خیالی اور آزادہ روی کی بنا پر کفر، بے دینی، مُلحد اور دہریہ کے فتوے لگے۔ لیکن نیاز نے ان سب فتووں کو بڑی کشادہ دلی سے قبول کیا۔ اس لئے کہ اُن کے خیال میں اخلاقیات سب سے بڑا مذہب ہے۔ اور مذہبِ اسلام اخلاقی نظام کے اعتبار سے دُنیا کا بہترین مذہب ہے۔ نہ تو وہ فرقہ پرستی سکھاتا ہے اور نہ ہی اپنے ماننے والوں کو گروہوں میں بانٹتا ہے۔

نیاز تنگ نظری اور تقلید کے شکار ہوئی کے مذہب کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ اُن کے قلم نے نام نہاد عالموں پر ہمیشہ شدید ضربیں لگائیں۔ نتیجتاً عُلماء کے ایک طبقے نے جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیاز کو اسلام کے دائرے ہی سے خارج کر دیا۔ یہ نیاز پر صریحاً ظلم تھا۔ بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری:

"اُن کا اسلام خالص اسلام ہے۔ وہ نہ شیعی ہے نہ سُنّی۔ نہ مقلد ہیں نہ غیر مقلد نہ دیوبندی ہیں نہ بریلوی۔ نہ قرآنی ہیں نہ اہلِ حدیث۔ وہ محض مسلمان ہیں اور

[1]: آشفتہ بیانی میری "نگار پاکستان نیاز نمبر حصّہ اوّل ص ۵۴

چونکہ ان میں سے کسی فرقے سے بھی اُن کا تعلق نہیں اس لئے ہر فرقہ انہیں بے دین ٹھہراتا ہے۔ شیعہ، سُنّی سمجھتے ہیں۔ سُنّی شیعہ تصوّر کرتے ہیں مقلدین کا خیال ہے کہ وہ غیر مقلد ہیں۔ غیر مقلد، تقلید کا طعنہ دیتے ہیں۔[1]"

نیاز نے آزاد خیالی کی رَو میں مذہب کے روایاتی تصوّر و مسلک پر گہری نظر ڈالی۔ اُن کے خیال میں عقائد و رسوم اخلاقیات کی تربیت کے لئے ہیں۔ اسی لئے اُنہوں نے اُس طبقہ پر گہری تنقید کی ہے جو پابندِ رسوم و قیود ہے مگر اخلاق سے بے بہرہ ہے۔ یا جس کے سینے میں وہ دردمند اور تڑپتا ہُوا دل نہیں جو اسلامی تعلیمات کے گہرے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اسلام کا نیا، عقلی اور بہت حد تک قابلِ قبول تصوّر پیش کیا ہے۔ وہ عقائد اور مناسک کے قائل ہیں لیکن اسلام کو ان کا محتاج نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اُنہوں نے جس بات کو صحیح جانا اُس پر کُلی اعتماد کرتے ہوئے ہمیشہ اُس پر قائم رہے لوگوں کے الزامات کی مطلق پروا نہ کی۔ اس لئے کہ اُن کا اپنا ذہن، ضمیر اور قلب مطمئن تھا۔ کسی کے اعتراضات کا جواب دیا تو بڑی خندہ پیشانی و خود اعتمادی کے ساتھ۔ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

"غضب خدا کا میں سو بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت و جبروت اور اُس کی قوت و قدرت کا اُس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ رسولؐ کی صداقت و بلندیٔ فطرت پر جس طرح ایمان لایا ہوں شاید ہی کوئی دوسرا ایمان لایا ہو۔ لیکن باوجود اس اقرار کے اگر میں کافر ہوں، مُلحد ہوں، مرتد ہوں اور اگر اس اقرار و عقیدہ کا نام کفر و الحاد ہے تو

نازم بہ کفر خویش کہ با ایمان برابر است[2]"

[1]: "نیاز کا مذہب" جشنِ طلائی نمبر ۱۹۶۲ء، ص۔ ۲۵ "نیاز نمبر" حصّہ اوّل ص۔ ۱۱۳، ۱۱۴
[2]: من و یزداں: ص۔ ۸۹ بار دوم فروری ۱۹۶۰ء ادارہ فروغ صفدر پریس لکھنؤ

نیاز کا مذہب اخلاق اور انسانیت کا مذہب ہے وہ احترامِ آدمیت کے قائل ہیں۔ عورت کے احترام کا جو انداز اُن کے یہاں ملتا ہے وہ خالصتاً مذہبی اور اسلامی ہے۔ نیاز نے اِس مظلوم اور محترم مخلوق کی حمایت میں قلم اُٹھایا اور نام نہاد اسلام پسندوں کے خلاف عمر بھر صف آرا رہے۔ عورت اُن کے ہاں جہاں مجسّم نُور، لذت، ماورائی خوشبو اور نازک رُوح ہے وہاں خالصتاً مذہبی نقطۂ نظر کے مطابق وہ عورت کو خدا درجہ قابلِ احترام مخلوق سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے قلم میں اتنی ہمت و جرأت بھی نہیں پاتے کہ عورت کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔

"کتنی بار ارادہ کیا کہ خدا کی اِس محترم ترین مخلوق پر کچھ لکھوں لیکن سوائے اِس کے کہ جب تک ایسا خیال قائم رہا۔ ایک خاص نوع کا لُطف تو ضرور اُٹھاتا رہا۔ یہ ہمت کبھی نہ ہوئی کہ کچھ لکھتا — سوائے اِس کے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ حکمراں ہے اور اُسے حکمراں ہونا چاہیئے"[1]

عورت کے سلسلے میں احترام و عقیدت کا یہی وہ زاویۂ نظر تھا جس کے سبب وہ عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف برابر لکھتے رہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے ایک واقعہ کو لے لیجیئے۔ مولانا نے ایک بیوہ، خوب صورت خاتون جو ایک بچّی کے ساتھ بھری دُنیا میں تنہا رہ گئیں، جن کی عُمر صرف اُنیس سال تھی۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے کسی اور سے رشتہ کرانے کے لئے اُنہیں بُلوایا اور پھر خود ہی نکاح کی پیش کردی حالانکہ ماجد صاحب کی بیوی موجود تھیں اور وہ دو بچیّوں کے باپ بھی تھے۔ شریف خاتون نے خاندان کی مخالفت مول لے کر نکاح کر لیا مگر شادی کے چند ماہ بعد اُس مظلوم عورت پر مولانا نے خواہ مخواہ الزام لگا کر طلاق دے دی۔ وہ دِق اور سِل کے مرض میں مبتلا ہو گئیں لیکن ساری داستان اُنہوں نے نیاز کو لکھ بھیجی۔ نیاز نے یہ داستان "نگار" میں شائع کردی[2] یوں مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے معرکہ آرا بحثوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

[1] "نگارستان" ص۔ ۲۳۰ طبع اوّل۔ نگار بک ایجنسی لکھنؤ ۱۹۲۹ء
[2] "نگار" جون ۱۹۳۲ء ص ۴۹ تا ۵۰۔ جلد ۲۰ شمارہ ۶

"مولوی" اور "عورت" دونوں نے نیاز کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ جہاں اُنہوں نے نام نہاد مولوی کی پُرزور مخالفت کی وہاں عورت کی توصیف و تعریف میں بہت عقیدت و پرستش کا اظہار کیا ہے۔

نیاز کو وقت کی قدر و قیمت کا شدید احساس تھا۔ وقت ضائع کرنے والے لوگوں کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ شعر ترنم کے ساتھ اور کبھی کبھی لہک لہک کر تحت اللفظ بھی پڑھتے تھے۔ رہن سہن میں اُصول و سلیقہ اور ترتیب کے قائل تھے۔ اُن کے کمرے میں ہر چیز قرینہ سے اپنی جگہ رہتی تھی اگر کوئی مہمان کسی چیز کو بے ترتیب کر دیتا تو وہ اپنے ہاتھ سے سابقہ ترتیب بحال کر دیتے۔

نیاز کے نزدیک دُنیا کا مقدّس ترین رشتہ دوستی کا تھا۔ دوستوں سے ٹوٹ کر ملتے تھے۔ اُن کی دوست نوازی کی بے شمار مثالیں ہیں۔ فیض احمد فاروقی اور اُن کے بیٹے مجدد نیازی کی مثال سامنے ہے۔ نیاز میں دوست نوازی کے ساتھ خود اعتمادی بھی بہت تھی، اور یہ بات وسعتِ مطالعہ سے پیدا ہوئی تھی۔ حافظہ بلا کا تھا۔ بلا تکلف حوالے پر حوالے مع کتاب کے نام اور صفحہ کے دیتے چلے جاتے تھے۔ بحث میں بے جا ضد نہ کرتے۔ نیاز کا عقیدہ تھا کہ اگر انسان کا اپنا ذہن و ضمیر مطمئن ہے تو اُسے دُنیا بھر کے مخالفانہ ردّیوں سے بھی کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔ اُن کا مقولہ تھا کہ سوچو اور کہہ ڈالو، یہ پروا نہ کرو کہ دوسرا کیا کہتا ہے۔ آزادیٔ رائے کے ساتھ ساتھ بات سے بات اخذ کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ تھم تھم کر گفتگو کرتے تھے اور سنجیدگی کے ساتھ، مگر خشک طبع نہ تھے۔ نوجوانوں کی ذہانت، مطالعہ، اچھی باتوں اور اچھی تحریروں سے بہت خوش ہوتے۔ اُن میں اعتماد پیدا کرتے، حوصلہ بڑھاتے، رہنمائی کرتے، جینے کا ڈھنگ اور ذوق سکھاتے۔ ذہانت کی چمک جہاں نظر آتی اُس سے بھرپور کام لینے کی کوشش کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ "نگار" نے نوجوانوں کی پوری نسل پیدا کی بقول مختار زمن:

"نگار ادیبوں کی نرسری تھی اور نیاز اِس کے مالی۔ اُنہوں نے بڑے چاؤ سے نئے پودے تیار کئے جو بعد میں تناور درخت بن گئے۔"[1]

آج کے بیشتر بڑے لکھنے والے اول اول "نگار" کے صفحات پر ہی نظر آئے۔ نوجوانوں کے راستے میں پڑے رکاوٹوں کے پتھر اٹھانے میں نیاز فخر محسوس کرتے تھے۔ اُن کی انگلی تھام لیتے، شفیق باپ کی طرح رہنمائی کرتے۔ حالانکہ کئی بزرگ عالم و ادیب آج بھی اپنی روایت پرستی اور کلاسیکل رویّوں میں ڈوبے، نوجوان نسل کے نئے رویّوں کو بغاوت سے تعبیر کرتے ہوئے، اُن کی راہ کا روڑا بن جاتے ہیں۔ نیاز نے اس منفی رویّے کے برعکس ہمیشہ نئے لکھنے والوں خصوصاً تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والوں کی ہمیشہ ہمت افزائی کی۔ فراق گورکھپوری، ڈاکٹر محمد حسن فاروقی، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، اور ان کے بعد کے لوگوں میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر گیان چند، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر ممتاز حسین، رشید حسن خاں، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر جمیل جالبی کی تخلیقات و مقالات چھاپ کر اُن کا حوصلہ بڑھایا۔

اُس دور میں "نگار" میں چھپنا ہی ایک بہت بڑا اعزاز تھا مگر اس کے باوجود نوجوانوں کی ذہانت اور صلاحیتوں کا اعتراف، نیاز اس طور پر بھی کرتے کہ معاوضہ پیشگی ادا کر دیا جاتا۔ اس کا تفصیلی ذکر شفیق صدیقی نے اپنی خود نوشت "یادوں کے سائے" میں کیا ہے۔

نیاز "نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو" کا پیکر تھے۔ خودگر و خودنگر، خودداری اور اپنی انا کا تحفظ انہوں نے زندگی بھر کیا۔ محکمۂ پولیس اور زمینداری سے علیحدگی اُس کی شاہد ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نیاز کی شخصیت و کردار میں جلالی و جمالی دونوں عناصر ملتے ہیں۔ عشرت رحمانی نے اُن کی شخصیت کے اس پہلو پر مختصر طور پر روشنی ڈالی ہے۔

> اُن کی خودی، جو نہایت پُرتکلف حسین و جمیل اور پُرجلال کیفیت میں، کہیں سات پردوں میں متبسم نظر آتی ہے، اور کہیں نمایاں ہو کر اس معصوم دوشیزہ کا انداز اختیار کرتی ہے جو کہیں گستاخ نگاہوں سے گریز کی خاطر بدن چراتی ہے، یا نظریں بچاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی اس کے مقابل آکر خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ پر دلیر ہو جائے تو وہ دندان شکن وار کیے بغیر نہیں رہتی۔ یہی انداز کی انانیت اور خودی کا ناز ہے۔[5]

۵۔ نیاز نامہ، نگار نیاز نمبر حصہ اول ص ۶۰

نیاز ایک مخصوص مزاج رکھنے والے آدمی ہیں۔ اُن کی پسند و ناپسند کے واضح معیار ہیں۔ دلچسپیاں اور مشاغل منفرد ہیں۔ کسی مرحلے میں ہمت ہارنا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ زندگی میں بعض کڑے حالات و واقعات پیش آئے لیکن وہ ساری مشکلات آسانی سے جھیل گئے۔

نیاز کا ذہن آگے دیکھنے میں مستقبل کو بھی پیش نظر رکھتا۔ وہ تنہا چلنے کے عادی تھے۔ دشمنوں کے ساتھ ساتھ دوستوں کے چلائے تیروں کے وار بھی ہنستے ہوئے سہے۔ دوستی و تعلقات کو عمر بھر نبھایا وجہ یہ تھی کہ نیاز پختہ ارادوں اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ طبعاً بھی وہ مشکل پسند تھے اور تربیت بھی کچھ اس انداز پر ہوئی تھی کہ ہر دشواری کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ خوش دلی کے ساتھ تیار رہتے تھے۔ خود لکھتے ہیں:

> "میری فطرت شروع سے ایسی تھی کہ جب امن اور خطرہ کی دونوں راہیں میرے سامنے ہوتی تھیں تو میں ہمیشہ خطرہ کی راہیں اختیار کرتا تھا۔"[1]

یہ صرف کہنے کی بات نہیں نیاز نے پوری زندگی عملاً اسی طرز پر گزاری۔ پروفیسر احتشام حسین کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک افسانہ "دوسرا نکاح" لکھا جو ۱۹۰۳ء میں رسالہ "انیس" الٰہ آباد میں شائع ہوا، مومن برادری کے لوگوں کو طیش آیا۔ رسالہ "انیس" کے دفتر کو آگ لگادی گئی۔ ایڈیٹر محمود فاروقی سے ناروا سلوک کیا گیا۔ یہاں تک کہ اگلے شمارہ میں انہیں معذرت نامہ پیش کرنا پڑا۔ احتشام حسین نے افسانہ کی نقل اور ساری روداد نیاز کو لکھ بھیجی۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ تم نے غلطی کی جو وہاں افسانہ چھپوایا، ایسی ساری چیزیں "نگار" کو بھیج دیا کرو۔ میں ایسے معرکے کے روز جھیلا کرتا ہوں۔[2]

ادبی زندگی سے ہٹ کر اُن کی روزمرہ زندگی بھی پُرخطر واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ۱۸۹۹ء میں رام پور میں آگ لگنے کا حادثہ کہ کپڑے تک سُلگ رہے ہیں اور محوِ خواب ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں ڈوبتی

۱۔ "نقوش" آپ بیتی نمبر حصہ دوم، ص ۱۰۰۶

۲۔ نیاز فتح پوری - چند تاثرات۔ نگار، نیاز نمبر حصہ اول ص ۱۲۰

کشتی سے چھلانگ لگا کر تند و تیز موجوں میں ساحل تک پہنچ جانا، ۱۹۰۹ء میں کدورہ میں چور بالوں میں پھنس کر نکل جانا، سواری کا گھوڑا اُس میں دھنس کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو اُن کے دشوار پسند مزاج اور نبرد آزما طبیعت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ایک اور واقعہ خود اُن کی زبان سے سنیئے

"ایک بار ریلوں کے تصادم میں بھی زخمی ہُوا۔ ڈاکوؤں نے بھی مجھے بارہا گھیر لیا اور شکار کے سلسلے میں خدا جانے کتنی بار شیروں نے رحم کھا کر مجھے زندہ چھوڑ دیا۔ ہر چند میں شیر کا شکار کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہُوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی کبھی مجھے اپنا شکار نہ بنا سکے سب سے آخری واقعہ بھوپال کا ہے جب شیر مجھ سے ایک گز کے فاصلے پر کامل ایک گھنٹے تک بیٹھا رہا اور میں گودی (گڈھے) کے اندر چھپا ہُوا کپکپاتا رہا۔"[1]

نیاز کا ایک اور روپ بھی ہمارے ادب کا دلچسپ باب ہے۔ میری مُراد "قمر زمانی بیگم" سے ہے۔ یہ داستان ایک مُدت تک پردہ خفا میں رہی۔ لیکن آخر کار وہ منظرِ عام پر آ کر رہی۔ ہر چند کہ نیاز کی زندگی میں ہی مالک رام، مجنوں گورکھپوری، اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اُن سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ خود اپنے قلم سے اس داستان کو اہلِ ادب تک پہنچا دیں لیکن وہ اِسے مرتب نہ کر سکے۔ بعد میں اس کام کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے انجام دیا اور قمر زمانی بیگم کی پوری داستان کو اُس کی جملہ جزئیات اور حقائق کے ساتھ سامنے لے آئے۔[2] اِس جگہ اِس کا مجمل تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔

اُنیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں اُردو صحافت ترقی اور عروج کے شاندار مدارج طے کر رہی تھی

---

[1] نقوش "آپ بیتی نمبر" ص ۱۰۰۶۔

[2] قمر زمانی کی داستان پہلا ایڈیشن سن ۱۹۷۰ء، لاہور اور دوسرا ۱۹۷۹ء میں اُردو اکیڈمی سندھ کی جانب سے شائع ہُوا۔

"زمانہ"، "مخزن"، "ادیب"، "تمدن"، "دلگداز"، "الناظر" اور "العصر" ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں لگے تھے۔ "نقاد" اِسی زمانے میں شاہ نظام الدین دلگیر کی زیرِ نگرانی ۱۹۱۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اور دیکھتے دیکھتے مثالی پرچہ بن گیا۔ شبلی نعمانی، مہدی افادی، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد، اکبر الٰہ آبادی، ریاض خیر آبادی، مولانا حامد حسن قادری، اِس کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہو گئے۔ دو سال تک "نقاد" ماہوار پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ مالی حالات خراب ہونے کی وجہ سے اِس کی ماہانہ اشاعت میں خلل پڑنے لگا۔ ۱۹۱۵ء میں صرف دو شمارے شائع ہوئے بعد ازاں بند ہو گیا۔ "نقاد" کو دوبارہ جاری کرانے کے لئے بے شمار قارئین نے خطوط لکھے۔ خاص معاونین ضیا عباس ہاشمی، خلیقی دہلوی اور نیاز فتح پوری نے شاہ دلگیر کو بہت اُکسایا مگر وہ رضامند نہ ہوئے۔ سنجیدگی سے غور و فکر کے بعد ایک نیا منصوبہ بنایا گیا۔ مقصود صرف یہ تھا کہ دلگیر کو کسی طرح "نقاد" کے دوبارہ اجراء پر رضامند کیا جائے چنانچہ نیاز فتح پوری نے "قمر زمانی" کا رُوپ دھارا۔ بائیں ہاتھ سے خطوط لکھے جانے لگے۔[1] شاعرانہ طبیعت رکھنے والے شاہ دلگیر تڑپ اُٹھے۔ قمر زمانی کی محبت اور دلگداز لفظوں نے آتشِ عشق یوں بھڑکائی کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ ضیا عباس ہاشمی کے عزیز، محمد احمد، جو دُبلے پتلے تھے، نقاب کے ساتھ، قمر زمانی کے روپ میں شاہ دلگیر سے ملائے گئے۔ دلگیر، آخر کار "نقاد" کے دوبارہ اجراء پر تیار ہو گئے۔ قمر زمانی "نقاد" کی جوائنٹ ایڈیٹر بن گئیں اور "نقاد" ۱۹۱۷ء میں دوبارہ جاری ہو گیا۔ قمر زمانی بیگم کی خوبصورت تحریریں "نقاد" کے صفحوں کی زینت بنتیں۔ شاہ دلگیر کی مایوسیاں کم ہو گئیں۔ سرد جذبات میں قمر زمانی کی مُحبت نے ہلچل مچا دی۔ اور ایک بار پھر اُن کی جیتی جاگتی تحریریں اور اُن کا رسالہ اہلِ علم و ادب کی تسکین کا باعث بن گیا۔ یہ سلسلہ تقریباً دو سال جاری رہا مگر دلگیر کو قمر زمانی کے عورت ہونے پر شُبہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد اصل واقعہ کا علم ہُوا تو اور بھی شرمندہ ہوئے۔ "نقاد" کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ قمر زمانی کے نام سے لکھے ہوئے، نیاز کے یہ خطوط بہت دلچسپ

---

[1] یہ خطوط قومی عجائب گھر کراچی میں محفوظ ہیں۔

ہیں اور اُن کے اچھے انشاپرداز ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس داستان کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"یہ ادبی تاریخ کا ایک دلکش باب ہے۔ معمولی اشخاص کی زندگی کی تفصیل نہیں علم وادب کی غیر معمولی شخصیتوں کا مرقع ہے۔ سُنی سُنائی باتوں کا مصنوعی مجموعہ نہیں خطوط کی صورت میں ایک خاص عہد کی ادبی دستاویز ہے۔ سرسری، بے کیف اور بے معنی تحریروں کی پوٹ نہیں بلکہ معنی خیز انشاپردازی اور دل کو موہ لینے والی ادبیت کا نشاط خیز سرمایہ ہے۔ محض دو دلوں کا بربط نہیں ایک پورے عہد کے نغمات رُوح کا ساز ہے۔"[1]

دوسروں کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے اور عزم بڑھانے کا یہ انداز شاید ہی کہیں نظر آئے۔ نیاز واقعی بہت بڑے اور بہت اچھے انسان تھے۔ دُکھوں کی صلیب پہ اُبھرنے والے لوگ حقیقتاً پیغمبری ہوا کرتے ہیں جو اپنا عہد اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں بقول رئیس امروہوی:۔

"جس طرح ہر پیغمبر اپنی اُمت کے ساتھ مبعوث ہوا کرتا ہے، اُسی طرح حضرت نیاز فتح پوری اپنا عہد اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوئے تھے۔"[2]

مختصر یہ کہ نیاز کی زندگی اور شخصیت ایک عہد ساز اور عہد آفریں بڑے ادیب کی شخصیت تھی جو جرأت، لیا وسعت مطالعہ اور تامل و تفکر، تینوں عناصر بڑی خوب صورتی سے ان کی شخصیت میں جمع ہو گئے تھے۔ معلومات کے اعتبار سے وہ اپنی ذات سے ایک ادارہ، ایک تحریک، ایک دبستان، چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا تھے۔ نیاز کی انہی علمی، ادبی اور لسانی خدمات کے صلہ میں اپریل ۱۹۶۲ء میں حکومت ہند کی طرف سے "پدما بھوشن" کا خطاب ملا۔ یہ یقیناً ایک بہت بڑا اعزاز تھا لیکن نیاز کی بے پایاں

---

[1] "قمر زمانی بیگم کی ادبی زندگی کا آغاز و پس منظر" ص ۱۲۰، بار دوم ۱۹۹۱ء اردو اکیڈمی سندھ۔

[2] نگار، جون ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۰

لافانی خدمات کا ادنیٰ اعتراف۔

ہندوستان میں قیام کے باوجود، نیاز کو پاکستان اور اُس کے مسائل سے گہری دلچسپی تھی۔ اُن کی خواہش، ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ رہی کہ پاکستان ہمیشہ قائم رہے۔ اور اس میں بسنے والے اپنے اسلاف کی اس طرح تقلید کریں کہ سارے زمانے پر چھا جائیں۔ اپنی اس آرزومندی کے اظہار کے لئے انہوں نے ۱۹۶۰ء میں لکھنؤ سے "نگار" کا ضخیم "پاکستان نمبر" نکالا۔ اس نمبر کا انتساب مسلمانان پاکستان کے نام ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان میں رہ کر، پاکستان کی موافقت میں کچھ لکھنا پڑھنا تو درکنار، پاکستان کا نام لینے کی بھی ہمت نہ تھی لیکن نیاز نے پاکستان نمبر شائع کر کے جرأت اظہار کا عجیب و غریب ثبوت پیش کیا اور اس نمبر میں انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی فراخ دلی، علم دوستی، وسیع نظری، تہذیب و ثقافتی دلچسپیوں اور ادب پروری کے اُن واقعات کا تحقیقی و تاریخی جائزہ تفصیل سے پیش کیا، جن پر متعصب مؤرخین نے تک پردہ ڈالے ہوئے تھے۔

نیاز فتح پوری پہلی بار مارچ ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اصرار پر ایک بین الاقوامی مشاعرے کی صدارت کے لئے پاکستان آئے۔ اس مشاعرے میں ہندوستان سے فراق گورکھپوری، اثر لکھنوی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی جیسے عظیم شعراء نے بھی شرکت کی تھی۔ نیاز نے سرزمین سندھ کا ایک تاریخی رُومان کے عنوان سے ایک اہم صدارتی خطبہ دیا تھا۔ دوسری مرتبہ احباب و اعزہ سے ملنے اور سیاحت کی خاطر نومبر ۱۹۵۹ء میں کراچی آئے۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں عزیزوں سے ملنے کے لئے ایک بار پھر کراچی آئے اور واپس چلے گئے۔ مستقلاً پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن آخری عمر میں ایک ایسا بھی واقعہ رونما ہوا کہ اُن کے لئے ایک سانحہ عظیم بن گیا۔ نہیں چاہا، ناچار پاکستان آنا پڑا۔ نیاز نے اپنی سوانح حیات میں اس واقعہ کا مختصر ذکر بڑے دل دوز انداز میں اس طرح پر کیا ہے:

"خبر نہ تھی کہ زمانے کے ترکش میں ایک آخری تیر اور بھی ہے۔ ایسا زہر آلود تیر کہ اس سے جانبر ہونا میرے لئے دشوار ہو جائے گا۔ اس کی توضیح ضروری نہیں۔ میری زندگی کا دردناک تجربہ ۱۹۶۱ء سے شروع ہوا اور اُس نے رفتہ

رفتہ رفتہ میرے نظامِ عصبی، دل و دماغ کو اِس درجہ متاثر کیا کہ اشتہا مفقود ہو گئی
اور غذا ترک۔ یہاں تک کہ مَیں صاحبِ فراش ہو گیا۔ اور زندگی سے بالکل
مایوس۔ پھر اگر مَیں تنہا ہوتا تو مجھے اپنی جان اتنی عزیز نہیں کہ اِس ماحول
مَیں جان دینے سے گریز کرتا۔ لیکن چونکہ میری رفیقۂ حیات اور اپنے دو چھوٹے
بچّوں کا مستقبل میرے سامنے تھا اور مجھے یقین تھا کہ میرے بعد اِن کو سخت
تکلیف کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اِس لئے میرے لئے اِس کے سوا کوئی چارہ
نہ تھا کہ اُن کو لے کر پاکستان آجاؤں۔" ۱؎

اِس حادثہ کے زیرِ اثر نیازؔ ۱۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو دیرینہ دوست مجیبؔ انصاری مرحوم کی کوشش سے
مستقلاً پاکستان آ گئے۔ نیازؔ نے اپنی ہجرت کے اسباب کی وضاحت کو ضروری خیال نہ کیا۔ اِس لئے
اُن کے مخالفین ایک بار پھر صف آرا ہو گئے۔ طرح طرح کے الزام تراشے گئے۔ نیازؔ نے ہمیشہ کی
طرح الزامات کا جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کی اور دوسروں کو بھی اِس کے تفصیلی اظہار سے
منع کر دیا۔ ہر چند کہ اصل حقیقت اِن کے کچھ عزیزوں اور نیاز مندوں کو معلوم تھی۔ لیکن اِس خیال سے
کہ مرحوم کی رُوح کو اِس سے تکلیف پہنچے گی وہ اِس کی تفصیل بتانے سے گریز کرتے رہے۔ ڈاکٹر
نورالحسن ہاشمی اور نادمؔ سیتاپوری اپنے مضامین میں اِس طرف اشارہ کر چکے تھے لیکن اِس اشارے
سے اصل واقعہ کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ نیازؔ نے ڈاکٹر فرمانؔ فتح پوری کو اتنا حق ضرور دیا تھا کہ اُن
کی وفات کے بعد وہ حقائق کو منظرِ عام پر لا سکتے ہیں۔ چنانچہ ۲۷ مئی ۱۹۷۹ء کو، نیازؔ کی تیرھویں برسی،
منعقدہ آرٹس کونسل کراچی میں اُنہوں نے "نیازؔ فتح پوری مستقلاً پاکستان کیوں آئے" کے عنوان سے
ایک مضمون پڑھ کر سارے حقائق سے پردہ اُٹھا دیا۔ اُس مضمون سے پتا چلا کہ نیازؔ کی ہجرت کا سبب
خود اُن کے داماد مجدّد نیازی تھے، جن کی پرورش اور تعلیم و تربیت خود نیازؔ کے ہاتھوں ہوئی تھی:

۱؎ نگار پاکستان" مارچ، اپریل ۱۹۶۲ء ص ۔ ۴۱

۱۹۴۱ء میں اکلوتی بیٹی شوکت کی شادی مجدّد نیازی سے کر دی اور ساری منقولہ و غیر منقولہ جائیداد بھی
بیٹی کے نام کر دی۔ ۱۹۵۳ء میں اچانک شوکت کا انتقال ہو گیا۔ شوکت کی وفات کے بعد اُن کے دو بیٹوں
اور ایک بیٹی کی نگہداشت و پرورش بھی نیازؔ کو کرنا پڑی کیونکہ مجدّد نیازی لاپرواہ اُبالی طبیعت کے
مالک تھے۔ گھر کی حقیقی فضا پیدا کرنے کے لئے نیازؔ نے خود اپنے ہاتھوں ۱۹۶۰ء میں مجدّد کی دوسری
شادی کر دی۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد خانگی مسائل میں اختلافِ رائے شروع ہُوا۔ مجدّد اور بیگم مجدّد نیازی
کا رویّہ دن بدن سخت تکلیف دہ ہوتا چلا گیا۔ نیازؔ نے بہت صبر و ضبط سے کام لیا۔ بالآخر وہ مرحلہ
پہنچا جب مجدّد اور بیگم مجدّد نے گھر سے نکل جانے کو کہا حالانکہ وہ گھر خود نیازؔ کا تھا۔ وہ چاہتے تو
قانون کا سہارا لے سکتے تھے۔ لیکن نیازؔ کی حساس طبیعت کو گوارا نہ تھا کہ اپنی بیٹی شوکت کے شوہر اور
عزیز دوست کے بیٹے کے خلاف کچھ کریں۔ بیٹی کی رُوح کو تکلیف دینا اُنہیں کسی طرح گوارا نہ ہُوا چنانچہ
بڑے مایوس، بے بس، نیم جاں، اُداس و پریشان پاکستان چلے آئے۔

نیازؔ پاکستان آ گئے تو اُن کی علمی و ادبی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مجیبؔ انصاری
اور ممتاز حسن نے خاص طور پر معاونت کی۔ ممتاز حسن نے اُنہیں قومی عجائب گھر کے کتب خانے سے
مُنسلک کر دیا۔ نیازؔ کی زندگی کی رونق لوٹنے لگی۔ دو سال کے اندر ہی اُنہوں نے عربی، فارسی کے
سینکڑوں مخطوطات کا مطالعہ کر کے مفید اشارات اور حواشی مرتب کر دیئے۔ ترقی اُردو بورڈ کی
زیرِ تربیت لُغت پر نظرِ ثانی کا کام بھی اُن کے سُپرد ہو گیا۔ "نگار" کے ملاحظات" باب الاستفسار"
اور "باب الانتقاد" کو بھی وہی لکھتے تھے۔ خطوط کی پابندی کے ساتھ جواب دینے کے سلسلہ
"روزنامہ جنگ" کا ہفتہ وار کالم "رنگا رنگ" بھی لکھتے تھے۔ کام ذوق کے مطابق مل گیا تو مایوسی
کے اندھیرے چھٹنے لگے۔ خود لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں، مَیں نے جیسی کامیاب زندگی بسر کی اور وہاں کی حکومت نے
میری جتنی قدر افزائی کی اُس کا اقتضا یہی تھا کہ مَیں وہیں جان دیتا لیکن
افسوس ہے کہ ناگزیر حالات نے مجھے ہجرت پر مجبور کر دیا، اور حیرت ہے کہ

"نگار" اور خرد سال بیٹیوں کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے آب دیدہ ہو جاتے کہ اُن کے بعد سنبھالنے والوں کا کیا ہو گا؟

آخر کار وہ دن آپہنچا جب چرخ کج رفتار کو اپنا اٹل اور ظالم فیصلہ سُنانا تھا، اور جس کی تعمیل سے آج تک اس وسیع و عریض دُنیا میں آنے والی کوئی رُوح مُنکر نہیں ہو سکی۔ ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء بروز منگل صبح چار بجے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو کر عالمِ جاودانی کا رُخ کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون

اور اپنی اس پیش گوئی کو بھی سچ ثابت کر دکھایا:-

"ابا کہتے تھے کہ میری موت گرمیوں میں ہو گی اور وہ بھی مئی اور جون کے مہینے میں، کسی اور موسم میں نہیں مروں گا۔"[1]

پاپوش نگر ناظم آباد کے قبرستان میں دفن ہیں۔ اُن کی خواہش کے مطابق غالب کا یہ شعر

زمن بہ جُرم تپیدن کنارہ می کردی

بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

اُن کے لوحِ مزار پر کندہ ہے۔

نیاز کی ادبی زندگی کا آغاز ایک شاعر کی حیثیت سے ہی ہُوا۔ یہ شاعرانہ ذوق انہیں والد سے ورثہ میں ملا تھا، حسرت کی صحبت بھی میسر تھی۔ فتح پور کے مدرسۂ اسلامیہ میں جب ابھی تدریس کے مراحل ہی طے کر رہے تھے تو شعر و شاعری کا آغاز کر دیا۔ فتح پور میں مشاعروں کی ایک خاص روایت موجود تھی۔ شعری محفلیں بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوتیں۔ بڑے بڑے شعراء اس میں شرکت کرتے۔ نیاز نے بھی انہی مشاعروں سے اپنی علمی و ادبی زندگی کا آغاز کیا جیسا کہ خود لکھتے ہیں:-

"شعر و سخن کا ذوق بارہ، تیرہ سال کی عُمر ہی میں مجھ میں پیدا ہو گیا تھا۔ اور میں فتح پور کے مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں بھی سنایا کرتا تھا۔ ہر چند ان

---

[1] "میرے ابا جان" سرفراز نیازی۔ نگار جون ۱۹۶۶ء ص ۳۰

غزلوں میں محبوب کا ذکر محض روایاتی حیثیت رکھتا تھا اور جنسی جذبے سے آشنا نہ تھا۔"[1]

ابتدا میں حسرت سے متاثر تھے چنانچہ انہی کے انداز میں شعر کہے۔ مگر اپنا اُسلوب تخلیق کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ یہ دَور اُن کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہُوا اُس کا ذکر انہی کی زبان سے سُنیے:-

"اوّل اوّل جب غزل کہتا تھا تو اُس میں لایعنی تکلّفات کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا لیکن اب رنگِ تغزّل کچھ اور تھا۔ چنانچہ جب مَیں اس دیارِ حسن و عشق سے جُدا ہونے لگا تو میں نے اپنے اس عہدِ رُومان کی یاد میں ایک غزل لکھی تھی، جس کا ایک شعر دورِ خوشکامی سے متعلق تھا اور دوسرا دورِ ناکامی، جسے ہم زہرِ عشق والی فضا کہہ سکتے ہیں:-

آپ تھے، مَیں تھا، شبِ ماہ تھی، تنہائی تھی

ہائے وہ وقت کہ دُشوار تھا جینا مجھ کو

اُف ری مجبوریٔ اُلفت، یہ خبر کس کو تھی

تم کو چاہوں گا تو جینا بھی پڑے گا مجھ کو،"[2]

مگر دورِ خوشکامی، اور دورِ ناکامی کی، زہرِ عشق والی یہ فضا بہت جلد ختم ہو گئی۔

برِ عظیم اُس وقت ایک پُر آشوب دَور سے گزر رہا تھا۔ لوگوں میں کئی طرح کی ذہنی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے "الہلال"، مولانا ظفر علی خاں کے "زمیندار" اور سر عبد القادر کے "مخزن" نے نوجوانوں کی ذہنی تبدیلی میں خاص کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب ادب و شعر میں

---

[1] "والد مرحوم، مَیں اور نگار" نیاز نمبر حصّہ اوّل ص ۳۵

[2] "والد مرحوم، مَیں اور نگار" نیاز نمبر حصّہ اوّل ص ۳۶

Scanned by CamScanner

فلسفۂ جد و جہد، حرکت و عمل، جوش و خروش اور تماش و تغیّر کی باتیں ہوتی تھیں۔ چونکہ فکر و خیال کی اس روش کا اظہار نظم ہی میں ہو سکتا تھا اس لیے نیاز نظم ہی کی طرف اوّل اوّل متوجہ ہوئے۔ عشق و عاشقی اور ہنگامۂ حسن و شباب کے موضوعات کو ترک کر کے سماجی و سیاسی زندگی کے مسائل کو موضوعِ سخن بنایا۔

نیاز کی تخلیقات سب سے پہلے "انتخاب لاجواب" میں شائع ہوئیں۔ اس اخبار کے مالک مشہور "پیسہ" اخبار لاہور کے منشی محبوب عالم تھے۔ نیاز کی اوّلین نظم "تیر و نغمہ" کے عنوان سے ۱۹۰۵ء "انتخاب لاجواب" میں شائع ہوئی۔ یہ ایک انگریزی نظم 'Arrow and Sound' کا ترجمہ تھا۔ اس زمانے کی یادوں کو مجتمع کرتے ہوئے نیاز لکھتے ہیں:

> "یہ پورے پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ اس زندگی کی نہیں جو ختم ہو چکی ہے اور جسے اب پلٹ کر نہیں آنا ہے بلکہ اس زندگی کی جو نصف صدی قبل لاہور میں شروع ہوئی تھی۔ اور اب تک بلائے جان بنی ہوئی ہے یعنی سلسلۂ نوشت و خواند کا آغاز لاہور میں ہوا۔ وہ اس طرح کہ سب سے پہلے منشی محبوب عالم کے "انتخاب لاجواب" میں میرے مزخرفات کی اشاعت ہوئی۔ اور مدت تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ میرا قیام اس وقت ریاست باؤنی میں تھا۔"[1]

۱۹۰۵ء میں نیاز کا قیام ریاست باؤنی ہی میں تھا اور نواب ریاض الحسن خاں کے زمانہ میں ہیڈ ماسٹر، کوتوال شہر اور پرائیویٹ سیکرٹری کے عہدوں پر فائز رہے۔ یہی زمانہ ہے جس میں نیاز میرزا مرحوم کی نثر سے متاثر ہوئے۔ "صلائے عام" میں ان کی نظمیں اور انشائی نثر پارے شائع ہونے لگے۔ نیاز کی نظمیں اور غزلیں اس دور کے اہم اور معیاری پرچوں "الہلال"، "نقاد"

[1] "ادھوری داستان" ص ۱۳۲، "نقوش" لاہور نمبر فروری ۱۹۶۲ء

"تمدّن" اور "صوفی" میں بھی بڑے اہتمام سے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئیں۔ شاعر کی حیثیت سے وہ خاصے ممتاز و معروف ہو گئے۔

نیاز کی ابتدائی شاعری میں اقبال کا فلسفیانہ و خطیبانہ انداز بھی ہے اور شبلی کا تاریخی شعور بھی۔ حالی کی غمخواری بھی ہے اور ظفر علی خاں کی شعلہ نوائی بھی۔ لب و لہجہ میں رجائیت ان سب پر مستزاد ہے۔ گویا مجموعی طور پر شاعری میں وہ اپنے ہم عصر اقبال سے متاثر تھے اور انہیں کے رنگ میں رنگ جانا چاہتے تھے خود لکھتے ہیں:

> "اسی زمانہ میں اقبال کا شکوہ شائع ہوا جس نے یک لخت مجھے نظم نگاری کی طرف مائل کر دیا۔ اور میری پہلی نظم اسی منہج و اسلوب کی "شہر آشوب اسلام" کے عنوان سے الہلال میں شائع ہوئی۔"[1]

"شہر آشوب" نے نیاز کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ صاحبانِ ذوق کی نظریں نیاز کی طرف اٹھ گئیں کہ یہ اقبال کے لب و لہجہ میں سوز و گداز و قومی غمخواری کی ایک نئی آواز ابھر رہی تھی۔ نیاز نے اقبال کی پیروی کس انداز سے کی ہے اور اس میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان کی اور اقبال کی نظموں کے چند بند ایک دوسرے کے متوازی بیان کیے جاتے ہیں:

اقبال:

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم : قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم : نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے[2]

[1] "الہلال" ۱۹۱۲ء
[2] "بانگ درا" ص ۱۹۳۔ بار ہم شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

نیازؔ:

لے زبان تجھ سے تکلّم کے طلب گار ہیں ہم : زخمِ جان تجھ سے تبسّم کے طلب گار ہیں ہم
سازِ دل تجھ سے ترنّم کے طلب گار ہیں ہم : اے نمی آنکھوں کے تلزم کے طلب گار ہیں ہم

لُطف کر ذوقِ تپش، مستی سیماب اپنی
دیدے چنگاریاں اے نالۂ بیتاب اپنی [1]

یہ نظم "شکوہ" سے معنوی مماثلت رکھتی ہے۔

اقبالؔ:

واعظِ قوم کی وہ پُختہ خیالی نہ رہی : برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی : فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

نیازؔ:

سینۂ کوہ جسے سُن کے دہل جاتا تھا : لے کے وہ بارِ امانت تو سنبھل جاتا تھا
لن ترانی کی صدا سُن کے مچل جاتا تھا : ایک جلوے کے لئے آگ میں جل جاتا تھا

جستجو کی وہ مگر تیری ادائیں نہ رہیں
ذوق آلودہ پُر درد صدائیں نہ رہیں یا

نیازؔ کی ایک اور سبق آموز نظم "صدا بہ صحرا" ملّی و قومی ہمدردی سے پُر ہے۔ یہ ۱۹۱۱ء میں "زمیندار" میں شائع ہوئی۔ اس میں "جوابِ شکوہ" کا رنگ ہے۔ نیازؔ قوم کی زبوں حالی اور پستی پہ خون کے آنسو روتے نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے مسلمانوں کو اُن کا شاندار ماضی یاد دلا کر عمل کی ترغیب دی ہے

---

[1] ۔ "الہلال" ۱۹۱۲ء

صرف ایک بند دیکھئے :۔

پھر اگر ہم پست ہیں تو ہے ہمارا ہی قصور : ہے خطا اپنی اگر اقبال ہے ہم سے نفور
اپنی لغزش تھی اگر ہے ظرفِ ہستی چُور چُور : زہر اگر کھائیں گے ہم تو ہم کو مرجانا ہے ضرور

خود تو ہوں برباد اور شکوہ کریں اللہ سے
ہو خدا بیزار ایسے رمز نا آگاہ سے

پھر جیسا اقبالؔ کا انداز ہے۔ نیازؔ بھی قصۂ درد کہنے کے بعد سوئی ہوئی قوم کو بیداری کا پیغام دیتے ہوئے متحرک رجائیت کی طرف لے جاتے ہیں۔ اُردو کے ساتھ فارسی کے پیوند بھی لگاتے ہیں اور وہی بلند آہنگ لہجہ اپنانے کی کوشش کرتے ہیں جو اقبالؔ کا لحنِ خاص ہے۔ ایک بند دیکھئے:

سونے والو اب خیالِ قربِ منزل چھوڑ دو : یا کرو اک عزمِ محکم خوابِ غافل چھوڑ دو
ہو چکے پامال اب تحصیلِ حاصل چھوڑ دو : ڈال دو سیلاب میں اپنے کو ساحل چھوڑ دو

تو سمندر شو رہا لا آتشے در جاں فتاد
باش مرغابی کہ اکنوں کار با طوفاں فتاد

لیلۃ القدر" (نقاد ستمبر ۱۹۱۴ء) "صوفی" (نومبر و دسمبر ۱۹۱۱ء)، "تجاہلِ ابلال" ۱۹۱۲ء نقاد۔ ۱۹۱۳ء "سوزِ پروانہ" (تمدن ۱۹۱۱ء) "شمعِ حرم"۔ (نقاد ۱۹۱۴ء) وغیرہ بھی اسی طرح کی قومی اور ملّی نظمیں ہیں سیاسی ہلچل، معاشی افراتفری، اور اخلاقی پستی کا شکار غافل مسلمانوں کو بیداری و عمل کا پیغام ہر نظم سے نمایاں ہے آہنگ بلند ہے اور لہجہ جذباتی ہے۔ لفظ لفظ خلوص میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اور اُس حد تک کہ وہ اپنے انداز و اُسلوب کے حوالے سے پہچانے جانے لگے ہیں۔ اُن کی نظمیں "غم" (زمیندار ۱۹۱۰ء "تمدن" ۱۹۱۲ء) اور "جگنو" (نقاد ۱۹۱۵ء) اقبالؔ کی مشہور نظموں "نوائے غم" اور "جگنو" موضوعاتی اعتبار سے قریب ضرور ہیں مگر انداز و لہجہ بالکل مختلف ہو گیا ہے۔

عصری رُجحانات اور قومی میلانات اور ہمدردی کے ساتھ نیازؔ کے ہاں اُن کا مخصوص رُومانی و جمالیاتی رنگ ہر جگہ موجود ہے۔ شدّتِ جذبات نے اُن کی شاعری کو دلکشی و دل آویزی بخشی ہے

اس سلسلے اُن کی نظمیں "شبنم" (تمدن ۱۹۱۲ء) "کوئل سے" (نقاد ۱۹۱۴ء) اور "جگنو" (نقاد ۱۹۱۵ء) خاص طور پر اہم ہیں۔ یہ نظمیں دلکش تشبیہات سے مزیّن ہیں۔ مترنم اور حسین الفاظ نے موضوع کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے کتنے خوب صورت ہیں:۔

کرمکِ شب تاب یا سُنبل نے کھینچے جال میں : یا کسی مشرق نے موتی پرو دئے بال میں
گر پڑا ہے موتیوں کا کوئی مالا ٹوٹ کر : دستِ ساقی سے گرا یا کوئی ساغر چھوٹ کر
تجھ میں پنہاں رازِ سازِ عشرتِ دیرینہ ہے : برگِ گل آئینہ اور تو جوہرِ آئینہ ہے

(نظم "شبنم")

نغمۂ فردوس کی تو کوئی مرکی تو نہیں : دامنِ لیلائے شب کی کوئی جھلکی تو نہیں
باغ میں تو لینے آیا ہے زرِ گل کا سراغ : چوریاں کرتا ہے ظالم ہاتھ میں لے کر چراغ

(جگنو)

نیاز کی نظم "کوئل سے" ورڈزورتھ کی "TO THE CUCKOO" کی یاد دلاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ورڈزورتھ کی نظم کا خوب صورت ترجمہ ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ نیاز نے یقیناً ورڈزورتھ کی نظم سے تاثر قبول کیا ہے۔ لیکن اس تاثر کو دستِ ذاتی تخلیقی رنگ دے کر انہوں نے اِسے ترجمہ و تقلید کی تہمت سے آزاد کر لیا ہے:۔

کیا ہُوا ہم تجھ سے اگر شیون کی مستی چھین لیں : کیا ہے تجھ میں جو تیرا سازِ ہستی چھین لیں
تیرے نغموں کا ذرا دیکھوں تو کیسا ساز ہے : تو کہیں ہے بھی کہ بس آواز ہی آواز ہے
جوگ کس کا تو نے سادھا ہے تو جوگن کس کی ہے : ہر گھڑی کی رونے والی تو برہ دکھن کس کی ہے
کس کے غم میں آہ تو یوں جان پر پھرتی ہے تنگ : اُف یہ سوز ہجر کی اور یہ جوانی سیام رنگ

"نامِ حبیب" (تمدن ستمبر ۱۹۱۱ء) "عرضِ ستم" (تمدن مئی ۱۹۱۲ء) "سر مستیِ آلام" (تمدن مارچ ۱۹۱۲ء) "تاج" (نقاد دسمبر ۱۹۱۳ء) "ساحلِ جمن پر ایک صبح" (نقاد دسمبر ۱۹۱۴ء) "انتساب" (نگار فروری ۱۹۲۲ء) نیاز کی اہم نظمیں ہیں جن میں اُن کی ذات، آشوبِ غم سے راکھ ہوئی جا رہی ہے۔ پلکوں پر جمے آنسوؤں

کی دُھند میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ جذبے اپنی انتہا پہ ہیں۔ دِل ہے کہ سوزِ غم نہاں سے جل رہا ہے۔ لیکن لطیف جذبات و احساسات کا تسکین بخش مرہم موجود ہے۔

نیاز گرچہ نظم گو پہلے اور غزل گو بعد میں ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیاز نے اسی زمانے میں خوب صورت غزلیں بھی کہی ہیں، بے ساختگی، شگفتگی، اور کامیابی کے ساتھ وارداتِ قلبیہ کو بیان کیا ہے۔ امیر و داغ کا ملا جُلا رنگ اور وہ بھی لکھنوی چھاپ کے ساتھ صاف نظر آتا ہے:۔

عیاں ہے سب پہ کہ دل کو ذرا قرار نہیں
کہوں یہ کیسے مجھے اُن کا انتظار نہیں
عزیزوں ڈال دو اب میرے مُنہ پر تم چادر
اور اُن سے کہہ دو کہ اب مجھ کو انتظار نہیں

نیاز کی غزل پر دل کی اُجڑی بستی یعنی داخلی کیفیتوں کا غلبہ ہے۔ عام لکھنوی شعراء کے برعکس خلا میں تکنے اور رونے کے بجائے صرف اپنی دُنیا کی باتیں کرتے ہیں۔ البتہ غمِ جاناں کے بیان میں اِن کا انداز بھی بعض جگہ روایتی ہو جاتا ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ نیاز کی طبیعت کو غزل سے وہ مناسبت نہ تھی جو نظم سے تھی پھر بھی پاکیزگیٔ خیالات و جذبات اور سادگیٔ بیان دِل مُوہ لینے والا ہے۔

چاہتے ہیں وہ کہ اظہارِ محبت چھوڑ دوں
یعنی اُلفت چھوڑ دوں اس کی حکایت چھوڑ دوں
جان دے دوں کیوں نہ گر کر اُس کے قدموں پہ نیاز
شکرِ احساں چھوڑ دوں اظہارِ منت چھوڑ دوں
آرام دن کا، رات کا سونا، سکونِ دِل
ہاں تم سے چھوٹ کے کون سی راحت نہیں مجھے

گھڑی گھڑی نہ اِدھر دیکھیے دل پہ مجھے
ہے اختیار پر اتنا بھی اختیار نہیں

سیفی پریمی نے صحیح لکھا ہے کہ نیاز کی غزلوں میں :-

" دیدار کی تڑپ، انتظار کی کسک، اور غم کی ٹیس میں بھی ایک ضبط، توازن کی شان پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں تصوّف اور ترکِ محبت کا کوئی مقام نہیں۔ احساسِ غم کو نشاط میں بدلنے کی ہمت، عشق کا جذبۂ خلوص، دردمندی احساس کی طہارت، یہ سب عناصر مل کر اُن کی غزلوں کو بلند سطح پر پہنچاتے ہیں [1]،،

نیاز کو نت نئے تجربوں سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ ایک ہی بات کو مختلف انداز میں کہنے سے بہت لطف محسوس کرتے تھے۔ اس کی مثال اُن کی وہ طویل غزل ہے جو مختلف آہنگ یعنی متقدمین، متوسطین اور جدید رُجحان کے تحت کہی گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

جب قفس میں مجھ کو یادِ آشیاں آجائے ہے
سامنے آنکھوں کے اِک بجلی سی لہرا جائے ہے
ہائے جو گھر رات بھر جلتا رہا ہو، صبحدم
اُس کی ویرانی کا منظر کس سے دیکھا جائے ہے
(متقدمین کا رنگ)

محو ہو جاتے ہیں سارے شکوہ ہائے دردِ دل
سامنے جس دم وہ جانِ آرزو آجائے ہے
اب یہ حالِ دل ہے جیسے رکھ کے کانٹوں پر نیاز
ریشمی چادر کو بیدردی سے کھینچا جائے ہے
(متوسطین)

---

[1] : [illegible] نگار، نیاز نمبر حصہ دوم، ص ۱۲۰۰

قافلہ چھوٹے زمانہ ہو گیا لیکن ہنوز
یادِ آوازِ جرس رہ رہ کے تڑپا جائے ہے
ہم کہاں ڈوبے تھے یہ کل پوچھیے گا آج تو
کچھ تلاطم سا ابھی موجوں میں پایا جائے ہے

محبوب کا جسمانی تصوّر اور محرکات و معاملات کا خاص انداز جو لکھنوی دبستان کا امتیازی رنگ تھا اور ایک زمانہ میں بہت مقبول بھی رہا، نیاز کے ہاں بھی کہیں کہیں موجود ہے لیکن متوازن شوخی اور وقار کے ساتھ :-

ہم سُنانے کو سُنا دیں داستانِ غم مگر
کس سے اِن بھیگی ہوئی پلکوں کو دیکھا جائے ہے
اُف رے وہ ٹھنڈا سا اور ہلکا سا نم جو بعد غسل
سوکھ جانے پر ترے بالوں میں پایا جائے ہے

جیسا کہ عرض کیا گیا نیاز شعر و ادب کے سانچے میں ڈھلی خوب صورت شخصیت کے مالک تھے وہ جمالیات اور تاثرات کے شاعر ہیں۔ نظموں اور غزلوں میں جذبات کی شدت و رنگینی و لطافتِ حسن و عشق میں دل کشی، تشبیہات و استعارات میں جدت و ندرت جگہ جگہ ملتی ہے۔ نیاز صحیح معنوں میں صناع ہیں اور خیالات کو الفاظ کا پیکر دینے میں اُن کی یہ صناعی قابلِ داد ہے۔ چند اشعار دیکھیے :-

عیاں ہے سب پہ کہ دل کو ذرا قرار نہیں
کہوں یہ کیسے مجھے اُن کا انتظار نہیں
گھڑی گھڑی نہ مجھے دیکھیے کہ دل پہ مجھے
ہے اختیار پر اتنا بھی اختیار نہیں
ایسے کہاں نصیب کہ ہوں ہمکنارِ دوست
قائم رہے کہیں خلشِ انتظارِ دوست

کچھ کچھ ہمارے دِل کو سکوں ہو چلا تھا پھر
یہ تو نے کیا گیا نگۂ انتظارِ دوست

نیاز کے الفاظ قلب کو گُدگُداتے ہیں اور ایسی شورش پیدا کرتے ہیں جس میں شام کے دُھندلکے کی سی تسکین بھی ہے اور اضطراب بھی خاص تہذیبی رچاؤ اور مٹھاس موجود ہے۔ ان کی شاعری مدستی، جنس یار کا کٹ کی داستان نہیں۔ اِس میں وہ روّیہ نہیں جو ذہن کو شہوانیات میں اُلجھا دے یا ترقی پسندی کے نام پر کھل کھیلنے کا درس دے۔ بلکہ یہ جمال وجلال کی شاعری ہے۔ جس میں ایک محبت کرنے والے قلب کی واردات اور حُسنِ محبوب کے کرشموں کا بیان ہے۔ جس میں دِل کی دھڑکنوں اور حُسن وشباب کا گہرا احساس ہے۔ پاکیزہ محسوسات کی نقاشی، زبان کی صحت اور محاورے کی اصابت کا لحاظ موجود ہے۔ رنگینی، شگفتگی، جمالیاتی عنصرِ لفاظی اور صنّاعی نے اِس میں حُسن ودلکشی کا منفرد رنگ پیدا کر دیا ہے۔ اُردو کے علاوہ نیاز نے فارسی میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ اور وہ بھی اُردو غزلوں کی طرح صد درجہ خوب صورت ہیں۔ صرف دو شعر بطور نمونہ دیکھئے:-

دست ہمی کشم از اُو، آہ ولے علاج چیست
ایں دلِ بے قرار وآں چشمِ فسوں طراز را
انچہ بادیگراں کنی، آں بہ دلِ نیاز ہم
از تو خواست اندکے شیوۂ امتیاز را

نیاز کی شاعری کا یہ دور ۱۹۰۵ء تا ۱۹۲۵ء پر محیط ہے۔ اوّل اوّل انہوں نے شاعری کی وجہ سے شہرت پائی۔ اور شاعر کی حیثیت سے پہچانے بھی گئے۔ لیکن اُن کا مضطرب ذہن شعر گوئی سے مطمئن نہیں ہُوا۔ اِس کی وسعتِ بیان کے تقاضے کچھ اور تھے۔ نیاز جذبوں کے تموّج کے ساتھ فکر وتامل کا شعلۂ بے باک اپنے اندر رکھتے تھے۔ اِس کے اظہار پر اگر وہ قادر ہوتے تو غالب و اقبال کے ہم پلّہ شاعر ہوتے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ اِس لئے کہ خود شناسی سے کام لے کر شاعری کے بجائے نثر کو اپنا لیا۔ اُن کا قلم اب نثر میں اپنی قوت ونگارنگی کے جوہر دکھانے

لگا۔ بقول مجنوں گورکھپوری:-

"نیاز کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ وہ شاعری کے لئے نہیں بنے ہیں۔ پھر وہ نثر کی طرف اِس طرح مُڑے کہ ان کی شاعری نہ صرف ہمارے لئے بلکہ اُن کے لئے بھی آج بھولا ہُوا خواب ہے۔ یہ اُردو ادب کے حق میں بہت مبارک ہُوا۔ نیاز کا ذوقِ جمال اور اِن کا حُسن کارانہ شعور وہ دوسرا آہنگ چاہتا تھا جس کا غیر شاعرانہ نام نثر ہے۔ نیاز نے اُردو زبان وادب کی جو ناقابلِ فراموش خدمتیں نثر کے میدان میں کیں وہ شاید شاعری کے میدان میں رہ کر نہ کر سکتے۔"[1]

نیاز کی خدمات مسلّمہ اُمر ہیں۔ نثر کو انہوں نے وسعت و عظمت بخشی اور تازگی وشگفتگی بھی۔ ناول، افسانہ، تاریخ، مذہب، فلسفہ، سائنس، سیاست، فراست الید نفسیات وجنسیات، کون سا شعبہ ہے جس پر نیاز کی اعلیٰ پایہ کی باقاعدہ تصانیف موجود نہ ہوں ۱۹۲۲ء سے پہلے نیاز کی حیثیت خالص رُومان نگار کی تھی اور وہ آسکر وائلڈ، رابندر ناتھ ٹیگور، میر ناصر علی خان، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی اور ابوالکلام آزاد سے بہت متاثر تھے۔

میر ناصر علی، مشرقی تہذیب وتمدّن کے تحفّظ اور اُردو زبان وادب کی ترقی کو بہت ضروری خیال کرتے تھے۔ اُنہوں نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا کہ زبان کو ایک تازہ حُسن کاری سے پہلے مزّین کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اُردو کو ایک نئے اُسلوب سے آشنا کرانے کے لئے اُنہوں نے اپنے رسالہ "تیرھویں صدی" سے کام لیا۔ اُردو میں عاشقانہ مضامین لکھنے کی ابتدا کی۔ صنفِ نازک کا تذکرہ کر کے اُردو نثر کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ نثر میں شاعری کی اور شاعری کے موضوعات کو نثر میں جگہ دی۔ اُن کا خیال تھا کہ دوسرے ممالک کے فن کاروں

---

[1] جدید نثرِ اُردو، نیاز فتح پوری اور نئی نسل جشنِ طلائی نمبر ص ۱۸۶

کی تحقیقات سے فائدہ اُٹھانے سے پہلے ضروری ہے کہ اپنے ملک کے اہلِ قلم کو سمجھایا جائے کہ مشرقی روایات کی قدر و قیمت کیا ہے اُن کا قول تھا کہ :-

"جو شخص اپنے مُلک کے اہلِ قلم سے واقف نہیں وہ دوسرے ملک کے
کمال کو کیا سمجھ سکتا ہے۔" [1]

نیازؔ، میر ناصر علی کی مشرقیت، روشن خیالی اور اُسلوب پرستی سے بہت متاثر تھے۔ ابتداً یہ رنگ اُن کی تحریروں میں بہت نمایاں رہا۔ بعد ازاں وہ مولانا ابوالکلام آزادؔ کی طرف لپکے اور اُن کے اندازِ نثر کا بہت گہرا اثر قبول کیا۔ مغربی نثر نگاروں میں آسکر وائلڈ، خصوصاً اُن کے مطالعے کا مرکز رہا۔ اور اُس کی رُومانی و جمالیاتی روش سے اُن کا ذہن عُمر بھر متاثر رہا۔ بنگال کے عظیم شاعر و فلسفی ٹیگور سے بھی متاثر ہوئے۔ "گیتا نجلی" کا ادبی حُسن اُن کے لئے بہت کشش رکھتا تھا چنانچہ اُنہوں نے ۱۹۱۴ء میں گیتا نجلی کا ترجمہ نثر میں کیا۔ نیازؔ اپنی کتابوں پر مقدمہ یا دیباچہ لکھنے کے قائل نہ تھے لیکن ٹیگور سے متاثر ہونے کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے "عرضِ نغمہ" پر طویل مقدمہ بھی لکھا۔

نیازؔ تخیل و جذبہ کی حسین و دلکش، دل آویز و دل فریب دُنیا کے باسی ہیں۔ یہ حُسن لفظوں کے خوب صورت پھول بکھیرتا ہُوا ہمیں آکاس بیل کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس انداز میں جتنا حصّہ سجاد حیدر یلدرمؔ کا ہے، شاید ہی کسی اور کا ہو۔ نیازؔ نے اس بات کا خود بھی اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی افسانہ نگاری کو یلدرمؔ کا تاثر ہی قرار دیتے ہیں رُومانیت و جمالیت، نیازؔ نے اُنہی سے سیکھی۔ عورت کے تذکرے اور یلدرمؔ کے افسانوی کرداروں سے وہ بہت متاثر ہیں۔ یلدرمؔ کے افسانوی کردار بقول ڈاکٹر محمد حسنؔ :-

اِن کے کردار جمالیت پرست اور ذہین ہیں جنہوں نے آدرش کے

سانچے تو یقیناً مغرب سے مستعار لئے ہیں لیکن ان آدرشوں کی مشرق تمدن میں تلاش کی ہے۔" [1]

یہی انداز نیازؔ کے ہاں بھی ملتا ہے کہ کردار تو یونان و رُوما، مصر و عرب کے ہیں لیکن خالصتاً ہندوستانی معاشرہ کی پیداوار محسوس ہوتے ہیں۔ عورت کے حُسن و جمال اُس کی بے لوث محبت اور ایثار کا اعتراف یلدرمؔ کے ہاں جیسا نظر آتا ہے شاید ہی اُس دور کے کسی فن کار کے ہاں ملے۔ ان کا کہنا ہے :-

"عورت! عورت ایک بیل ہے جو خشک درخت کے
گرد لپٹ کر اُسے تازگی، اُسے زینت بخش دیتی ہے۔ وہ ایک دُھونی
ہے کہ محبت کی لپیٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے۔" [2]

نیازؔ نے بھی عورت کو مجسّم حُسن، رُوح کی شگفتگی، سحرِ مرئی اور مادی نُور قرار دیا ہے۔ جا بجا اُس کے جسمانی و رُوحانی حُسن کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ نیازؔ کے ذوقِ ادب کو اُبھارنے میں سجاد حیدر یلدرمؔ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یلدرمؔ کی رُومانیت و جمال پرستی نے اُن کے اندر عجیب طرح کی بے چینی و تڑپ پیدا کر دی۔ یلدرمؔ کے مطالعہ کے بعد یُوں لگتا ہے جیسے اُن کے تمام زخم ہرے ہو گئے ہیں۔ خود لکھتے ہیں :-

نتیجہ یہ ہُوا کہ میرے دل کے سب زخم ہرے ہو گئے۔ اور جذبات میں
اتنا شدید ہیجان ہُوا کہ دفعتاً میرے مطالعہ کا رُخ بدل گیا۔ اور یُونانی
صحافت کے مطالعہ میں محو ہو گیا۔ اور اُنہیں کی رومانیت کی بنا پر میں نے
فسانے لکھنے شروع کئے۔ چنانچہ میرا افسانہ "کیوپڈ اور سائیکی" بھی اسی سلسلے
کی ایک چیز ہے۔" [3]

یلدرم کے زیرِ اثر نیاز کی انشائے لطیف میں بھی عورت کا عمل دخل ہو گیا۔ یلدرم اِس عمل دخل سے خیالات میں رنگینی و رعنائی پیدا کرتے ہیں۔ مہدی افادی ذہن و احساس میں ارتعاش کی کیفیت بھرتے ہیں، اور نیاز جذبات کی شدّت اور خیالات کی رنگینی کا مرقع بناتے ہیں۔ نیاز کے یہاں جُوں جُوں جذبات کی شدّت بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر خیالات میں رنگینی و رعنائی از خود پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ جذبات کا یہ ہیجان و طغیان اُنہیں افلاطونی تصورِ عشق کا اہم کردار بنا دیتا ہے وہ ایسے فن کار ہیں جو اپنے فن کے نشے میں نہ صرف خود بے پیے مست رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی مدہوش کر دیتے ہیں۔ نیاز کی رُومانیت و لطافت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ تلخ حقائق کی دُنیا سے دُور خوب صورت تصوّرات و تخیلات کی محویت اُن کی تحریروں میں ماورائی اور شعریت کے سحور کُن عناصر بھر دیتی ہے۔ لیکن تصوّرات کی اِس دُنیا سے جب وہ حقائق کی دُنیا میں قدم رکھتے ہیں تو ایسا منطقی و استدلالی انداز اختیار کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے

نیاز ادبِ لطیف لکھنے والوں میں منفرد و ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے رُومانی و جمالیاتی مزاج نے ادب کو پژمردہ و ژولیدہ نہیں بنایا۔ بلکہ وہ ادب برائے ادب کے قائل نظر آتے ہیں وہ حُسن کے پرستار ہیں، جہاں غم و اندوہ اور غمِ دوراں کم نظر آئیں گے۔ یاس و حرماں کے بجائے عام بے فکری میں مسرّت و انبساط کی بہریں رقصاں ہیں۔ حُسن و عشق کی دُنیا آباد ہے۔ جہاں عورت اور محبت ہی سرمایۂ حیات ہے۔ موضوع، خیال، کردار، اُسلوب، سب لطافت و نزاکت کا جیتا جاگتا شاہکار ہیں بقول ڈاکٹر عبد الودود:۔

"نیاز کی جن تخلیقات کو ادبِ لطیف میں شمار کیا جاتا ہے، اُن میں اُسلوب کے ساتھ ساتھ موضوع بھی لطیف ہے۔ خیال لطیف، کرداروں کے احساسات لطیف اور تحریر لطیف ہے۔ جملوں میں لطافت اور پھولوں کی سی نزاکت ہے۔ تحریر کیا ہے رنگین پھولوں کا گلدستہ ہے جن کی بھینی بھینی خوشبو مشامِ جاں کو معطّر ہے۔ ہمارا ذہن ایک کیف

محسوس کرتا ہے"[1]۔

غرض کہ نیاز نے نثر میں شاعری کی اور اُن کی اِس زنگارنگ نثر نے شاعری ہی کی طرح ادب کے شائقین کا دل موہ لیا۔ اِس سلسلے میں "جُرم و فنا" کو اُن کی پہلی باقاعدہ نثری تخلیق کہنا چاہیے۔ یہ افسانوی تخلیق اگست ۱۹۱۱ء "تمدن" (جلد ۱، شمارہ ۵) میں شائع ہوئی۔ اِس میں موضوع کی سنجیدگی بھی ہے اور اُسلوب کی رنگینی بھی۔ ابتدا میں قصّے کو منظوم صورت میں بیان کر کے پھر نثر میں لکھا ہے۔ مغرب و مشرق کا موازنہ کرتے ہوئے نیاز مشرقی تہذیب کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ زکیہ جو محبت و وفا، ایثار و قربانی کی پُتلی ہے جس کا ہر جذبہ، ہر احساس، ہر سوچ، ہر فکر و ہر خواب اپنے شوہر شوکت سے وابستہ ہے۔ شوکت اُسے سوشل لائف اختیار کرنے، اپنے دوستوں سے ہاتھ ملانے، ہنسنے بولنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مگر وہ مشرق کی غیور شرمیلی بیوی سجیدہ اُس کے حوالے کرتے ہوئے زہر پھانک لیتی ہے۔ اِس پُرسوز کہانی کو نیاز نے بڑے سیدھے سادے، اصلاحی انداز میں بیان کر دیا ہے۔ یہ دس صفحات پر مشتمل ہے۔ صرف ڈیڑھ صفحہ نثر کے لیے مخصوص ہے۔ جو اُن کی اعلیٰ درجے کی تخلیقی صلاحیتوں کا پتا دیتا ہے۔ کہ مولوی نیاز محمد جو آئندہ علامہ نیاز فتح پوری بننے والے ہیں اُن کا مستقبل بڑا روشن و تابناک ہے۔

نیاز نے ابتدا میں جو کہانیاں لکھیں وہ مقصدی بھی تھیں اور اصلاحی بھی۔ مگر ساتھ ہی اُسلوب و انشا نے اُنہیں چار چاند لگا دیے ہیں۔ اِس سلسلے میں "راز و نیاز" کو خاص اہمیت حاصل ہے تین صفحات پر مشتمل یہ کہانی "تمدن" جولائی ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ اُس میں یزداں سے شکوہ ہے کہ کاش تو سامنے ہوتا۔ تمناؤں کا محشر، آرزوؤں کا متلاطم طوفان میرے ساتھ ہے۔ ایک ایک کر کے تیرے سامنے پیش کرتا جاتا اور صدمات و حسرتوں کی داد لیتا جاتا۔ یہاں عرب کے ریگستان کا منظر ہے، ایک معصوم بچّہ پیاس سے بے حال گر اُس کی پیاس تُو نے خون سے بجھا، تیر

---

[1] "اُردو نثر میں ادبِ لطیف" ص ۲۲۳۔ بارِ اوّل ستمبر ۱۹۶۶ء، سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔

ایک پرستار بتوں کے خنجر سے ٹکڑے ہوا، وہ بوڑھی ناقہ زندہ عورت جس نے آدھ سیر آٹا بڑی مشکل سے جمع کیا جو تیری باران رحمت سے بہہ گیا۔ میرے اِن شکوؤں سے ممکن ہے تو،

"اپنے آفتاب سے منع کردے کہ صبح و شام کا اپنا گُندنی لباس ترک کردے
ماہتاب سے کہہ دے کہ اپنی خنک رام تنگرانہ رفتار سے مجھ میں انجذاب
نہ پیدا کرے۔ گُلوں کی شگفتگی، بُلبل کی شیفتگی، میرا دل نہ دکھائے۔ غنچوں
کا تبسّم، طیور کا ترنم، میری رگِ جان کو نہ چھیڑے۔ سبزہ کی فراوانی، شبنم کی
غلطانی، مجھے بیتاب نہ کرے۔ ہوا کی متانت، پہاڑوں کی استقامت،
مجھ کو متاثر نہ کرے، دریا کی روانی، بہار کی پُرحجانی، میرے درپئے آزار نہ ہو
اپنی قدرت کی بوقلمونی کو محدود و یکسر مسدود کر۔ تجھ کو اگر میرے تاثرات سے
شکوہ ہے تو مجھ کو تیری ساری کائنات سے ہے۔"[1]

نیازؔ نے موضوعات کے اسی اچھوتے پن، جدت و ندرت، اسلوب کی رنگینی اور انشاپردازی سے یک بیک سب کو چونکا دیا۔ زمانہ محوِ حیرت تھا کہ یہ مدھر، مسحور، دلکش آواز جس کی ترنگ دیپک، جو پانی میں آگ لگا دے، یقیناً تحفۂ فطرت ہے۔ اسی دور میں نیازؔ نے سنجیدہ، مذہبی و معلوماتی مضامین لکھنے کا آغاز بھی کر دیا۔ اُن کے مضامین "موت" اور "کائنات پر ایک نظر" جو ۱۹۱۲ء ہی کی تخلیق ہیں۔ ان مضامین نے ثابت کر دیا کہ نیازؔ محض رومانیت، جمالیت اور انشاپردازی پر ہی قادر نہیں بلکہ اُن کی نظر اور اُن کے نفظوں میں بھی ایسی وسعت ہے کہ تحقیقی عقلی و سائنسی نثر پر بھی اتنی ہی قدرت رکھتے ہیں جتنی رومانی و تخیلاتی نثر پر۔ اس ضمن میں اُن کا مضمون "معاوضہ یا مکافات"[2] بہت اہم ہے۔ اس سنجیدہ و فلسفیانہ مضمون کی بنیاد اُنہوں نے

۱۔ "تمدن" جولائی ۱۹۱۲ء، ص ۲۳، جلد ۳، شمارہ ۴
۲۔ مطبوعہ رسالہ "صوفی"، جون ۱۹۱۵ء، ص ۴

ایمرسن کے نیچر اور قانونِ قدرت کے نظریے پر رکھی ہے۔ یوں نیازؔ نے تاریخی، نفسیاتی، مذہبی، اقتصادی، علمی، ادبی، معاشرتی، ثقافتی اور اخلاقی میدان میں اپنے ذہن و قلم کے جوہر دکھا کر آزادی اور جرأتِ فکر کی روایت کو آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ وہ روایت جس کی ابتدا سرسیدؔ اور اُن کے رفقاء نے کی۔ اب اُس کا تحفظ نیازؔ اور اُن کے ساتھیوں کے ہاتھ میں تھا۔ یوں نیازؔ کا نام علم و ادب کی دُنیا میں چمکنے لگا۔ وہ دُنیا خواہ ٹھوس حقیقتوں کی ہو یا خوابوں کے خوب صورت جزیروں کی۔ نیازؔ نے اگرچہ عقل و استدلال اور سائنسی و منطقی طرزِ فکر سے کام لینا شروع کر دیا تھا مگر اُن کے اندر کا شاعر ہمیشہ زندہ رہا۔ جس نے اُنہیں اعلیٰ درجے کا رومانی افسانہ نگار ثابت کیا۔

نیازؔ ایک اعلیٰ درجے کے مکتوب نگار بھی ہیں۔ یہ بتانا یقیناً بہت مشکل ہے کہ نیازؔ نے پہلا خط کب اور کس کے نام لکھا؟ اس لئے کہ اُن کے خطوط میں جگہ، تاریخ، مکتوب الیہ کا نام اور دوسری تفصیلات نہیں ملتیں۔ یہ خطوط مارچ ۱۹۳۲ء سے "نگار" میں چھپنا شروع ہوئے۔ یہ خطوط اُردو ادب کا انمول خزانہ ہیں۔ اور ان میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جو اعلیٰ درجے کی مکتوب نگاری کا حصہ ہیں۔ سادگی، بے تکلفی، شدتِ جذبات، رومانیت، حقیقی زندگی، تامل و تفکر اور انشاپردازی کا شاہکار ہیں۔ جو نیازؔ کی عظیم الشان تخلیقی و تنقیدی صلاحیتوں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔

نیازؔ فطرت کی طرف سے ناقدانہ صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔ انھوں نے نہ صرف ادب و شعر بلکہ علم و فن، تہذیب و تمدن کے ارتقاء پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ تاثراتی نقاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ جنہوں نے نظری اور عملی دونوں طرح کی تنقید کی طرف توجہ کی ہے۔ اور اپنے جاندار قلم سے ایسی بصیرت افروز باتیں کہی ہیں کہ جنہیں کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فکری نہج، منہاج و مقصد میں انشاپردازی بھی ہے اور کلاسکیت کا گہرا رنگ بھی چھایا ہوا ہے۔

تنقید، افسانہ، شاعری، مکتوب، تاریخ، مذہب، صحافت، انشائیہ، مقالہ، زبان و لسانیات، سیاست، ثقافت، شاید ہی کوئی ایسا میدان ہو جس میں نیازؔ کے فکر و قلم کے نشانات موجود نہ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ نیازؔ بحیثیت ادیب کے ایک فرد نہیں پورا ایک دبستان اور مکتبۂ فکر

ہیں۔ مشفق خواجہ کے لفظوں میں :۔

"نیاز فتح پوری بظاہر ایک فرد کا نام ہے لیکن یہ فرد ایک دبستان کا درجہ رکھتا ہے۔ جسے روشن خیالی کی تحریک کا نام دے سکتے ہیں۔ فکری سطح پر اقبال کے بعد اگر کسی ادیب نے بیسویں صدی کے اُردو ادب کو متاثر کیا ہے تو وہ صرف نیاز فتح پوری ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اقبال مذہب اور ادب دونوں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ نیاز فتح پوری کی پہلی اور آخری شناخت ادب اور صرف ادب ہے۔ اِس صدی کی جتنی بھی ادبی تحریکیں سامنے آئی ہیں اُن کے پیچھے نیاز فتح پوری کی روشن خیالی کارفرما ہے۔ اُنہوں نے فکری جمود اور تقلید کو ختم کر کے جو فضا پیدا کی، اُس کی بنا پر اُنہیں ادبی مجدّد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔"[1]

---

[1] نگار پاکستان جون ۱۹۶۲ء ص ۲۱

باب ۲

افسانہ نگاری

"افسانہ" فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لُغوی معنی قصّہ کہانی کے ہیں۔ جھوٹی بات کو بھی افسانہ کہا گیا ہے۔ اِصطلاحاً اِس سے مراد نثر کا وہ مختصر فن پارہ ہے جو افسانوی اجزا سے مزیّن ہو۔ ابتدائے آفرینش کے جانور نُما اِنسان کی زندگی بہت مشکل و کٹھن تھی۔ پتھر کے دَور کا یہ اِنسان خود پتھر سے تراشا ہُوا بُت محسوس ہوتا تھا۔ دِن بھر کی محنت مشقّت کے بعد فطری طور پر اُسے ایسے مشغلہ کی تلاش ہوئی جو تھوڑی دیر کے لیے مادی دُنیا کے مسائل سے دُور اُسے ذہنی طور پر سکون و آسودگی بخش سکے۔ چنانچہ اُس نے فطری و خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے کہانی یا قصّہ کی ابتدا کی، اِس طرح کہ وہ اپنے سارے دِن کے حالات و واقعات دوسروں کو سُنایا کرتا۔ دراصل یہی افسانہ کی ابتدا تھی۔ قدیم اِنسان کا مشاہدہ محدود تھا۔ اِس لیے وہ عظیم اور انوکھی شے کو دیکھتا اُسے اپنا معبود سمجھ کر، اُس کے سامنے جُھک جاتا۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت ابتدائی معبود تھے۔ علم الاصنام کی رسم یہیں سے شروع ہوئی۔ انسان نے کائنات کی مختلف نادر و عظیم چیزوں کو اپنا دیوتا تسلیم کر کے اِن کے گرد کہانیوں کے جال بُن دیے۔ یہ کہانیاں تخیّلاتی دماورائی

ہونے کے باوجود دلچسپ و دلکش ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:۔

"ان افسانوں میں آج بھی باوجود بعید از قیاس ہونے کے ایک رعنائی ہے۔ ایک دلکشی ہے، ایک شگفتگی ہے، اور ایک دل موہ لینے والی کیفیت ہے۔ چنانچہ انہیں خصوصیات کی وجہ سے اُس وقت کے انسان کی تخیل کی بلند پروازی اور تخلیقی صلاحیتوں کی داد دینی پڑتی ہے۔[1]"

اسی تخلیقی صلاحیت اور تخیل کی بلند پروازی نے داستان اور ناول کے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے نیا رُوپ دھارا تو افسانے نے جنم لیا۔ اُردو کی نثری اصناف میں افسانہ کو جو مرکزیت حاصل ہے اور اس نے مختصر وقت میں جو ترقی کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ داد ہے۔ افسانہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب حقیقتاً بہت مشکل ہے۔ اڈگر ایلن پو افسانہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"یہ ایک نثری داستان ہے جس کے پڑھنے میں آدھ گھنٹے سے دو گھنٹے کا وقت لگے۔[2]"

افسانہ، گویا مصروف زندگی میں مختصر وقت کی ذہنی تفریح کا بہترین ذریعہ ہے۔ نثر کا مختصر بیانیہ ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ کا سفر، جذبے کے بغیر طے کرنا ناممکن ہے۔ افسانہ، جذبات کا بھنور ہے جسے حقیقت اور غیر حقیقت کے قدموں پر ہی احسن طریق سے پار کیا جا سکتا ہے۔ ایچ جی ویلز افسانہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"وہی افسانہ، کامیاب افسانہ کہلائے گا، جو قاری کے دل میں خوشی، غم یا خوف کے جذبات پیدا کر سکے یا اس کے جذبات میں تلاطم پیدا کر سکے۔[3]"

---

[1]: "تنقیدی زاویے" ص ۴۸، بار اول اکتوبر ۱۹۵۱ء، انشا پریس لاہور۔
[2]: "فنِ افسانہ نگاری" وقار عظیم ص ۷، بار اول ۱۹۳۵ء، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد
[3]: "اُردو افسانے کا ارتقاء" ص ۳۔ ڈاکٹر مسعود رضا آغا مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی پنجاب یونیورسٹی۔

جذبات انسانی زندگی کی ضمانت ہیں۔ یوں تو جملہ فنونِ لطیفہ کی بنیاد ہی جذبات پر ہے۔ لیکن افسانہ میں ان کا خاص رول ہے۔ جذبات، افسانہ، اور انسان کا رابطہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

اُردو میں مغربی طرز کے مختصر افسانوں کا رواج، بیسویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اوّل اوّل منشی پریم چند، کو اُردو کا پہلا افسانہ نگار اور اُن کے افسانہ "دنیا کے انمول رتن" مطبوعہ ۱۹۰۷ء کو اُردو کا پہلا افسانہ سمجھا گیا۔ جدید ترین تحقیق نے اس خیال کو غلط ثابت کیا۔ یلدرم کا افسانہ "نشہ کی پہلی ترنگ" اکتوبر ۱۹۰۰ء میں رسالہ "معارف" علی گڑھ میں چھپا۔ یوں یلدرم اُردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں مگر اُن کا یہ افسانہ ترجمہ ہے۔ راشد الخیری کی افسانہ نگاری کا زمانہ ۱۹۰۳ء ہے۔ یلدرم کے ترجمے کی وجہ سے کچھ لوگ راشد الخیری کو اُردو کا پہلا افسانہ نگار مانتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے اس اوّلین دَور کا تجزیہ کیا جائے تو اس عہد کے افسانے، داستان نما ہیں۔ ان افسانوں میں داستانوں کی ماورائی و تخیلاتی دُنیا نظر آتی ہے۔ پریم چند نے سیاسی، سماجی، معاشرتی و معاشی حقیقتوں کو افسانے کا موضوع بنایا۔ ان کے افسانے اصلاحی و مقصدی ہیں۔ زندگی اپنی تمام تر تلخیوں اور معاشرتی و طبقاتی ناہمواریوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ آج بھی "دیوی" "زادِ راہ" "زیور کا ڈبہ" اور "کفن" کو اُردو کے بہترین افسانوں کی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔

اس حقیقت پسندی، اصلاحی اور مقصدی رویّے کے متوازی افسانے کی دُنیا میں ایک اور رویّہ نظر آتا ہے جس کی نمائندگی سجاد حیدر یلدرم کر رہے تھے۔ یہ رویّہ رُومانیت کا ہے۔ جو حُسن، عشق اور عورت کا مثلث ہے۔ ان افسانوں کی بُنیاد عورت سے محبت پر تھی۔ عورت کا اس طرح تذکرہ محبت اور جنسی رویّے کو پیش کرنا، اُس وقت شجرِ ممنوعہ تھا۔ مگر رُومانی تحریک کے علمبرداروں نے عورت کی گود میں ہی پناہ لی۔ فطرت کی پرستش پکار اُن کا محور و مرکز تھی۔

رُومانوی تحریک دراصل سرسیّد تحریک کا ردِ عمل تھی۔ رُومانوی تحریک اور اُردو افسانہ کم و بیش ایک ہی وقت کی پیداوار ہیں۔ اس لئے افسانہ کا اس سے متاثر ہونا فطری عمل تھا۔ سرسیّد تحریک نے گرچہ اپنی مقصدیت، قطعیت، استدلالیت، اور افادیت سے نہ صرف برِ صغیر

کے مسلمانوں کی ذہنی و معاشرتی، حالت کو بدلا بلکہ علمی و ادبی سرمایے میں بھی بیش قیمت اضافہ کیا۔ بہت سی نئی اصناف ادب اور نئے ادبی رویے منظرِ عام پر آئے۔ مگر خالص فن کا خون ہو گیا۔ تخیل و تصور، ادبیت و شعریت، شاعرانہ احساس و صداقت، اور فنی و جمالیاتی حظ آفرینی کا رنگ بہت ہی پھیکا رہا۔ چنانچہ رومانوی تحریک حقیقی زندگی کی ہر دوں کے ساتھ ساتھ تخیل و تصور، اور عشق و محبت کی رومان پرور دنیا کو لے کر آگے بڑھی۔

"رومانیت" کا لفظ "روم" اور "رومانس" سے نکلا ہے۔ اور رومانس کا اطلاق اُن کہانیوں پر ہوگا جو انتہائی آراستہ، پُرشکوہ پس منظر کے ساتھ عشق و محبت کی داستان سنائیں۔ یوں عشق و محبت سے متعلق تمام چیزوں کو رومانی کہا جانے لگا۔ جن میں عورت کا تذکرہ خاص دلکش و دل فریب انداز میں کیا جاتا۔ اس کے علاوہ روایت سے بغاوت، حال سے فرار اور ماضی میں پناہ، فطرت کے حسین نظاروں سے خاص لگاؤ، غیر معمولی آرائش و زیبائش تخیل و تصور، اور شان و شوکت کو بھی رومانی کہا جانے لگا۔ بقول احتشام حسین:

"رومان سے مراد حسن و عشق کا افلاطونی اور تخیلی بیان نہیں بلکہ روایات سے بغاوت۔ نئی دنیا کی تلاش، خوابوں اور خیالوں سے محبت۔ ان دیکھے حسن کی جستجو، وفورِ تخیل، وفورِ جذبات، انانیت میں ڈوبی ہوئی انفرادیت، آزادیٔ خیال، حسن تا بہ مقدور لطف اٹھانے میں ناآسودگی کا احساس، اور اس کا کرب میں ان سب کو رومانیت کہتا ہوں[15]"

زندگی عقل و جذبے کے توازن کا نام ہے۔ مگر وہ خوب صورت لمحے جب شعور کچھ دیر کے لئے سو جاتا ہے۔ تب یہ توازن و اعتدال کے کلاسیکی رویّہ کو نیند آنے لگتی ہے۔ کلاسیکیت زمین پر رکھا ہوا قدم اور رومانیت اٹھا ہوا قدم ہے کہ نجانے کیسے پڑے؟ کہاں پڑے اور کیسا نقش چھوڑے

۱۵۔ مکالمہ احتشام حسین اور نیاز فتح پوری۔ پگڈنڈی امرتسر۔ یلدرم نمبر ص ۱۱۶، ۱۱۷

اس طرح زندگی حقیقی و روشن رنگوں کے ہمراہ بھی چلتی ہے جہاں دل بے قراری سے خود بخود دھڑک اُٹھتا ہے۔ سوچ و فکر آزاد ہے، وجدان ہواؤں میں اُڑ رہا ہے۔ عقل و دانش کا کوئی بھاری پتھر راستہ نہیں روکتا۔ اور فن تصور و تخیل سے حقیقی آشنائی حاصل کرتا ہے۔ بقول محمد ہادی حسین:

"رومانیت ایک مزاج، ایک ذہنی زاویہ، ایک انداز تجربہ ہے اس لیے اس کا سروکار فنی تخلیق کے تصور سے ہوتا ہے نہ کہ اس کے اُسلوبِ بیان سے[16]"

رومانوی تحریک خالص فن کی تحریک ہے۔ وہ "ادب برائے ادب" کی علمبردار، اس کا کہنا ہے کہ ادب کا موضوع صرف عشق و محبت، رومان، عورت اور حسنِ فطرت ہے۔ اس کا زندگی کی پیچیدہ دسیسوں اور اس کی چیر پھاڑ سے کیا کام؟ اس کا نصب العین صرف جمالیاتی حظ آفرینی و مسرت و خوشی سے سرشار کرنا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ فن کار کو انفرادی آزادی کا حق حاصل ہے۔ یہ حق اس سے نہیں چھیننا چاہیے۔ وہ خاص اپنی زبان اور ذاتی جذبے سے بات کرتا ہے۔ دنیا کی باتیں نہیں بلکہ اپنی باتیں بیان کر سکتا ہے۔ ایسی باتیں جو پرائیویٹ ہوں اور خوشگوار تاثرات قائم کریں۔

رومانیت ہمارے ہاں تین صورتوں میں نظر آتی ہے۔ کردار کی شکل میں، جب ذہین کردار رنگین گفتگو کرتے۔ خوب صورت شعر کہتے اور بولتے ہیں۔ دوسرے فطرت کے مناظر ایک خاص شوخی دھند میں لپٹے نظر آتے ہیں۔ گلاب کے پھول، شفتالو کے درخت۔ شبنم کی کلیاں بہتے جھرنے، چہچہاتے پرند دلکش فضا پیدا کرتے ہیں۔ اور تیسرے جذباتی جملے و فقرے جن کا سہارا لے کر مصنف واقعات کو آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ اس میں مقصدیت و اجتماعیت کی بجائے انفرادیت، فرد کے انفرادی تشخص، اور احساسِ انا پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ محبت، کو وجدان، روحانی آواز اور داخل کی قوت مانا گیا ہے۔ محبت اور عورت ایک ہی تصویر کے دو رُخ، اور ایک ہی

۱۶۔ مغربی شعریات ص ۳۰۹، طبع اول مارچ ۱۹۹۶ء، مجلس ترقی ادب لاہور۔

احساس کے دو روپ ملنے گئے ہیں۔ اس مثبت انداز نے خوب صورت کہانیوں اور شاہکار افسانوں کو جنم دیا۔ مگر اس کے باوجود گوئٹے کی اہم منفی بات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جس نے بڑے اعتماد و وثوق سے کہا تھا کہ

"میں کلاسیک کو صحت مند اور رُومانوی کو مریضانہ یا بیمار کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔"[1]

زندگی کا یہ اُصول رہا ہے کہ ایک اِنتہا دوسری اِنتہا کو جنم دیتی ہے۔ عمل سے ردِّعمل، ردِّعمل سے پھر عمل کا یہ لامتناہی سلسلہ چلتا آیا ہے۔ رومانوی تحریک کلاسیکی رویے کا ردِّعمل تھی مگر ردِّعمل ہمیشہ منفی یا مریضانہ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات زندگی قید سے رہائی پانا چاہتی ہے۔ وہ حبس اور گھٹن کی کثیف فضا سے نکل کر، آزادی اور سُکھ کا سانس لینا چاہتی ہے۔ وہ معاشرتی بندھنوں کی بے رحم زنجیریں توڑ کر عشق و محبت کی آسودگی و تسکین میں پناہ چاہتی ہے۔ جذبہ، احساس، انفرادیت اور ماورائیت اِنسان کو سمیٹ لیتی ہیں۔ وہ مشینی و میکانکی زندگی سے تنگ کر سُکون کے لمحے چاہتا ہے۔ چنانچہ ہمارے افسانے کی ابتدا ہی اس رُومانی و جذباتی فضا میں ہوئی۔ تخیل، جذبہ، نزاکت، رعنائی اور رنگینی کی اِس تحریک کو "مخزن" اور "ہمایوں" نے آگے بڑھایا۔ رُومانی افسانہ نگاروں کا دور بقول ڈاکٹر محمد حسن:۔

"رُومانوی افسانہ نگاروں کا دور آیا۔ ماورائیت کی دُھند، خوب صورت رنگ و آہنگ، غمِ ذات کی سُلگتی ہوئی چنگاریاں، محبت کی سُرمئی خوشبوئیں، غیرارضی تخیّل اور پُراسرار فضائیں، جذبے کی شدت اور خیالوں کی پیکرتراشیاں اُردو افسانہ پر چھائی رہیں۔"[2]

---

[1]: "ارسطو سے ایلیٹ تک" ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۳۰۰، بار اوّل ۱۹۷۵ء، نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی
[2]: "جدید اُردو ادب" ص ۱۴، بار اوّل نومبر ۱۹۷۵ء، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔

گویا افسانہ نگار افسانے میں شاعری کرتے ہیں۔ یہاں خوب صورت و دلکش دُنیا، آرائش اور ماورائی تخیل آرائی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ بات کو سجا بنا کر کہا جاتا۔ جذبے کا نکھار، تخیل کی اُڑان، لفظوں کی ساحری طلسم قارئین کو یُوں بہائے جاتا کہ وہ بے خودی کی شراب کے نشے میں اِس طرح ڈوب جاتے کہ گرد و پیش کی بالکل خبر نہ رہتی۔ لفظوں کے اُڑتے ہوئے کچھ دلکش حسین تو نظر آتے مگر نظارہ تھما نظر آتا۔ یہ منطق، عقل اور اِستدلال کی دُنیا نہیں بلکہ شدید جذبے تخیل، وجدان اور لفظوں کی دُنیا ہے۔ یہاں زندگی کے ٹھوس اور مادی مسائل حل نہیں کئے جاتے بلکہ زندگی صرف عشق و محبت اور رُومان سے عبارت ہے۔ یہاں عورت کا غیرارضی اور ماورائی تصور ہے جو ذہنی نشاط کا وسیلہ ہے جس کا خمیر محبت سے اُٹھا ہے۔ وہ محبت کرنے اور کرانے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ گویا یہاں ادب خالص جمالیاتی شے ہے جسے زندگی کی تلخیوں سے کیا کام اس نظریے کے سب سے پہلے علمبردار سجاد حیدر یلدرم ہیں۔ سید وقار عظیم اسی نظریے کی نمائندگی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ادب خالص جمالیاتی شے ہے۔ اسے خارزاروں میں اُلجھ کر خُوناخون ہونے سے کیا کام۔ یلدرم اِسی اندازِ فکر کے سالار ہیں۔ اُنہوں نے افسانہ کو عورت اور فطرت کے حُسن، اور ان دونوں کے فطری رُومان کے لئے وقف کیا۔ اور اُردو افسانہ میں سب سے پہلے "ادب برائے ادب" کے جمالیاتی احساس کی نمائندگی کی۔"[1]

یلدرم پہلے رُومانی افسانہ نگار ہیں۔ جن کی "خیالستان" رُومانیت کی بھرپور نمائندہ ہے۔ "خارستان و گلستان"، "سودائے سنگین"، "اگر میں صحرانشین ہوتا"، "آج بھی اُس دور کے خوب صورت و مکمل افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ اِن کے علاوہ یہ رنگ حکیم احمد شجاع، سلطان حیدر جوش، مجنوں گورکھپوری، حجاب

---

[1]: "مختصر افسانے کے پچیس سال" داستان سے افسانہ تک ص ۲۰۰، بار دوم دسمبر ۱۹۶۶ء، اُردو اکیڈمی سندھ

امتیاز اور نیاز فتح پوری کے ہاں نظر آتا ہے۔ نیاز کی افسانہ نگاری زیادہ تر اِسی دَور سے تعلق رکھتی ہے۔ اور وہ تمام رُجحانات اُن کے ہاں نظر آتے ہیں جو اس تحریک کا جُزوِ خاص تھے نیاز یلدرم سے بہت متاثر ہوئے۔ یہ مخصوص رَوّیہ اُنہی کی وجہ سے اُن میں پیدا ہُوا جیسا کہ خود اعتراف کرتے ہیں:۔

"مَیں اِس کا اعتراف کروں گا کہ میرے مخصوص ادب کے اُبھارنے میں سیّد سجاد حیدر کا بڑا ہاتھ تھا۔ اور رُومانی افسانہ نگاری میں یقیناً اِن کی حیثیت موجد کی سی ہے۔ اور میری مقتدی کی سی[1]"۔

رُومانوی افسانہ نگار دراصل نُور و نغمہ کے شیدائی ہیں۔ شعریت، متحرک رجائیت اور زندگی کی روشن تصویروں کو پیش کرنا۔ اِن کا نقطۂ خاص تھا۔ یلدرم کے ہاں یہی رنگ ہے جس سے نیاز بھی بے حد متاثر ہوئے۔ اور اُنہوں نے افسانہ نگاری میں اِس روشن راہ کو اپنے لئے منتخب کیا۔

کہانی کا بنیادی محور و موضوع اِنسان ہی ہے۔ عظیم فن تخیّل و جذبے اور آسمان و زمین کے ربط باہم سے جنم لیتا ہے۔ اِنسان میں جب نرگسیت کا رُجحان پیدا ہُوا تو اُس نے اپنی انفرادیت منوانے کے لئے اپنی ذات کو گرد و پیش اور کائنات سے کاٹ لینا چاہا مگر اس میں اُسے پورے طور پر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ چنانچہ لاشعوری طور پر رُومانیت میں حقیقی زندگی کی جھلکیاں دکھائی دینے لگیں۔ اِس لئے کہ اُس کے قدم خلا پر نہیں۔ بلکہ زمین پر ہیں فن کار کی کامیابی اِسی میں ہے کہ وہ خلائی، ماورائی اور تخیّلاتی دُنیا میں گم ہونے کے باوجود زمینی دُنیا سے اپنا رشتہ نہ ٹوٹنے دے کیونکہ وحدت سے کثرت تک اِنسان کی تمام تر کہانیوں میں تخیّل و احساس کی شدید لہر کے باوجود زندگی سے رابطہ نہیں ٹوٹ سکا۔ عشق و محبت، رُومان کی یہ خوب صورت دُنیا زندگی سے ہم آہنگ رہی۔ یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا رابطہ ہی عظیم فن اور عظیم فن کاروں کو جنم دینے کا باعث

[1] یلدرم اُن کے ساتھی اور رُومانی افسانہ نگاری۔ از نیاز فتح پوری نگینہ شہ یلدرم نمبر ص ۱۱۸

بنا۔ نیاز فتح پوری کا شمار ایسے ہی عظیم فن کاروں میں ہے۔ اُنہیں اگرچہ اُردو کا سب سے بڑا رومانی افسانہ نگار تسلیم کیا گیا ہے مگر اس کے باوجود حقیقت کا جیتا ہُوا۔ کبھی نہ بجھنے والا سورج اُن کی ہتھیلی پہ اپنی کرنیں بکھیرے رہتا ہے۔

نیاز کی رُومانیت خلائی نہیں۔ محض رُوح اور وجدان سے متعلق نہیں۔ بلکہ مادہ و جسم کی ساری رنگینی، رعنائی اور نزاکت اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ نیاز آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں پرشوق سفر کرتے ہیں کہ زمین کا ساتھ مضبوط ہے، وہیں سے اُڑتے ہیں اور وہیں لوٹ آتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا کہنا ہے:۔

"ہر چند کہ نیاز کے افسانوں کی فضا عموماً رُومانی ہے۔ لیکن نیاز کی رُومانی دُنیا حقیقی دُنیا سے الگ تھلگ نہیں ہوتی۔ حُسن و عشق کے رُومان پرور تذکروں میں وہ آسمان کی طرف اُڑنے کی مصنوعی کوشش نہیں کرتے۔ اِن کی نظر بلند ضرور ہوتی ہیں لیکن قدم زمین پر جمے رہتے ہیں[1]"۔

گویا رُومانیت، داستان گوئی کی روایت، تخیّل کی اُڑان، اور جذبے کی شدت کے باوجود نیاز زندگی کے حقائق کو نظر انداز نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں رُومانیت اور حقیقت کا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ وہ بے شک دیوی، دیوتاؤں کے قصّے بیان کریں مگر اُن کا عمل اور ردِّعمل ہمارے اِردگرد کے اِنسانوں کا سا ہے۔ نیاز نے اعتراف کیا ہے[2] کہ وہ مغربی افسانہ نگار وکٹر ہیوگو، ولیم ہیزلٹ اور آسکر وائلڈ سے بہت متاثر ہیں۔ وکٹر ہیوگو کی عمیق جذباتی فضا، ہیزلٹ کے اندازِ بیان کی چُستی و رنگینی، اور آسکر وائلڈ کا منطقی PARADOX کا انداز اُنہیں پسند تھا۔ نیاز ٹیگور سے بھی متاثر ہیں مگر خالص ٹیگور کے انداز میں اُنہوں نے کبھی لکھنے کی کوشش نہیں

[1] نیاز کی زندگی، شخصیت اور فن۔ نگار سنہ ۱۹۸۲، شمارہ ۵-۶، ص ۴۲

[2] یلدرم اُن کے ساتھی اور رُومانی افسانہ نگاری۔ نگینہ شہ یلدرم نمبر ص ۱۱۸

کی۔ مہدی افادی اور ابوالکلام آزاد کے اثرات بھی قبول کئے مگر اُن کا انفرادی رنگ اُن کی نفاست و نزاکت، اُن کا فنکارانہ لہجہ اُن کی پہچان و شناخت ہے۔

نیاز کے رُومان میں سُکون کم اور اضطراب زیادہ ہے۔ شاید اس لئے کہ ہر وہ ذہن جو عام ڈگر سے ہٹ کر سوچتا ہے، جس کے اندر کُچھ "تابندہ" ہے، وہ زیادہ بے چین و مضطرب ہوتا ہے۔ سُکون کی حالت میں بھی سُکون محسوس نہیں کرتا۔ نیاز کے ہاں بھی ایسی ہی کیفیت ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ پُرسکون فضا میں، فطرت کے حسین نظاروں میں، ٹھنڈی ہواؤں، اُڑتے بادلوں اور گاتے پرندوں کے سنگ بھی ہماری طبیعت بے چین سی رہتی ہے۔ نیاز کے لفظوں کی نرگسیت ہم پہ بھی طاری ہو جاتی ہے۔ سُکون و اضطراب ساتھ ساتھ چلتے ہیں تو دِل کی دھڑکن اور سانس ناہموار سی ہو جاتی ہے۔ یہ سُکون و اضطراب ساتھ ساتھ چلتے ہیں تو ارد گرد کے ماحول کا ذرّہ ذرّہ رُومان میں ڈوب جاتا ہے۔ اِن چمکیلے ذرّوں سے نیاز ایسی خوب صورت، دلکش، چمکتی دمکتی دُنیا آباد کرتے ہیں کہ پتھر اور بے جان چیزیں بھی گاتی اور رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ نغمہ ایسا کہ رُوح کی گہرائیوں میں اُتر کر سرمستی و سرشاری کا عظیم تحفہ بخشے۔ رقص یُوں کہ ہر ہر تال پہ ہماری اپنی رگ رگ ناچنے لگے۔ گرد و پیش سے بے خبر ہم ایسی دُنیا میں گُم ہو جائیں جو یہ دُنیا نہ ہو بلکہ ماورائی ماورائی ہو، تصوّراتی و تخیّلاتی ہو، مگر اس کے اودے پیلے، نیلے رنگ ہماری دُنیا سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ دو دُنیاؤں کا حسین امتزاج ہمیں ترفع دیتا ہے کہ ہماری رُوح فضاؤں میں پرواز کرنے لگتی ہے۔

رُومانوی فن کاروں کے ہاں عورت اور اُس کا تذکرہ ایک خالص، دلکش و پُرکشش انداز میں ملتا ہے۔ نیاز کے ہاں عورت ایک طلسم، ایک جادو، ایک مدھر نغمہ، الوہی نُور اور ایک مسحور کُن خوشبو ہے۔ وہ رُوح لطافت اور پیکرِ جمال ہے۔ اُس کے بغیر کائنات اُداس، سُونی اور اُدھوری ہے۔ کائنات کا حُسن اُسی کے دَم سے ہے۔ نیاز کے خیال میں عورت ہونا خود ایک حُسن ہے اور کوئی عورت غیر حسین ہو ہی نہیں سکتی۔ عورت لذت مجسّم، سحر و طلسم، نور و نغمہ ہے۔ روشنی ہے

نکہت ہے، موسیقی ہے، شیرینی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عورت محبت ہے۔ ایسی محبت جو بے لوث، پُختہ، پائیدار، لازوال اور آفاقی ہے۔ وہ وفا کی دیوی اور صبر و ضبط کا مجسّمہ ہے نیاز کا کوئی افسانہ عورت سے محبت اور احترام سے خالی نہیں۔ اُنہوں نے اُسے چاہا ہی نہیں بلکہ اُس کی پوجا و پرستش کی ہے جیسا کہ عائشہ خان لکھتی ہیں:

"کون سا افسانہ ایسا ہے جو عورت کے بیان سے خالی ہو۔ دُنیا نے اس سے محبت کی ہے لیکن نیاز نے عورت کو چاہا نہیں بلکہ اس کی پرستش کی اوروں نے اس سے عشق کیا صرف عورت سمجھ کر، نیاز نے اس کی پوجا کی اُسے دیوی سمجھ کر[1]"

نیاز کے خیال میں محبت اور عورت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ عورت اور محبت کتابِ حیات کے دو الگ الگ باب نہیں۔ زندگی کا عرفِ احساسِ رفاقت کے جوہر سے نمو پاتا ہے۔ زندگی میں دلکشی، نزاکت و رعنائی، عورت کی رفاقت کے دَم سے ہی ہے۔ کہ جنت کی تمام رنگینیوں اور آسائشوں کے باوجود آدم کی اُداسی اِس بات کی شاہد تھی کہ اب خالقِ کائنات کسی ایسے وجود کی تخلیق کرے گا۔ جس کی خوشبو، محبتوں کے گلابوں کے سنگ، کائنات کی تمام تر اُداسیوں کا مُداوا ہو گی۔ عورت عظیم ہے ہر رُوپ میں۔ ماں، بہن، بیٹی، بیوی اور محبوبہ، ہر رُوپ میں وہ نور و روشنی، محبت و عظمت، پاکیزگی و خوب صورتی ہے۔ وہ فرشتوں سے زیادہ معصوم اور حُوروں سے زیادہ پاک ہے۔ کائنات کا نظامِ عمل اُسی کے دَم سے جاری و ساری ہے۔ عورت کی عظمت و پرستش کا یہ رویّہ نیاز کے تمام تر افسانوں کی بُنیاد ہے۔ وفا کی اِس جانثار پُتلی کے سامنے وہ سجدہ ریز ہیں۔ محبتیں اُسی کے دَم سے ہیں۔ اُس کی مسکراہٹ سے پھول کھلتے ہیں تو اُس کی اُداسی خزاں کی زردی سے زیادہ حسرت ناک فضا کو جنم دیتی ہے۔ دُنیا بھر کے لٹریچر کا محور ہمیشہ عورت کا

[1] "مصنف نازک اور نیاز فتح پوری" نگار "نیاز نمبر حصہ اوّل ص ۱۹۴

وجود رہا ہے۔ تمام تر رونق اُسی کے دم سے ہے۔ بہت سے اعتراضات کے باوجود اُس
کی عظمتوں کو سلام، جیسا کہ خود نیاز نے کہا ہے:-

"سب سے بڑا اعتراض جو اس نوع کے لٹریچر پر کیا جاتا ہے کہ اس میں عورت اور اس کے متعلقات کا ذکر عنصر غالب ہے لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عورت اور اُس کا ذکر نکال دینے کے بعد آپ کے پاس کیا رہ جائے گا کائنات میں کون سی دوسری چیز ایسی ہے جس سے آپ اُس کی رونق قائم کر سکیں۔"[له]

عورت نیاز کے افسانوں کی رونق ہے۔ محبت اور عورت کی جیسی دل فریب، دل رُبا اور رنگین تصویریں اُن کے افسانوں میں نظر آتی ہیں، اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتیں۔

نیاز کے افسانوں کا زیادہ تر موضوع حُسن و عشق ہے۔ ابتدا میں اُنہوں نے یونان، مصر اور قدیم عرب کی عشقیہ داستانوں کو اپنا موضوع بنایا۔ دیوی، دیوتاؤں کے قصے لکھے۔ یہ قدیم رنگ اُن کے ہاں عجیب بہار دکھاتا ہے۔ صنم الاصنام اور دیومالائی قصے نئے رنگ اور نئے رُوپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ اِن میں حقیقت پس منظر میں دکھائی دیتی ہے۔ کہ اُن کے کردار عام انسانوں کی طرح چلتے پھرتے اور محسوس کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ خوب صورت باتیں اور خوب صورت نظارے ہماری اپنی دُنیا کے ہیں۔

مجموعی طور پر نیاز کے افسانوں کے پلاٹ سادہ، گٹھے ہوئے اور جُڑے ہوتے ہیں۔ باتیں نئے انداز اور نئے اطوار سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ مگر بعض اوقات لفظوں کے طلسم پہ نیاز اپنا پورا زورِ بیان صَرف کر دیتے ہیں۔ لفظوں کے چمکیلے اور بھڑکیلے سیلاب کے قفس میں قاری کی حیثیت ایک قیدی پرندے کی طرح ہوتی ہے مگر جب وہ لفظوں کے اِس سحر سے آزاد ہوتا

له: مکتوبات نیاز ص ۳۰، نگار دسمبر ۱۹۴۲ء

ہے تو مطلب کی بات کم نکلتی ہے۔ یہ باتیں بعض اوقات بہت طوالت اختیار کر جاتی ہیں جن سے افسانہ کا فن مجروح ہوتا ہے۔ اِن کے افسانوں کے پلاٹ اکثر تخیلاتی ہیں۔ مگر تصوراتی و تخیلاتی دُنیا کے باوجود اُنہوں نے اُس دُنیا کو نظر انداز نہیں کیا کہ جس میں وہ سانس لے رہے ہیں۔ حقیقت کی اِس دُنیا میں آکر اُنہوں نے بہت سے گھر کھلے پہلوؤں پر اپنے زہریلے، بے باک اور نڈر قلم سے ایسا آپریشن کیا کہ فاسد مادہ بہہ نکلا۔ یُوں اُنہوں نے بہت سے معاشرتی، اصلاحی افسانے بھی لکھے ہیں جو کھوکھلی اقدار و روایات اور منافق رویّوں کے خلاف بھرپور جہاد ہیں۔ نیاز نے سماجی معاشرتی واقعیت کو مستحکم اور پائیدار بنایا۔ ایسے افسانوں میں ہندوستان کی عام معاشرت اور اُس معاشرت کے عام کردار ہمیں نظر آتے ہیں۔ اِن اصلاحی و سماجی افسانوں میں بھی وہ اُتنے ہی کامیاب و کامران ہیں جتنے کہ رُومانی افسانوں میں۔ تخیّل آفرینی کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری میں بھی باکمال ہُنرمندی، اور چابک دستی سے کام لیتے ہیں۔ مگر عام طور پہ عصری حقائق تخیّل و تصوّر کی طلسماتی دُنیا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اِس طلسماتی دُنیا سے باہر آتے ہیں تو افسانوں میں زمانی و عصری حقیقتیں اپنے تمام تر سیاق و سباق کے ساتھ ملتی ہیں۔ مسرت و نشاط، سرمستی و سرشاری، اور بے خود کرنے والی کیفیتوں کے ساتھ ساتھ، معاشرتی ناہمواریوں پہ طنز و تشنیع کا انداز بھی ملتا ہے۔ نیاز کے افسانوں کی "بنیاد کیا ہو سکتی ہے" کی بجائے کیا ہونا چاہیئے" پر ہے مگر "باید" کا یہ عنصر خالصتاً مقصدی و اصلاحی نہیں بلکہ رُومانی لذت، کو فراوانیٔ شوق، اور آرزوئے بے تاب میں پلٹا ہے تحیر مسرت و کیف کو جنم دیتا ہے جیسا کہ سیّد وقار عظیم لکھتے ہیں:-

نیاز کا فن اسی لذّت کا فن ہے۔ لیکن اس لذّت کے مہیا کرنے میں اتنی بہت سی چیزوں کا حصہ ہے کہ ہم اس فن کو شوقِ فراواں اور آرزوئے بے تاب کا فن بھی کہہ سکتے ہیں اور کلیوں کی نیم خوابی اور پھولوں کی بیداری کا فن بھی۔ یہ نغمۂ مسرّت کی جھنکار کا فن بھی ہے اور سوز و گداز کی خاموش پکار کا فن بھی۔[له]

گویا نیاز کے ہاں رُومانیت اپنے عروج پہ نظر آتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ حقیقتوں پہ بھی کمندیں ڈالتے ہیں۔ شاخ پہ کھلے ہوئے گلاب کی خوشبو سے بھی مخمور ہوتے ہیں اور اُس زمین اور مٹی پر بھی اُن کی نظر ہے جس میں گلاب کا یہ پودا اپنی جڑیں پھیلائے ہے۔ اُن کا فن رات کی رانی کا فن ہے کہ وہ رات میں شبنم کی طرح کھلتے ہوئے پھولوں کے گچھوں کے حُسن و خوشبو سے بھی لُطف اُٹھاتے ہیں اور یہ بھی سوچتے ہیں کہ یہ ننھے مُنے پھول دن میں کیوں نہیں کھلتے؟

یُوں حقیقت و رُومانیت سنگ سنگ چلتے ہوئے ہمیں اُس فضا میں لے جاتے ہیں جو دلکش بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ منتہا یا نقطۂ عروج اس دلکشی و معنی خیزی میں مزید اضافہ کرتے ہیں کلائمکس یا نقطۂ عروج افسانے کا حُسن ہے۔ جہاں سے کہانی اپنے انجام کی طرف مُڑتی ہے واقعات کے گورکھ دھندے ایک مقام پر آپس میں یوں اُلجھ جاتے ہیں کہ قاری خود اُلجھ جاتا ہے۔ وہ دم بخود سانس روکے سوچ رہا ہے کہ آگے کیا ہوگا! یہیں سے کہانی فوری طور پر اپنے منطقی اور فطری انجام کی طرف بڑھتی ہے۔ افسانہ نگار کو اس موقع پہ خاص احتیاط و توجہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ منتہا گویا اُس کی فنکارانہ نفاست کی آزمائش ہے۔ یہیں اُس کے ذوقِ تخلیق کا امتحان ہے کیونکہ کہانی ہوا کی ہتھیلی پہ چپکے ہوئے بے نام حرف نہیں بلکہ اُس کا لفظ لفظ زندگی کے ان گنت جاندار پہلوؤں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ جہاں تک نیاز کا تعلق ہے تو اُن کے بے شمار افسانے تاریخی حقائق، یونانی اور دیومالائی پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ مرکزی قصّے سے اکثر و بیشتر ہم آگہی رکھتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود دنئے اور خوب صورت پس منظر میں واقعات کو یُوں آگے بڑھاتے ہیں کہ اُن کا نیا اور البیلا پن اُبھر آتا ہے۔ قاری اپنے اندر ایک سنسنی سی محسوس کرتا ہے۔ اُس کی رگوں میں دوڑتا ہُوا خون تیزی سے گردش کرنے لگتا ہے۔ آنکھوں میں تارے چمکنے لگتے ہیں اور وہ اُلجھے ہوئے واقعات کو فوری طور پہ ترتیب و سلیقہ سے دیکھنا چاہتا ہے۔

افسانہ نگار کی کامیابی یہ ہے کہ اُس کا آخری سُر اُسی مُحورکُن اور فنکارانہ دلکشی کی لے پر ختم ہو جس سے کہ شروع ہُوا تھا۔ نیاز کے ہاں یہ فنکارانہ حُسن موجود ہے۔ یہاں محبت کسی

سماجی پابندی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ عظیم ترین جذبہ تلاطم میں ساحل ہے جیسے مادی عنصر کم ہے مگر پھر بھی روح اور جسم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ رفتہ رفتہ بات میں ہیجان و اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ دو ادوار اثرات اور تاثرات مزید کشش پیدا کرتے ہیں۔ نیاز نے انسانی کو ہم اُس شے ہے۔ ساکن پانی کی مانند قرار دے سکتے ہیں جس کی تہ میں غضب کا جوش چھپا ہوا ہوتا ہے۔ جو جذبہ کا طوفان آتا ہے تو اس میں خس و خاشاک کی طرح سب کچھ بہہ جاتے ہیں۔ یہ عنصر اُسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب انسانی ذہن اور نفسیات سے پوری واقفیت ہو جب انسانی ذہن میں ایسی متحرک اور ساکن ہر سوچ سے فنکار آگاہ ہو۔ وہ شعور کی منطقی سطح اور لاشعور کی خواب سی فضاؤں دونوں کا تجربہ رکھتا ہو۔ نیاز انسانی جذبات و ذہنی نفسیات دکھانے سے مکمل آگہی رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں منتہا کا حُسن اسی میں ہے۔ وہ حقیقی تواتر کی بجائے جذباتی جوش و خروش کو پیدا کرتے ہیں۔ یہیں سے کہانی اپنے انجام کی طرف بڑھتی ہے۔ جو فطری بھی ہو اور منطقی بھی۔ اکثر ایسے چونکا دینے والے بھی ہیں جو پڑھنے والے کو ایک سوچ، ایک فکر دے دیتے ہیں منتہا اور انجام کے درمیان کم سے کم فاصلہ افسانہ کے حُسن کو بڑھاتا ہے۔ نیاز کے ہاں یہ حُسن اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ نیاز کے حُزنیہ افسانے طربیہ افسانوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب و مؤثر ہیں۔ ان کے نقوش میں دُکھ کی جو گہری پرچھائیاں ملتی ہیں اُن میں زیادہ دل آویزی اور جاذبیت ہے۔ محبتوں کے پیاسے جذبے، ذہنِ انسانی میں وہ ارتعاش پیدا کرتے ہیں کہ دل دُکھ کے ساگر میں ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ کسک، اُلجھن، ادھورے جذبوں اور ٹوٹے شکستہ دل کی صدا کا اپنا ہی ایک حُسن ہے۔ یہ حُسن بڑی نفاست و نزاکت کے ساتھ نیاز کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔

نیاز کے افسانوں کی ابتدا بھی دلچسپ ہے اور انتہا بھی۔ حالانکہ اکثر افسانے یا تو انگریزی عربی سے ترجمہ ہیں یا تاریخی حقائق و علم الاصنام سے ماخوذ ہیں۔ نیاز کے توانا، ہنرمند ہاتھوں نے بڑے سلیقے و قرینے سے اُنہیں ترتیب دیا ہے۔ اکثر افسانوں میں فطرت اُبھر کر چاند سی

دوشیزہ کی طرح اٹھکیلیاں کرتی دکھائی دیتی ہے۔ سرسبز شاخوں پہ چٹکتی ہوئی کلیاں، کھلتے ہوئے رنگ برنگے پھول، ٹھنڈی معطر ہواؤں کے جھونکے، نیلی فضاؤں میں گیت گاتے پرندے، چاندی سی جھرنوں اور آبشاروں کی موسیقی، درختوں کی شاخوں سے لپٹی ہوئی نازک بیلیں، اور ایسے میں دو محبت بھرے دل، محبت کے ساتھ، خدا کے سامنے جھکے ہوئے ہیں کہ اُن کا خدا محبت ہے۔ یہ رنگین، نشاط انگیز، رُومانی لمحے ہمیں اپنی گرفت میں جکڑ لیتے ہیں۔ جو نیازؔ کو اعلیٰ درجے کا رُومان نگار ثابت کرتے ہیں۔ اسی رُومانیت میں جیتے جاگتے کردار سب سے بڑا سچ ہیں۔

کردار کسی بھی کہانی کا جزوِ لاینفک ہیں۔ کہانی نویس واقعات کا تانا بانا کرداروں کے گرد ہی بُنتا ہے۔ کردار جتنے انسانی اور فطرت کے قریب ہوں گے، اُتنی ہی ہماری کشش اُن میں بڑھے گی۔ افسانہ نگار، کسی کردار کی زندگی کا نچوڑ اور اُس کے ذہنی و نفسیاتی گہرائیوں کو یوں پیش کرتا ہے کہ وہ ہمارے متحرک، سانس لیتی، اور دھڑکتی ہوئی زندگی کو منعکس کرتے ہیں۔ یہ کردار ہمیں حیاتِ انسانی کے حیرت انگیز رنگوں اور سوچوں کا پتا دیتے ہیں۔ مگر اُن کا حُسن اس میں ہے کہ وہ کٹھ پتلیاں نہ ہوں کہ افسانہ نگار جدھر دور گھمائے، اُدھر گھوم جائیں۔ اور جو ویسے اُس کی نقل کریں۔ نیازؔ کے کردار عام انسانوں کے کردار ہیں۔ اُنہی کی طرح سوچتے اور عمل کرتے ہیں تاہم وہ فطری کرداروں کے ساتھ ساتھ کچھ مثالی کرداروں کے بھی شوقین ہیں۔ جو اُن کی ذاتی سوچ، فکر اور طرزِ عمل کا عکس ہیں نیازؔ کا کمال بقول مجنوں گورکھپوری:۔

"اُردو افسانے میں کردار CHARACTER اور فضا ATMOSPHERE کا احساس پیدا کرنا اور واقعات سے زیادہ نفسیات کو اُجاگر کرنا، نیازؔ ہی کے قلم نے شروع کیا تھا۔ اُنہوں نے اُردو افسانے کو شخصیت و کردار دیئے[1]۔"

[1]۔ اُردو مختصر افسانے میں جدید میلانات مطبوعہ ادب اور زندگی ص ۲۳۴،
مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبر صدر کراچی

نیازؔ کے یہ کردار مکمل و بھرپور شخصیت کے عکاس ہیں۔ جن کی نفسیات سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔ وہ اُن کے ذہن اور فطرت کو بڑی فنکاری سے اُبھارتے ہیں۔ کرداروں کی نفسیات کے اَسرار و رموز، ان کی دلی کیفیات، جذبات و احساسات۔ ذہنی پریشانیاں اور اُلجھنیں ہمارے اردگرد کے زندہ انسانوں کی زندہ تصویروں کو پیش کرتی ہیں۔ دیوی، دیوتاؤں کے جذبات و احساسات بھی، انسانوں کے جذبات و احساسات ہیں۔ نیازؔ کے کردار ذہین ہیں، پڑھے لکھے ہیں خوب صورت خیالات رکھتے ہیں۔ اچھی گفتگو کرتے ہیں۔ مثبت کرداروں کے ساتھ ساتھ منفی کرداروں کی بھی کامیاب تصویریں ملتی ہیں۔ کہ انسان خیر و شر کا مجسمہ ہے اور زندگی صرف نفاست اور حُسن ہی نہیں بلکہ کثافت و بدصورتی بھی ہے۔ کرداروں کا ارتقا فطری انداز میں ملتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی کسی خاص کردار میں انقلاب و تبدیلی کی وہ ٹھوس وجوہات تلاش کرتے ہیں۔ مذہب کے جھوٹے ٹھیکے داروں اور نام نہاد مولویوں کے چہروں سے نقاب اُتارتے ہوئے نیازؔ کا قلم بہت نوکیلا اور زہریلا ہو جاتا ہے۔ تاہم مثالی کرداروں کی تخلیق میں وہ قلم کا پورا زور صرف کر دیتے ہیں اُن کی سوچ، فکر، ذہانت، پسند و ناپسند، سب نیازؔ کی اپنی شخصیت کی عکاسی ہے۔ وہ کردار بذاتِ خود بے نقاب ہوں یا نہ ہوں نیازؔ کی شخصیت کو ضرور منظرِ عام پر لے آتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:۔

"اُن کے کردار یا تو مُردہ ہیں یا خود نیازؔ کی شخصیت کا رُوپ ہیں۔ اِن کے جسم سوتے ہیں۔ صرف ذہن بیدار ہیں۔ وہ احساس کی بات کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ صرف اُن کی ذہانت اُن کی پوری شخصیت پر مستولی رہتی ہے۔ اِن کے کردار سب کے سب خود اپنی آگ سے خس و خاشاک ہیں۔ گویا اپنی آگ میں جلنا ہے کارِ مردانہ[1]۔"

[1]۔ "نیازؔ کا ادبی مرتبہ" مطبوعہ "نگار" جشنِ طلائی نمبر ۶۳-۱۹۶۲ء، ص ۲۰۸، ۲۰۹

نیاز کو ایسے ہی کرداروں سے محبت ہے۔ جو اعلیٰ درجے کی ذہانت اور توازن رکھتے ہیں، اس لیے عام کے راہی ہیں۔ مگر کبھی کبھار ان کی گفتگو عام انسانوں کی گفتگو نہیں رہتی۔ اُن کے پردے میں نیاز خود بولتے ہیں۔ اور اُن کی باتوں کو تمام تر گہرائیوں کے ساتھ سمجھ لینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں کسی بھی شخصیت اور کردار کو سمجھنے میں اُس کی گفتگو یا مکالموں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ لفظ ذہن و شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ کرداروں کی نفسیات اُن کے مکالموں میں پنہاں ہوتی ہے۔ ساتھ ہی یہ فنکار کی ذہنی صلاحیتوں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ عام طور پر نیاز اپنی مکالمہ نگاری میں خاصے کامیاب ہیں۔ کہانی فطری انداز میں آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ فطرت کے خوبصورت بہاؤ میں گفتگو عام انسانوں کی زبان میں ہی ہوتی ہے۔ تاریخی افسانوں میں یہ عنصر خاص طور پر غالب ہے۔ بہت سے موضوعات سے متعلق معلوماتی گفتگو بھی ملتی ہے۔ مگر کہیں کہیں یہ مکالمے طوالت اختیار کر جاتے ہیں۔ عام گفتگو کی بجائے تقریر کا انداز ملتا ہے جس سے افسانے کا فن مجروح ہوتا ہے۔ مگر یہ رویہ وہاں ملتا ہے جہاں نیاز اپنے آپ کو اسٹیج پر لانا چاہتے ہیں، ورنہ وہ پس پردہ عام زبان ہی میں گفتگو کرتے ہیں۔

منظر نگاری اور جزئیات، یوں تو ہر تخلیق کا حصہ ہیں۔ مگر رومانی افسانوں میں ان کا حصہ زیادہ قوی اور جاندار ہے۔ فطرت کے حسین نظارے، رومانی افسانوں میں خاص فضا کو پیدا کر کے سوئے ہوئے جذبات کو جگاتے ہیں، اور دلوں میں تڑپ پیدا کرتے ہیں۔ نیاز نے ان مناظر کی تصویریں رنگ و برش سے کھینچی ہیں۔ وہ افسانہ نگار سے زیادہ مصور معلوم ہوتے ہیں وہ ضرورت کے مطابق اُودے، ہرے، نیلے، بسنتی، لال، دھانی رنگ بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ کس مقام پہ کون سا رنگ کس توازن سے آنا چاہیئے۔ وہ زمان و مکان کا پورا احساس دلاتے ہیں۔ ماحول اور فضا کو اس طرح سامنے لائیں گے کہ لفظ لفظ حقیقی مناظر کی عکاسی کرے گا۔ یہ متحرک اور خوبصورت تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتی چلی جاتی ہیں۔ جنگل کی کھلی فضا ہو یا کسی بادشاہ و ملکہ کا دربار، کسی خلوت نشیں کا گوشہ ہو یا مصر کا بازار، ہر منظر اپنی پوری آب و تاب اور حقیقی خوبصورت رنگوں کے ساتھ دکھائی دیتا

ہے۔ بناوٹ و تصنع کی تیز چکا چوند روشنیاں نہیں بلکہ چاندنی کی ٹھنڈک، اور مٹی کی باس ہر جگہ ملتی ہے۔

منظر نگاری کی کامیابی، جزئیات کا صحیح رکھ رکھاؤ ہے۔ نیاز کا ذہن باریک بین تھا وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ عام طور پہ جزئیات سے افسانے کا فن قدرے مجروح ہوتا ہے کیونکہ اختصار اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر ایسے فنکار جن کا قلم با اعتماد باوقار ہے وہ اس کٹھن مہم کو بھی آسانی سے سَر کر لیتے ہیں۔ نیاز ذہین بھی ہیں اور بااعتماد بھی انہیں علم ہے کہ کتنا منظر کہاں دکھانا ہے۔ اور کتنی باتیں پردے کے پیچھے مخفی رہنا چاہئیں نیاز بے جا تفصیلات میں نہیں پڑتے، مگر اشاروں، کنایوں سے خوبصورت نقاشی کرتے ہیں۔ کسی منظر کو سامنے لانا ہو یا کسی کردار کے ذہن کو، وہ چھوٹے چھوٹے اشاروں سے بڑی خوبصورت باتیں کریں گے۔ ان کی یہ باتیں جب فنکارانہ اُسلوب اور انشاپردازی میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں تو کہانی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

نیاز کا اُسلوب زندہ و متحرک ہے۔ اُن کے افسانوں کی سب سے نمایاں خصوصیت اُسلوب بیان کی دلکشی اور انشاپردازی ہے۔ جو شعر و نغمہ، رقص و سرود، موسیقی و ترنم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس شعر، نغمگی، موسیقی اور ترنم کے حُسن سے ہر پڑھنے والے پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بات کو سجا بنا کر کہتے ہیں جو رُومانیت کے علمبرداروں کا خاصہ ہے۔ الفاظ کی آرائش، اور لفظ کا سحر ساری ہمیں اپنے طلسم میں بہائے جاتا ہے۔ نیاز کے اُسلوب میں سُرور و انبساط پایا جاتا ہے۔ اُلجھا ہُوا انداز نہیں۔ بلکہ لفظوں کے ستارے جگمگ جگمگ کرتے شوخی و اٹکھیلیاں کرتے، مسکراتے اور شرارتیں کرتے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ نیاز کی بند مُٹھی میں لفظوں کے جگنو بند ہیں۔ وہ جب چاہتے ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں، اپنی بند مُٹھی کھول دیتے ہیں۔

نیاز کا اُسلوب خوبصورت و دلکش ہے۔ جس میں زندگی ہے۔ حرکت ہے۔

جوش ہے۔ جنون ہے۔ خشکی اور بے رونقی نہیں۔ بلکہ لفظوں کا خوب صورت میلا لگا ہوا ہوتا ہے۔ نئی نئی تشبیہات و استعارات۔ نئی ترکیبیں۔ نیا آہنگ۔ گھلے ہوئے رنگا رنگ کی نمائش کرتا ہے۔ بقول عبدالقادر سروری:-

"نیاز کے قصّوں میں سب سے پہلی شے اُسلوب بیان کی شگفتگی ہے جو سارے قصے کو پُر رونق بنا دیتی ہے۔ چُست بندشیں۔ دلکش ترکیبیں۔ الفاظ کی ترتیب اور موسیقیت۔ ان کے اُسلوب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ان کی پیدا کردہ رُومانوی فضا میں ہم صداقت کی کمی محسوس کرنا بالکل بھول جاتے ہیں۔ وہ یہی سب سے زیادہ تعریف کسی ادبی کارنامے کی ہو سکتی ہے کہ جب وہ سامنے ہو تو کوئی دوسری شے سامنے نہ ہو۔"[1]

یہ بات یقیناً درست ہے۔ نیاز کا اسلوب ہی لفظوں کے خوب صورت جال میں قید کر لیتا ہے۔ یہ اُسلوب بہت رنگا رنگ اور متنوع ہے۔ جیسا موضوع ہو ویسے ہی رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ خوب صورت تشبیہات و استعارات اس کا زیور ہیں جو نہایت تناسب و توازن کے ساتھ اثر و تاثیر کو بڑھاتی ہیں۔ جذبات کی شدت میں کہیں کہیں خطیبانہ رنگ بھی ملتا ہے۔ نیاز اظہاریت پسند EXPRESSIONIST ہیں۔ لفظوں کے انتخاب میں بہت احتیاط پسند ہیں۔ لفظوں کا خوب صورت استعمال کوئی نیاز سے سیکھے۔ رُومانی تحریک کے نقوش دُھندلے پڑ گئے۔ آئندہ اس کے امکانات ہوں یا نہ ہوں مگر نیاز کی انشاپردازی اور طرزِ نگارش سے اہلِ ادب و معنی نے بہت کچھ سیکھا۔ جب تک اُردو زبان زندہ ہے اس طرزِ نگارش کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نیاز کا یہ رنگ اُن کے پہلے افسانے سے لے کر آخری افسانے کے طویل سفر کا محیط ہے۔

۱۔ دُنیائے افسانہ ص ۱۰۶، طبع اوّل ۱۹۵۱ء مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیق کے مطابق نیاز نے اپنا پہلا افسانہ "ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر" ۱۹۱۳ء میں لکھا تھا۔ یہ افسانہ جنوری ۱۹۱۵ء کے "نقاد" آگرہ میں شائع ہوا۔ جو آگرہ کی نمائش کے ایک منظر سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ اس مختصر سے افسانے میں حُسن و عشق کی کیفیات بھرپور انداز میں ملتی ہیں۔ ایک حسین پارسی دوشیزہ کی ہوش اُڑا دینے والی تصویر افسانہ نگار کے قلب و ذہن کو فنا کیے دے رہی ہے۔ اُس کے دل پر اس حسین دوشیزہ کی تصویر نقش ہو گئی ہے جس سے اُس کی رُوح پاش پاش ہو رہی ہے:-

"میری روح ٹوٹ ٹوٹ کے پاش پاش ہو کے اپنے قفسِ عنصری سے نکل رہی ہے۔ جس کو شعلۂ حُسن جلائے ڈالتا ہے۔ اور یہ فلک بوس ہو کے اُس کے نازک قدموں کے نیچے پس پس کے فنا ہو رہی ہے۔"[1]

مگر عاشق کا دل صادق ہے۔ اس کی رُوح جہاں اس پارسی دوشیزہ کے خوب صورت پیکر سے بکھر رہی ہے۔ وہاں اُس کا دل اُسے پانے کے لئے بےچین ہو رہا ہے۔ سوزِ محبت اُسے جلائے اور تڑپائے جا رہا ہے لیکن وہ چاہنے والے سے دست بُرد ہو جاتا ہے کہ:-

"خدا کرے تیری شگفتگی قائم رہے، تو خوش رہے، تجھ کو یہ تیری سحر آگینی مبارک رہے، مجھ ایسے مجھ ایسی مجروح روح والے لاکھوں روز تیرے اس حسن و شباب پر قربان ہوتے ہیں۔"[2]

یہ مختصر افسانہ حُسن و عشق کی کیفیات سمیٹے ہے۔ اُس دور کے اعتبار سے عورت سے محبت کا برملا اظہار یقیناً ایک نیا موضوع ہے۔ اُسلوب مرصع و رنگین ہے۔ لفظ لفظ گُداز میں ڈوبا ہوا ہے اور دلکش ہے۔ اور یہ پیشن گوئی کر رہا ہے کہ نیاز کا قلم آگے چل کر ایک عظیم رُومانوی

۱۔ "نگار" افسانہ نمبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۷

۲۔ "نگار" افسانہ نمبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۹

۳۔ "نگار" افسانہ نمبر ۱۹۸۱ء، ص ۳۰

افسانہ نگار کا قلم ہوگا۔

اب تک نیازؔ کی افسانہ نگاری کا ایک عمومی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ افسانوی مجموعوں یا خاص خاص افسانوں کے کرداروں، موضوعات، اسالیب، اور ماحول اور اُن کے اثرات پر تجزیاتی بحث نہیں کی گئی۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر افسانوی مجموعے پر الگ الگ بحث کی جائے اور نیازؔ کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں کو ذرا تفصیل سے واضح کیا جائے۔ اُردو افسانے کی تاریخ میں نیازؔ فتح پوری ایک اہم نام ہے۔ اُنہوں نے موضوع اور فن خصوصاً رومانوی انداز و اُسلوب کے اعتبار سے اُردو افسانے پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ایسے نقوش، جنہیں اُردو افسانے کے اوّلین نقوش کہہ سکتے ہیں۔ اور جس کی پیروی اُن کے بعد کے بہت سے افسانہ نگاروں حتیٰ کہ مجنوںؔ گورکھپوری تک نے کی ہے۔ کتابی صورت میں اُنہوں نے اُردو کو دو طویل ناولٹ

(۱) ایک شاعر کا انجام

(۲) شہاب کی سرگزشت

دیتے ہیں البتہ مختصر افسانوں کے پانچ مجموعے

(۱) نگارستان

(۲) جمالستان

(۳) نقاب اُٹھ جانے کے بعد

(۴) حُسن کی عیّاریاں اور دوسرے افسانے

(۵) شبنمستان کا قطرۂ گوہرین

اُن کے یادگار ہیں۔

ایک شاعر کا انجام | نیازؔ کی افسانوی دُنیا کا سفر بہت ہمہ گیر اور رنگا رنگ ہے۔ یہ رُومان کی پُرکشش اور جمالی دُنیا سے شروع ہُوا۔ اور جب اپنے عروج پر پہنچا تو اُردو ادب کی خدمت میں دو ایسے منفرد تحفے بعد نازو نیاز پیش کر گیا جس

کی کوئی روایت اُردو میں موجود نہ تھی۔ میری مراد ”ایک شاعر کا انجام“ اور ”شہاب کی سرگزشت“ سے ہے جنہیں طویل مختصر افسانہ ”مختصر ناول“ یا ”ناولٹ“ کہا گیا ہے۔ افسانے سے زیادہ یہ ”مختصر ناول“ یا ”ناولٹ“ کہلانے کے مستحق ہیں۔

”ایک شاعر کا انجام“ اوّل اوّل دسمبر ۱۹۱۳ء میں عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد۔ دکن کی جانب سے شائع ہُوا۔ اپنے موضوع اور اُسلوب کی وجہ سے اِسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اِس کے بعد اِس کے مختلف ایڈیشن نکلے۔ میری نظر سے ”ایک شاعر کا انجام“ کے جو ایڈیشن گزرے وہ کچھ یُوں ہیں:

۱۔ ”ایک شاعر کا انجام“ دسمبر ۱۹۲۷ء نگار بُک ایجنسی لکھنؤ۔
۲۔ ”ایک شاعر کا انجام“ ۱۹۳۴ء نگار بُک ایجنسی لکھنؤ۔
۳۔ ”ایک شاعر کا انجام“ جنوری فروری ۱۹۵۱ء نگار بُک ایجنسی لکھنؤ۔
۴۔ ”ایک شاعر کا انجام“ ۱۹۶۰ء نگار پاکستان کراچی۔ ۳۲

نثر کی اِس صنف میں مختصر افسانے اور ناول دونوں کے اجزا موجود ہیں۔ مختصر افسانہ اور ناول دونوں کا تعلق زندگی اور اُس کے مسائل سے ہے اِن میں کیفیت کا شاید اِتنا فرق نہیں جتنا کمیت کا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر احسن فاروقی کا کہنا ہے:-

”مختصر افسانے اور ناول میں وہی فرق ہوتا ہے جو کسی دریا اور سمندر میں ہے اور جس طرح سمندر کو محض دریاؤں کا مجموعہ نہیں کہہ سکتے اُسی طرح ناول کو مختصر افسانوں کا مجموعہ کہنا غلط ہے۔[1]“

گویا افسانہ ”مختصر“ اور ”ناول“ طویل ہوتا ہے۔ ”مختصر ناول“ یا ”ناولٹ“ افسانہ اور ناول کی درمیانی کڑی ہے۔ افسانے کو ضرورت سے زیادہ پھیلا دینے اور ناول کو کچھ حد تک سکیڑ لینے کے

---

[1] ”ناول کیا ہے“ ص ۱۸۹، مئی ۱۹۶۰ء، اشرف پریس۔ لاہور۔

فن کو "ناولٹ" کہا جا سکتا ہے۔ افسانے میں تخلیقی اظہار سمٹتا چلا آتا ہے۔ اور ناول میں اسی تخلیقی توانائی کا اظہار پھیلاؤ اور وسعت سے ہوتا ہے۔ "ناولٹ" ناول سے مختصر اور افسانے سے طویل ہے۔ اس میں سمٹتی ہوئی زندگی شدید و گہری ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول:

"ناول میں وسیع کینوس پر زندگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے تمام ممکنہ تفصیلات کو بروئے کار لاتے ہوئے، افراد اور ماحول کے باہمی عمل اور ردِّ عمل سے جنم لینے والے متنوع حالات اور گوناگوں کیفیات کا تفصیلی جائزہ لینا ہوتا ہے اس صورت میں بالعموم تخلیقی توانائی کا اظہار پھیلاؤ اور وسعت سے ہوتا ہے۔ لیکن جب کینوس محدود ہو تو پھر تخلیقی توانائی پھیلاؤ سے نہیں بلکہ گہرائی سے اظہار پاتی ہے۔ یہ گہرائی شدتِ تاثر کو جنم دے کر زندگی پر ایک مخصوص اور انفرادی زاویہ سے روشنی ڈالتی ہے۔ یہی ناولٹ کا فن ہے[1]۔"

گویا افسانہ کا حسن اختصار میں۔ ناول کا وسعت اور متنوع حالات و کیفیات میں اور ناولٹ گہرائی و شدتِ تاثر سے نمو پاتا ہے۔ تینوں کا مرکز و محور اور بنیادی موضوع زندگی ہے۔ افسانہ زندگی کی منتخب روشن کرنوں کا نام۔ ناول میں زندگی کی روشنیوں کا بہتا و بڑھتا ہوا سیلاب مگر ناولٹ میں کافی روشنیاں تو ہیں لیکن سیلاب کی مانند نہیں۔ یوں ناولٹ، افسانے کی ابتدا اور ناول کی انتہا کے درمیان ایک متوازن سیڑھی ہے۔ جس میں افسانہ سے زیادہ اور ناول سے کم تفصیلات ملتی ہیں۔

پلاٹ، کردار، مکالمہ، ماحول و منظر، زبان و بیان، افسانہ، ناول اور ناولٹ تینوں کے تکنیکی فنی عناصر ہیں۔ ناول نگار اپنی لامتناہی وسعتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہانی در کہانی، مرکب

---

[1] "افسانہ حقیقت سے علامت تک" ص ۱۲۵، بارِ اوّل ۱۹۷۶ء، مکتبہ عالیہ — لاہور

پیچیدہ پلاٹ پیش کر سکتا ہے۔ اس میدان میں اُسے پوری آزادی حاصل ہے۔ افسانہ نگار اور ناولٹ نگار کو یہ آزادی حاصل نہیں۔ ناولٹ میں گرچہ افسانہ کے مقابلے میں زیادہ وسعتیں ہیں یہی حال کردار اور مکالمہ نگاری کا ہے۔ افسانہ نگار کرداروں کا مختصر تعارف کراتا ہے۔ ناول لکھنے والا کرداروں کا ارتقا تمام تر جزئیات سمیت پیش کرتا ہے۔ مگر ناولٹ میں تعارف بھی ہے اور جزئیات بھی لیکن وہ تفصیل نہیں جو ناول نگار کو حاصل ہے۔ یہی تو یہ مکالموں میں ہوگا۔ ناول نگار موقع بہ موقع واقعات پر تبصرہ اور کرداروں کو الگ ہٹا کر ذاتی خیالات و نظریات کا اظہار کر سکتا ہے لیکن ناولٹ میں لفظوں کے سحر کو پھیلانے کی گنجائش زیادہ نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نیاز کے یہ دونوں تخلیقی تجربے "ایک شاعر کا انجام" اور "شہاب کی سرگزشت" نہ خالص مختصر افسانہ ہیں اور نہ خالص ناول بلکہ یہ طویل افسانہ یا مختصر ناول، ناولٹ کہے جا سکتے ہیں

اُنیسویں صدی کے ڈوبتے ہوئے سورج نے شامِ زوال کے باوجود ایک مبہوت کر دینے والی فضا کو جنم دیا۔ صنعتی ترقی اور سائنس کی عقل و مادی دُنیا نے جذبہ و رُوح، مذہب و وجدان کو ایک ٹھوس کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی۔ تخیّل و تصوّر کی جگہ فلسفہ و منطق نے لی۔ مادہ، رُوح پر حاوی ہونے کی فکر میں تھا۔ ہندوستانی معاشرہ میں بھی یہ اثرات آہستہ آہستہ سرایت کر رہے تھے۔ حیرت و استعجاب، اور رُوح مادہ کے اس محاذ پر ہمارا فن کار اپنا مضبوط قلم لے کر ڈٹا ہوا تھا۔ فن کار اپنے ماحول اور معاشرہ کا حصّہ ہے وہ اس سے کسی طور بھی الگ نہیں ہو سکتا۔ اس حیران کر دینے والی، برق رفتار فضا ہی میں نیاز نے یہ دونوں ناولٹ لکھے۔ جب مذہب و سائنس، فلسفہ و شاعری، عقل و جذبہ، مادہ و رُوح برسرِ پیکار تھے خالص جذبے، تصوّر اور تخیّل کی فضا میں فلسفیانہ اور منطقی و استدلالی نقطۂ نظر اپنی خاص جگہ بنا رہا تھا۔ یہی نیا نقطۂ نظر نیاز کا موضوع ہے۔ بقول سیّد وقار عظیم:

"نیاز کے یہ دونوں ناولٹ ایک بدلتے ہوئے ماحول کے بہترین مُرقع ہیں۔ بہترین اس اعتبار سے کہ ان دونوں مختصر ناولوں میں جو کہانی بیان

کی گئی ہے وہ اِس بدلتے ہوئے ماحول کے خارجی پہلوؤں کی مصوّری
کرنے کے بجائے اِس کی داخلی کیفیتوں کی عکاسی اور ترجمانی کرتی ہے[۲]"

داخل و خارج کا یہ سنگم انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ داخل و خارج انفرادیت اور اجتماعیت کے چوکور نے مِل کر ایک المیہ کو جنم دیا ہے جو "ایک شاعر کے انجام" کی شکل میں ہماری رُوح کے تار تک جھنجھوڑ دیتی ہے۔

"ایک شاعر کا انجام" ایک حسّاس و جذباتی شاعر افضال کی زندگی کا المیہ ہے۔ محبت اُس کے نزدیک ایک الوہی و لافانی جذبہ ہے، جو جسمانی لذت کا باعث بھی ہے۔ محبت جو فطرت کا حُسن، کائنات کی زندگی و رنگارنگی، جذبے و احساس کی مسجد، دل کی دھڑکنوں کی عبادت و پرستش، یہی دل کی دھڑکنیں، درد کی سروں پہ سفر کرتی ہوئی، رُوح کے تاروں کو چھوتی ہیں تو جسم تڑپ اُٹھتا ہے۔ یہی تڑپ افضال کی شخصیت کا بُنیادی وصف ہے۔ جسے نیاز کے "دل دیوانہ" نے اپنے ناولٹ "شکستہ پارہ ہائے آہ" کو سازِ بے خودی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افضال ایک حسّاس نوجوان جو ہر تاثر سے تڑپ اُٹھتا ہے۔ ہر حسین شے پہ مٹنے کے لئے آمادہ و منتظر، حساس شاعر اور فکر آمیز، میر کے شعروں پہ سر دُھنتا ہے۔ راتوں کو تنہا اور پُرمسرت انفعال میں، شعر و موسیقی کے عمانِ بے پایاں میں کسی مچھلی کی طرح اِدھر اُدھر تیرتا پھرتا ہے۔ گورے رنگ، خوب صورت بڑی بڑی آنکھوں اور دلکش کتابی چہرے والا افضال بے تحاشہ آنسو بہانے کا شوقین ہے۔ کہ روتا ہے تو پوری کائنات روتی اور کانپتی ہوئی نظر آتی۔ وہ ذہین بھی ہے اور حسّاس بھی۔ منفرد رہنے کا شوق اُسے تنہا کر دیتا ہے۔ اور زندگی کا ایک ایک حسین منظر اُس کے لئے بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ فطری طور پر باذوق شاعر ہے۔ خوب صورت گفتگو، شعر و نغمہ سے محبت، اور انفرادیت اُس کی شخصیت کا حُسن ہیں۔ وہ رُومان پسند ہے

۱: نیاز کے مختصر ناول "فن اور فن کار" ص ۱۰۵، بار اوّل ۱۹۶۶ء اُردو مرکز، لاہور
۲: "ایک شاعر کا انجام" ص ۱۳، ۱۴، بار اوّل ۱۹۹۰ء ادارہ ادب العالیہ کراچی ۱۸

بلکہ رُومانیت اُس کی فطرت اور خمیر میں شامل ہے۔ اِس لئے گفتگو اور لفظوں کی نزاکت و لطافت سے آگاہ ہے۔

"کھلا ہُوا پھول نکہت بیز ہوتا ہے مگر اس میں وہ شعریت اور موسیقیت کہاں، جو غنچۂ ناشگفتہ میں ہے۔ پھول کھل جانے کے بعد اپنی زندگی کا جلوۂ آخر ہے مگر غنچہ، جس کے انجام دیکھنے کی آرزو ہوتی ہے ایک دُنیائے اشتیاق ہے[۳]"

خوب صورت گفتگو کے ساتھ ساتھ خوش آواز خوش لحن ہے۔ ہارمونیم پہ جب با چشمِ نم رقیق لہجے میں یہ گاتا ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

تو پوری کائنات اُداس، خاموش اور پُرخلش نظر آتی ہے۔ یہی خوب صورت نازک مزاج حسّاس افضال جو چاہے جانے کی شدید خواہش رکھتا ہے، حمیدہ سے محبت کرتا ہے۔

حمیدہ نازک احساسات رکھنے والی، خوب صورت لڑکی، فطرت کے حسین نظاروں چاندنی راتوں اور بہتے جھرنوں کی شائق ہے۔ شاعری اور موسیقی اُس کی رُوح ہیں اور ایسی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے جس میں اُس کے کہنے کے مطابق:

"موسیقی ہی موسیقی ہو، سچی محبت والا شاعر، میرا ہمدرد ہو، اور میں فرطِ محبت میں صرف خاموشی سے اِس کی پُرصداقت اُلفت کا جواب دیا کروں[۴]"

حمیدہ ٹھنڈی ہُوا کا ایک جھونکا، ایک عطرِ عروس پھول، اور ایک مدھر نغمہ ہے۔ افضال

۳: "ایک شاعر کا انجام" ص ۱۷
۴: ایک شاعر کا انجام ص ۹

اُس کی تلاش میں نکلا مگر ڈھونڈھتے ڈھونڈتے خود کھو گیا۔ حمیدہ نامساعد مناکحت کے ظلم کا شکار ہوتی۔ شاعری، موسیقی اور خوشبو پہ جان دینے والی یہ نازک لڑکی جیتے جی مر جاتی ہے اُس کی رُوح پاش پاش ہو جاتی ہے:

" باریک ریشم کے دوپٹہ کو خاردار جھاڑی میں اُلجھاؤ اور پھر کھینچ کر دیکھو،
آہ، میری رُوح اِس سے زیادہ مجروح، اِس سے زیادہ پاش پاش ہے"[1]

کشیدہ قامت، مجسمہ حسن و عشق، ہیکل نزہت و نزاکت، حزیں و دلگیر، خلوص و وفا کی دیوی[2] اپنی سہیلی زبیدہ کے پاس چلی آتی ہے کہ گھٹ گھٹ کر سسکتی زندگی اُس کے بس میں نہیں رہی وہ سوگوار حُسن، بے خواب آنکھیں، مضطرب دِل، اُلجھے ذہن اور بھٹکتی متلاشی رُوح کے ساتھ افضال کی منتظر ہے۔ اپنے اِحساسات، تاثرات اور جذباتِ محبت کو اپنے سے بھی چھپائے رہنا چاہتی ہے۔ حجاب اِس قدر کہ اُسے اپنے قلب کا خود اندازہ نہیں۔ وہ محبت کا بارِ افضال کے کندھوں کو سونپنا چاہتی ہے۔ مگر کھویا ہُوا یہ راہی، مضطرب و بدحال ملتا ہے تو پیر مظفر صاحب کی چہیتی بیٹی رقیہ کو۔ جو فلسفۂ محبت کی گہرائی سے فی الحال آگاہ نہیں۔

رقیہ حُسن و خوب صورت، وارفتگیِ شوق، ذہانت و شوخی، شاعرانہ مزاج و ذوق کا شاہکار مجسمہ ہے۔ مگر وہ محبت کو صرف ایک لذت اور جذباتِ فانی کا انعکاس سمجھتی ہے۔ اُسے خبر نہیں کہ محبت ایک پرستش بے تاب، اِک لذتِ مضطرب اور اِک لُطف بے قرار ہے۔ یہ فلسفۂ محبت جس میں اِحساس کی شِدت، حسنِ فطرت کے نغمے گاتی اور دِلوں کو وجد میں لاتی ہے نیاز کا موضوعِ خاص ہے۔ رقیہ، افضال سے بے حد متاثر ہے۔ مگر پتھر کے اِس بُت میں حمیدہ کے کوئی جُنبش نہیں۔ رقیہ خود اِعتماد ہے اُسے اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا پورا پورا

[1] ؎ ایک شاعر کا انجام ص ۵
[2] ؎: ایضاً ص ۲۱

یقین ہے۔ اظہارِ محبت کے لئے مؤثر لفظوں کا سہارا ڈھونڈتی ہے۔ یہاں اُس کی ذہانت کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ خوب صورت لفظوں اور شاعرانہ ذوق سے افضال کو زیر کرتی ہے یہ شعر پڑھ کے افضال تڑپ اُٹھتا ہے۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے:

توقع جن سے تھی کچھ خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے[3]

افضال، چاہے جانے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ رقیہ اُس کی ناکام زندگی کا رُخ بدل دیتی ہے۔ افضال اب نازکن نہیں نازکش ہے۔ اب اُس سے التجا نہ کی جاتی بلکہ خود ملتجی ہے رقیہ روتے ہو طالب بن کر آئی مگر مطلوب بن کر گئی:

" ابتدائے گریہ میں وہ طالب تھی اور اِنتہائے گریہ میں مطلوب پہلا آنسو اُس کی آنکھ سے سراپا نیاز ہو کر نکلا تھا اور آخری اشک سراپا ناز ہو کر"[4]

رقیہ کی بے پناہ محبت نے، حمیدہ سے لگاؤ کو ایک سرابی جذبہ ثابت کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ مِل جاتی تو افضال وہیں فنا ہو جاتا کیونکہ اِس کی جبینِ نیاز سجدہ و پرستش کے لئے ایک آستانہ تلاش کر رہی تھی۔ مظفر صاحب کی خواہش پہ دونوں ہمیشہ کے لئے ایک ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے ناہموار راستوں پہ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے چل رہے ہیں۔ افضال کو اپنی زندگی کے ہم سفر سے انتہائی محبت ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہ حمیدہ کو کبھی یاد نہ کرتا کہ حمیدہ کے پیغام نے اُس کے جذبات و اِحساس کی دُنیا میں طوفانی ہلچل مچا دی، اُس کا سینہ

[3] ؎: "ایک شاعر کا انجام" ص ۴۱
[4] ؎: ایضاً ص ۵۴

شعلۂ مشتعل تھا جس نے رقیہ کے ارمانوں پہ بجلی گرادی۔ یہ سیّاحِ محبت، بیتاب و حزیں سینہ لئے آج وہیں لوٹ کے جارہا ہے۔ جہاں پہلا درسِ عشق لیا تھا۔ وہ حمیدہ سے، رقیہ کی عدم موجودگی میں ملنا چاہتا ہے کہ اُس کے مذہب میں جنسِ لطیف کو مغموم کرنے سے زیادہ اور کوئی گُناہ نہ تھا۔

حمیدہ کا دِل اُس کی بے نیازی اور سرد مہری پہ تڑپ اُٹھتا ہے۔ طوفانی سیلابِ تمنّا جب حسرتوں کے نخلک سیم دھتور میں ڈھلا تو حمیدہ بے جان و بے رُوح ہو گئی۔ رقیہ کی محبت نے افضال کے بازو پر مہرۂ طلسم باندھ رکھا تھا۔ زخمی دِل اور مضطرب رُوح لئے دونوں ایک دُوسرے سے رُخصت ہوتے ہیں۔ رقیہ کی بیماری اور پھر دردناک موت نے افضال کے حواسِ خمسہ میں ہلچل مچادی۔ اُس کے غم نے دیوانہ و نیم پاگل کر دیا۔ مگر دُکھوں کا یہ سفر زخمی رُوح کی یہ گردش اور مضطرب ٹوٹے دِل کی یہ ٹریجڈی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ حمیدہ کے ریل میں اچانک قتل کی خبر اُسے ہوش و خرد کی دُنیا سے بے گانہ کر گئی اور ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ یہ کہ :۔

"اُس کی دیوانگی ہی اُس کی حیات کی ضامن ہے۔ کیونکہ اگر اُس کو کبھی وقت ہوش آگیا تو اُس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے گی[لہ]"

"ایک شاعر کا انجام" دراصل نیاز کے فلسفۂ محبت کا عکّاس ہے۔ جس میں اُبلتے، شفاف جذبوں کا مرکز دِل بھی دھڑک رہا ہے اور ذہن کی عقلی و منطقی گتھیاں بھی ہیں۔ محبت جوذبات پر تصوّر کی فتح کا نام ہے جو سب سے بہتر مسرت اور سب سے بدتر غم ہے۔ اور کبھی نہ محبت کرنے سے بہتر ہے کہ محبت کر کے کھو دیا جائے" ایک شاعر کا انجام" میں اِس فلسفہ کو پیش کیا گیا ہے۔

اِس کا پلاٹ زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ نہ پیچیدگی ہے اور نہ جھول۔ سادگی کے باوجود

لہ: "ایک شاعر کا انجام"، ص ۸۸

کچھ مربوط نہیں ہے۔ بہت سے پہلو تشنہ رہ گئے ہیں جنہیں لفظ ڈھونڈھنے کے باوجود قاری تلاش نہیں کر سکتا۔ افضال جو اِس ناولٹ کا ہیرو ہے، ایک اُدھورا کردار محسوس ہوتا ہے کہ ہم اُس کے مزاج، عادات و اطوار سے تو پوری واقفیت حاصل کر لیتے ہیں مگر اس کے خاندان، عزیز، والدین، پر کوئی روشنی نہیں پڑتی یہ معلومات ثانوی و جُزوی ہونے کے باوجود بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اور انہیں بالکل نظر انداز کر دینا یقیناً ایک بڑی خامی ہے۔ یہی رویہ ہیروئین، حمیدہ کے بارے میں ملتا ہے۔ ابتدا میں زبیدہ کے نام خط سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ آئیڈیل کے خوب صورت تاج محل تراشتی ہے مگر حالات کی ایک ہی ٹھوکر کانچ کے اِن حسین جزیروں کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ اُس کی شادی ایک جاہل و بدذوق سے کیوں ہوتی ہے؟ اُس کے والدین و عزیز کہاں ہیں؟ اِن کے بارے میں ناول بالکل خاموش ہے۔ شباب کی رنگینیاں تو ہیں مگر ان پہلوؤں کی نامکمیت نے نقصانِ عظیم کیا ہے۔ بقول پروفیسر مجتبیٰ حسین :۔

"شاعر کا انجام" نیاز صاحب کے عنوانِ شباب کا لکھا ہُوا قصّہ ہے۔ جس میں بقول خود شباب کی پوری رنگینیاں ہیں۔ "شاعر کا انجام" جوانی کے ہیجانات اور اضطراب سے لبریز ہے۔ رَبط بالکل نہیں ہے۔ قصّہ بے سر و پا ہے آغاز و انجام سے بے نیاز ہے۔ شاعری جی کھول کر کی گئی ہے۔ اور ایک شاعر کا جو انجام ہونا چاہیئے تھا ہُوا ہے[لہ]"

یہ رائے کافی حد تک صحیح ہے۔ مگر قصّہ بے سر و پا نہیں۔ آغاز و انجام سے بھی بے نیاز نہیں خامی صرف اِتنی ہے کہ جو بنیادی معلومات، مرکزی کرداروں کے لئے بے حد ضروری تھیں نیاز نے اپنے افکار و خیالات کی خاطر اُنہیں نظر انداز کر دیا ہے۔

باتیں بنی تُلی اور کام کی ہیں مگر کہیں کہیں یہ اِحساس ہوتا ہے کہ نیاز نے محض اپنی سوچ فکر اور خیال کو پیش کرنے کے لئے واقعات کو طول دیا ہے۔ یہ باتیں افضال، حمیدہ اور رقیہ کی نہیں بلکہ نیاز کی اپنی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن اِن کا اصل قصّہ اور کہانی سے رابطہ قائم رہتا ہے۔ یہاں آج کے غموں سے اگر کاتبِ وقت سے کچھ شکوہ ملتا ہے تو کل کی مسرتیں بھی زندگی کو اُمید کے دِلکش پھولوں سے سجاتی ہیں۔ جُدائی کے زمانوں کی کہانیاں، تجدید رسم و راہ کی تمنا لئے، لفظوں کا، رُوح سے رشتہ جوڑتی ہیں تو مندمل ہوتے زخم سب پرانی چوٹوں کو تازہ کر جاتے ہیں۔ اَن دیکھے حُسن کی جستجو، وفورِ جذبات کے ساتھ، رومان کے نشاط انگیز اور مضطرب لمحوں کی کہانی بڑے نپے تُلے انداز میں سناتی ہے۔ اِس میں "شہاب کی سرگزشت" کی طرح خالق اپنے آپ کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور اِس کے کردار بھی فطری محسوس ہوتے ہیں۔ اِن میں وہ ماورائی اور فلسفیانہ انداز نہیں جو دوسرے ناولٹ کا حصّہ ہے۔ حمیدہ اور رقیہ دونوں کے کردار ارتقاء پذیر ہیں۔ اور ہماری عام مشرقی عورت اُس کے حُسن و جمال اور عادات و اطوار کے عکّاس ہیں۔ افضال کا کردار ایک عام فن کار کا کردار ہے۔ حسّاس شاعر و مغنّی جو کچھ کر سکتا ہے اُس نے وہی کچھ کیا۔ پاگل، دیوانگی و جُنوں شعوری نہیں بلکہ اُس کی جو طبیعت تھی، جو حسّاس ذہن تھا۔ اُس کے حوالے سے اُس کا انجام فطری اور حقیقت کے مطابق ہے۔

سیرت کشی کے علاوہ واقعات، فضا، مناظر و ماحول، مکالمہ، فن کار کا اپنا تبصرہ سب چیزیں اِس مختصر ناول میں شامل ہیں۔ فکر و جذبہ، شاعری اور فلسفہ کی آویزش و آمیزش نے ایک خوب صورت رنگ و آہنگ پیدا کیا۔ نیاز کو جہاں جہاں موقع مِلا اُنہوں نے کہانی کے مرکز سے ہٹ کر اپنی رومانیت اور اِنشاپردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ اِس سے قصّہ کا رابطہ ٹوٹتا ہے مگر نیاز کے اُسلوب و انشاء کی داد نہ دینا یقیناً زیادتی ہوگی۔

"دُنیا، اُمیدوں کی جولانگاہ، فانوسِ خیال بنی ہوئی...... اپنی بوقلمونی اور متغیرالالوان ہستی کے تماشے دِکھا دِکھا کے اِسی طرح اِک عالم کو مربوطِ مسرت و

حیات بنائے ہوئے ہے۔ شام کشاکش کار کی غیر مرئی جلوہ، صبح آئندہ کے لئے مخصوص کرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ ہر صبح اپنے جامِ زرّیں کے رقص سے ہم کو فراموش کاری کا سبق دیتی ہوئی سستیٔ تمنا میں ایک نئی گرمی بڑھا کے...... شام پر ثالث ہوتی سفر کر جاتی ہے۔ یہ کشمکش، یہ ہماری ہستیٔ منقسم بصرف صبح و مسا ہو رہی ہے۔ مگر اُف ری، ہماری وارفتگی کہ اِس مایوس نظارگی میں بھی لطف و تماشا کی جستجو ہے۔"[1]

اِنشا کی یہ شاعرانہ و فلسفیانہ جولانیاں سُرور، لطف و انبساط کا سرمایہ فراہم کرتی ہیں۔ چند کمزوریوں کے باوجود "ایک شاعر کا انجام" کو کامیاب مختصر ناول یا ناولٹ کہا جا سکتا ہے۔

شہاب کی سرگزشت

"شہاب کی سرگزشت" "زندگی کی ناہمواریوں کا گہرا شعور فلسفے کی اُلجھی ہوئی گُتھیوں کا سلجھاؤ، سوچ و تفکر کی انفرادیت اور تخیّل و تصوّر کی لطافت و نزاکت کا نام ہے جسے بیسویں صدی کا "معجزۂ ادب" کہا گیا ہے۔ "مطالعہ جزئیات"، "تجزیہ کردار اور تخیّل نزاکت" جیسے اُہم ترین عناصر نے اِس میں "سحرِ حلال" پیدا کر دیا ہے۔ نیاز کے "افکار و خیالات، تصوّرات و تخیّلات اور فن کو سمجھنے کے لئے سب سے مناسب و موزوں "شہاب کی سرگزشت" ہی ہے۔ جو کہنے کو تو شہاب کی زندگی کی کہانی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ نیاز نے شہاب کا ماسک پہن رکھا ہے۔ نیاز نے اپنے تصوّراتی پیکر کو شہاب کا لبادہ اوڑھا دیا ہے۔ "عشق و محبت" اور "نکاح و شادی" کے بارے میں نیاز کے جو ذاتی تاثرات، مشاہدات، تجربات اور خیالات تھے، اُنہیں شہاب کے روپ میں پیش کیا ہے۔

"شہاب کی سرگزشت" ابتداءً ۱۹۱۸ء میں رسالہ "تمدّن" کے لئے نیاز نے لکھنا شروع کی

---

[1] "ایک شاعر کا انجام" ص ۱۱، ۱۲

دو تین ماہ بعد یہ رسالہ بند ہو گیا تو نگار، جولائی ۱۹۲۳ء سے قسط وار شائع ہونا شروع ہوئی۔ جون ۱۹۲۴ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بعد ازاں اگست ۱۹۲۵ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ "شہاب کی سرگزشت" کو اپنے اچھوتے موضوع اور منفرد اسلوب کی وجہ سے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی نگار بک ایجنسی لکھنؤ کی جانب سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ جو ایڈیشن میری نظر سے گزرے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

"شہاب کی سرگزشت"	جنوری ۱۹۵۱ء	نگار بک ایجنسی لکھنؤ
"شہاب کی سرگزشت"	۱۹۶۵ء	نگار پاکستان کراچی ۳۲
"شہاب کی سرگزشت"	مئی ۱۹۸۱ء	نظامی پریس لکھنؤ

"شہاب کی سرگزشت"، ہر طبقے اور ہر حلقے میں پسند کی گئی۔ یہ کہانی نیاز کے اپنے افکار و خیالات پر مشتمل ہے۔ شہاب بولتا ہے تو نیاز کی زبان میں سوچتا ہے تو اُن کے ذہن کے مطابق، محسوس کرتا ہے تو اُن کے احساس کے ساتھ، اور عمل کرتا ہے تو اُن کی حرکات و سکنات اور کردار کے حوالے سے یوں یہ کہانی محض ایک بہانہ محسوس ہوتی ہے جسے نیاز نے اپنے نظریات کا پرچار کرنے اور اُنھیں منوانے کے لیے تخلیق کیا ہے۔ یہ نہ تو حقیقی زندگی کی ترجمانی ہے اور نہ اُس کی تنقید۔ بلکہ اس میں ایک خاص تصوراتی دُنیا کو پیش کیا گیا ہے۔ جس کا مقصد رُومان و جمالیات کی دلکش فضا کو منظر عام پر لانا ہے جیسا کہ پروفیسر عبدالسلام کا کہنا ہے:

> اُن کی کہانی نہ زندگی کی ترجمانی ہے نہ تنقید بلکہ اس میں ایک حسین تصوراتی زندگی پیش کی گئی ہے۔ ممکن ہے حقیقت کے عَلَم بردار اسے حد درجہ غیر حقیقی اور غیر صحت مند کہہ کر پکاریں مگر رُومانوی ادیب تو تلخ حقیقتوں سے اکتائے ہوئے، انسانوں کا غم غلط کرنے کے لیے ہی اپنی حسین دُنیا سجاتے ہیں رُومانوی ادب زندگی سے فرار ہی مگر اس کی دلآویزی اور سحر کاری سے انکار

> نہیں کیا جا سکتا۔"[1]

یہ بات دُرست ہے اس لئے کہ کہانی میں واقعی زندگی اپنے ماورائی طلسماتی اور حیرت انگیز حسن کی سحر کاریوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ گو یہ حقیقی زندگی سے دُور ہے۔ اس کے باوجود ایک خاص کشش رکھتی ہے۔ "شہاب کی سرگزشت" کا سارا فلسفہ، تلخیاں، رعنائی خیال، تصور و تخیل کی دلکشی انفرادیت کی کشش، سبھی باتیں شہاب کے کردار کے گرد گھومتی ہیں۔ اسی لئے اس کہانی کو اس کی "سرگزشت" کہا گیا ہے۔

شہاب ایک نستعلیق کردار، نازک و نحیف جسم، مگر قوی و مضبوط دل و دماغ رکھتا ہے۔ اُس کی ادائیں دل میں گھر کرنے والی، اُس کی خودداریوں میں رعنائی ہے۔ "شہاب" کا مفہوم ہی متانت سنجیدگی، خودداری و رعنائی، ذہانت و تہذیب قرار پاجاتا ہے۔[2] شہاب فطرتاً فلسفی، حد درجہ پاکیزہ ذوق ادب، نزاکت خیال اور لطافت ذوق، ایک خاص شاہانہ استغنا رکھتا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی مسرت سے غیر متاثر نظر آتا ہے۔ اسی طرح سخت سے سخت رنج اُس کو افسردہ مضمحل نہیں بنا سکتا۔ اُس کے اعصاب بظاہر فولاد کے تار نظر آتے مگر وہ قنوطی و شکی نہیں ہے۔ وہ سیلاب غم اور دُکھوں کے طوفانوں کو دل میں سمیٹے بظاہر پُرسکون نظر آتا۔ وہ چُپ اور ضبط کی دیوار ہے۔ گرفتہ دل مگر اُس کی ظاہری سطح پتھر نظر آتی ہے حالانکہ وہ نازک کانچ ہے۔ اُس کے خیال میں مشاغل نقاشی مصوری اور مطالعہ کتب ہیں۔ اُس کے خیال میں کتاب سے زیادہ ساکت بات کرنے والا اور صفحہ تصویر سے زیادہ خاموش مخاطب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ شہاب فلسفی بھی ہے اور شاعر بھی۔ اُس کے ہاں فکر کی اتھاہ گہرائیاں ہیں تو ساتھ ہی نزاکت تخیل و تصور بھی۔ اُس کے خیال میں آرزو کا حصول آرزو کی موت ہے اور لطف حقیقی کا راز صرف خلش ہے۔ وہ نتیجہ کے معنی عروج و ارتقاء کی بجائے

---

[1]: نیاز کا ایک طویل افسانہ" نگار نیاز نمبر حصہ اوّل ص ۲۲۸ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

[2]: شہاب کی سرگزشت ص ۳، مئی ۱۹۸۱ء نظامی پریس لکھنؤ

انحطاط و زوال سمجھتا ہے۔ وہ گہری فلسفیانہ سوچ رکھتا ہے اِس لئے مختلف موضوعات سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا ایک الگ و منفرد نظریہ پیش کرتا ہے۔ محمود سے محبت اور نکاح پر بحث کرتا ہے تو ایک نئی سوچ منظرِ عام پر آتی ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ نکاح محبتوں کا خون ہے محبت کا نتیجہ شادی نہیں، اگر ایسا ہو تو آگ کا کام جلائے جانا اور پانی کا جلا دینا ہونا چاہیے۔ محبت اُس کے نزدیک :

"محبت نام ہے ایک بے غرض اِنہماک کا، ایک خود فراموش محویت کا جو پیدا ہو حُسن کو دیکھ کر، خواہ وہ حُسن ظاہری ہو یا باطنی، واضح ہو یا غیر واضح، زمین میں ہو یا آسمان میں، رہا یہ اَمر کہ محبت کرنے والا محبوب سے مِل جانا چاہتا ہے یا نہیں اور یہ خواہش فطری ہے یا غیر فطری۔ اِس کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ شخص جس کی محبت اِس بات پر مجبور کرے حقیقتاً محبت نہیں ہے بلکہ وہ ایک جذبۂ شہوانی ہے۔"[1]

شہاب محبت میں ملاپ و وصال کو محبت کی موت سمجھتا ہے۔ اس کی رائے میں محبت میں اگر موت آ جائے تو محبت ہے اور اگر محبوب تک رسائی ہو جائے تو وہ محبت نہیں، بوالہوسی خود غرضی، مکر اور فریب ہے۔ اگر کوئی جان دے دے تو محبت ہے اور اگر کوئی شخص اپنے محبوب سے مِل جائے تو محبت ناقص ہے۔ محبت اُس کے نزدیک لطافتِ خیال، پاکیزگیِ جذبات اور روحانیت کا نام ہے۔ اور ہجر ایک بے پایاں چیز ہے جس کی وسعتوں کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محمود کی سکینہ سے محبت کو محض ایک جذباتی اُبال سمجھتا ہے اور اُسے سمجھاتا ہے کہ اگر وہ سکینہ سے حقیقی محبت کرتا ہے تو اُس سے شادی نہ کرے۔ محبت ناکام و نامراد ہو کر ہی روحانیت کا درجہ پاتی ہے۔ یہ خیال دُرست ہی ہی مگر ہم اِسے زندگی کا ہمہ گیر و آفاقی اصول و کلیہ نہیں

[1]: "شہاب کی سرگزشت" ص ۱۰

بنا سکتے۔ لیکن اِس کی سچائی اور صحت مندی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شہاب کو فطرت سے خاص لگاؤ ہے وہ اِس کے حُسن و سحر میں کھو جانا چاہتا ہے۔ وہ فطرت کی معصوم و مسحور کن پکار پر لبیک کہتا ہے۔ اور اُس کی پکار کی رعنائی سے اپنے جسم و جان کو بھر لینا چاہتا ہے۔ نذیر اپنے عزیز دوست محمود کو بھی یہی مشورہ دیتا ہے:

"میں چاہتا ہوں کہ تم طلوع و غروب کے منظر دیکھو اور اِن میں بالکل جذب ہو جاؤ۔ تم ایک پھول کو شاخ پر جھومتا ہوا دیکھو اور کائنات کو فراموش کر دو۔ تم ایک خشک پتی کو دیکھو اور خزاں کی ساری کیفیت اپنے اوپر طاری کر لو۔ تم ایک سبز گھاس کا تنکا دیکھو اور بہار کے اثرات کو اپنی رُوح میں منتقل کر لو۔ تم پانی کو دیکھو اور تڑپو، چاند کو دیکھو اور بے قرار ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ تمہاری ہر نظر تمہارے لئے ایک دفترِ جذبات ہو جائے اور تم اپنے وجود کو بالکل بھول جاؤ۔"[2]

شہاب کا یہ جمالیاتی اِحساس بلند، پاکیزہ اور لطیف ہے۔ مگر وہ محض تخیل و تصور کی دُنیا میں رہتا ہے۔ حقیقی زندگی کے مسائل اور اُس کی پیچیدگیوں سے دُور اپنی ہی دُنیا میں محوِ مست ہے۔ شہاب کو نفسیات سے خاص لگاؤ ہے۔ خاص طور پر وہ عورت کی نفسیات۔ اُس کے قلب و ذہن اور حرکات و سکنات سے خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ عورت کو سمجھتے ہوئے اُس کی رُوح تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ ظاہری نمود و نمائش کا قائل نہیں۔ حُسن اُس کے مطابق حسین دل و ذہن اور دِلکش رُوح میں چھپا ہے۔ ظاہری و جسمانی حُسن سے زیادہ زوال پذیر اور ناپائیدار شے اور کوئی نہیں۔ شہاب کا عقیدہ ہے کہ جو عورت جس قدر زیادہ حسین نظر آنے کی کوشش کرتی ہے اُسی قدر اُس کا باطن خراب و کریہہ ہے۔[3]

[2]: "شہاب کی سرگزشت" ص ۱۵

[3]: "شہاب کی سرگزشت" ص ۱۹

نرم نرم ریشمی ساڑیاں اِس لئے استعمال کی جاتی ہیں کہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ اِن کے اندر ریشم سے زیادہ نرم جسم چھپا ہوا ہے۔ اِن ظاہری حُسن اور نمائش کرنے والی عورتوں کے تبسم میں زہر بھرا ہوا ہے۔ اِن کی نگاہیں شبنم آلود ہیں۔ اور یہ وہ ناگنیں ہیں جن کو تہذیب و تمدن کے عالم میں صرف ہلاکت پھیلانے کے لئے چاروں طرف منتشر کر رکھا ہے۔ مرد بے وقوف اور عورت مکّار ہے۔ وہ اپنے زہر میں بھی ایک حُسن پیدا کرکے مرد کو مسحور کر لیتی ہے۔

شہاب کے اِس نظریئے سے کُلی اتفاق مشکل ہے۔ ظاہری نمود و نمائش، محبت کی قائل ہو سکتی ہے مگر ہر عورت دُنیا کے میلے میں جسمانی نمائش نہیں کرتی۔ لباس ہماری خوش ذوقی اور حُسنِ لطیف کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ نہ مرد ہی بے وقوف ہے اور نہ عورت ہی مجسم فریب۔ شہاب کا رویہ انتہا پسندانہ ہے۔ وہ ذہنی طور پر صحت مند محسوس نہیں ہوتا۔ شہاب متانت و سنجیدگی، خودداری و انا پرستی، فلسفیانہ رُجحان، حسّاس و باوقار، مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ دوسرے افرادِ قصّہ کے مقابلے میں بہت اُونچا اور دیوپیکر نظر آتا ہے۔ ہم اُس سے مرعوب ہوتے ہیں اور اُس کی عظمت کی دھاک ہمارے دلوں پر بیٹھ جاتی ہے۔ شہاب، اختر جیسی حسین و جمیل عورت سے بھی خاصی بے رُخی برتتا ہے۔

اختر، کشیدہ قامت، چھریرے بدن، کِھلتا ہُوا سانولا رنگ، نازک، خوب صورت نوجوان لڑکی ہے۔ وہ اِتنی نازک ہے کہ بعض دفعہ یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ ساحل پر گھومتی ہوئی تیز ہَوا کے جھونکوں سے سمندر میں گر جائے گی۔ وہ تھیٹر کی ایک کامیاب رقاصہ ہے مگر مشرقیت اُس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اختر ذہین و باشعور ہے، باوقار و خوددار ہے۔ نفسیات و شعر فہمی کا پورا پورا ذوق رکھتی ہے۔ اُس کی فطرت میں حیا و شرم ہے وہ خلوت پسند ہے اُسے روز روز تھیٹر میں سینکڑوں نگاہوں کا مرکز بننا اچھا نہیں لگتا۔ اُس کی باتوں میں شاعرانہ نزاکتیں اور فلسفیانہ رنگ دونوں بستے ہیں۔ وہ محض تخیل و تصور کی دُنیا میں نہیں رہتی بلکہ بڑی حقیقت پسندانہ گفتگو کرتی ہے جس میں عقل و تفکر بھی ہے اور منطق و استدلال بھی۔ شہاب کی عورت

کے بارے میں زہر آلود باتوں کے جواب میں کہتی ہے۔

"آپ کیوں وہ آرزو اپنے دل میں پیدا کرتے ہیں جو پیدا نہ کرنی چاہئے۔ آپ کیوں ایک چیز کو دیکھ کر ایسی خواہش کو اپنے دل میں پرورش کرتے ہیں جو بے محل ہے۔ یہ کیسا ظلم ہے کہ آپ دیکھنے کی چیز کو ہاتھ سے چھُونا چاہتے ہیں اور آپ اِس میں کامیاب نہیں ہوتے تو اُس چیز کو بُرا کہنے لگتے ہیں"[۹]

اختر، شہاب سے باقاعدہ بحث کرتی ہے۔ اُس سے حد درجہ متاثر ہے ایک عام عورت کی طرح دِل کے ہاتھوں مجبور ہے۔ مگر شہاب کی بے رُخی و بے اعتنائی سے اُس کی رگ رگ جل اُٹھتی۔ وہ شہاب میں ہزاروں نقص نکال کر متنفر ہونے کی کوشش کرتی تو دِل دھڑکنے لگتا۔ آنکھیں پُرنم ہو جاتیں، اور شہاب کو دیوتا سمجھ کر سَر بسجود ہو جاتی۔ اُس کی بے رُخی کے باوجود گمنام طریقے سے اُس کی مالی مدد کرتی ہے اور بیماری میں دن رات ایک کرکے اُس کی تیمارداری کرتی ہے۔ نازک، دھڑکتے ہوئے دِل سے مجبور ہو کر وہ نقصوں کا سہارا لیتی ہے مگر شہاب بے نیازی سے ایک شعر پر اکتفا کرتا ہے:

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ[۱۰]

یہ اُس کی انا و خودداری پہ شدید چوٹ تھی۔ وہ نیم داغ و نیم خاکستر اِس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ انتقام میں بہت زیادہ لذت ہے۔ مایوسی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو اضطراب، سکون بن جاتا ہے وہ شہاب کے نقطۂ نظر کو سمجھ نہیں پاتی حالانکہ اُس کے دل میں اُس کی محبت

۹۔ "شہاب کی سرگزشت" ص ۷۰
۱۰۔ "شہاب کی سرگزشت" ص ۵۵

گھر کر چکی ہے۔ وہ اپنے خاص نظریات کی بنا پر زندگی بھر کی رفاقت قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اُس کی رائے میں ہجر و فراق ہی حقیقی محبت ہے۔ اور چار بچوں کی کفالت کے لئے اُن کی ماں سے نکاح کر لیتا ہے۔ اختر کا انتقام اندھا ہے۔ وہ خود اذیتی کا شکار ہو کر محمود کے ساتھ زندگی گزارنے لگتی ہے۔ جب وہ محمود کی وفا شعار بیوی سکینہ کا درد بھرا خط پڑھتی ہے تو خاموشی سے اُسے چھوڑ کے چلی آتی ہے۔ اور آخر میں حد درجہ محنت و عصمت کے ساتھ زنانہ مدرسے کو چلانا شروع کر دیتی ہے جہاں تعلیم سے زیادہ تربیت اخلاق کا لحاظ رکھا جاتا ہے

شہاب و اختر کے ساتھ ساتھ کہانی ایسے کرداروں کے گرد بھی گھومتی ہے جن کی شناخت و پہچان آسان ہے۔ وہ کردار فطری ہیں اور ہماری دُنیا کے باشندے ہیں۔ یہ محمود، طفیل اور سکینہ ہیں۔ محمود جو شہاب کا عزیز از جان دوست ہے۔ شہاب کو پرستش کی حد تک چاہتا ہے مگر اُس کے نظریات سے اختلاف رکھتا ہے اُس کا فلسفۂ محبت شہاب سے بالکل مختلف ہے۔ محمود، شہاب کی طرح فطرتاً نقاش و مصوّر ہے۔ وہ محبوب کے وصال کو کتابِ محبت کا آخری لفظ نہیں سمجھتا۔ محبت اُس کے خیال میں کچھ کھو دینے کا نہیں بلکہ کچھ پا لینے کا نام ہے۔ وہ سکینہ سے محبت کرتا ہے اور اُسے زندگی بھر کا ساتھی بنانا چاہتا ہے۔ مگر شہاب اپنے فلسفہ کے مطابق اُسے منع کرتا ہے۔ جب جذبات کا سیلاب عقل کا بند توڑ کے آگے بڑھتا ہے تو نہ صرف خود فنا ہوتا ہے بلکہ راستے میں آنے والی ہر شے کو فنا کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی حال محمود کا ہے۔ وہ شہاب کی نصیحت کو قبول کرنے کی بجائے اُلٹا اُس کے لئے بھی ویسے ہی حالات کی دُعا کرتا ہے:

> اگر میری دُعا مقبول ہوتی تو میں تمہارے اِس لمحہ الوہیت گزر جانے کے بعد خدا سے التجا کرتا کہ الٰہی شہاب کو انہیں میں سے کسی پیکرِ سنگین کی محبت میں اِس قدر مُبتلا کر دے کہ وہ دیوانہ وار اِس پتھر کی مورت کے سامنے جبیں سائی کرے، وہ فریاد کرے اور کوئی سُننے والا نہ ہو، وہ محبت سے چیخ چیخ اُٹھے اور کسی کو خبر نہ ہو

> وہ رُو رُو کر طوفانِ نوح برپا کر دے لیکن کوئی اُس کے آنسو پونچھنے والا نہ ہو۔"[1]

محمود کا یہ رویّہ ایک نارمل انسان کا رویّہ ہے۔ اُس کی سوچ، اُس کا طرزِ فکر، اُس کا عمل، اُس کی لغزشیں سب عام لوگوں جیسی ہیں۔ وہ سکینہ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا، شہاب کے منع کرنے کے باوجود اُس سے شادی کر لیتا ہے۔ بعد میں بیوی اور ماں کے اختلافات سے تنگ آ کر بمبئی چلا آتا ہے۔ یہاں اُس کا اختر کی طرف مائل ہونا ایک فطری امر ہے وہ اختر کے ساتھ وقت تو گزارتا ہے مگر سکینہ کی موجودگی میں شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کرتا۔ سکینہ کا خط آنے پر اپنے مرکزِ محبت کی طرف واپس لوٹ جاتا ہے۔ شہاب کے رُومانوی اور تصوراتی پیکر کے ساتھ ہمیں محمود کے کردار سے بڑا سہارا ملتا ہے کہ یہ ہماری آپ کی طرح سوچ رہا ہے وہ اِسی دھرتی کا انسان ہونے کے ناطے خیر و شر کا مجموعہ ہے۔

سکینہ مخلص و باوفا محبوبہ بھی تھی اور وفا شعار و وفا پرست بیوی بھی۔ محمود کے غیر ذمہ دارانہ ردِّعمل کے باوجود اُس کی محبت میں کمی نہیں آتی۔ وہ شہاب کی عظمت سے متاثر ہے، اور اُس کے روپیہ بھیجنے پر اُس کی شکر گزار ہے۔ سکینہ کا کردار، شہاب و محمود کی بحث و مباحثے میں زیادہ زور قوت اور کشش پیدا کرنے کے لئے بہت ضروری تھا۔ اُس کی محبت کے بغیر شاید یہ کٹھن اور بے جوڑ مباحث ہمارے سامنے نہ آتے۔

طفیل ایک بے فکرا، لاپروا، خوش باش اور عیش پرست نوجوان ہے۔ وہ محبت کو نالائقی سمجھتا ہے۔ اُس کے خیال میں زندگی جوانی کی لذّتوں کا نام ہے۔ وہ محمود کو نہایت عزیز دوست اور شہاب کو نہایت عزیز دشمن سمجھتا ہے۔ اِس لئے کہ محمود نظریاتی طور پر اُس کے قریب ہے اور شہاب کو اُس کی ہر بات سے شدید اختلاف ہے۔ طفیل ایک بھونرا ہے جو ہر آشیانۂ گل کا

---

[1] "شہاب کی سرگزشت" ص ۲۴

پتا پوچھتا پھرتا ہے۔ اُس کے خیال میں ہر جذبہ اسی لئے پیدا ہوتا ہے کہ اُسے پورا کیا جائے۔ اُس کے ہاں ماضی و مستقبل کا مفہوم نہیں ہے۔ وہ صرف حال کو دیکھتا اور اُسی سے فائدہ اور لُطف اُٹھاتا ہے۔ وہ ساحل پہ اس لئے جاتا ہے کہ وہاں بمبئی کے ایک ایک گوشے کا حُسن آکر جمع ہوتا ہے۔ اُس کی رائے میں طوفان وہی یادگار ہے جو ساحل کی پروا نہ کرے اور بستی کی بستی بہالے جائے۔ اُسے عورتوں کو اپنے جال میں پھنسانے میں کمال حاصل ہے۔ وہ لذّت پسند و لذّت پرست ہے۔ کہانی کے آخری منظر میں طفیل ہی سٹیج پہ نظر آتا ہے مگر یُوں کہ:

"طفیل نے آخری مرتبہ بمبئی کی ایک مشہور رقاصہ سے تعلق پیدا کرکے، اُس کو بھی تباہ و برباد کر دیا ہے۔ لیکن ابھی تک اس سے تعلق قائم ہے۔ کیونکہ چند قطرے خُون کے ابھی اس میں اور باقی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ اب اِن کے نچوڑنے کے لئے کس قسم کا نشتر استعمال کیا جا رہا ہے۔"[1]

"شہاب کی سرگزشت" کا پلاٹ فنّی لحاظ سے ناقص و کمزور ہے۔ اِس میں بہت سی خلیوں کا احساس ہوتا ہے۔ اصل کہانی بہت مختصر ہے۔ جابجا شہاب کے فلسفیانہ افکار و خیالات جو دراصل نیاز کے افکار و خیالات ہیں، خاصی جگہ گھیرے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اِس ناول کی تخلیق کا مقصد ہی اِن خیالات کو پیش کرنا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ اِن کو اگر یکجا کیا جائے تو محبت شادی اور عورت پہ اچھا خاصا مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔ نیاز کو شہاب کے کردار سے خاص لگاؤ اور دلچسپی ہے۔ اور اُسی کا کردار اُن کے سامنے ہے، اُسی کے لئے حالات و واقعات وضع کئے گئے ہیں۔ جب خاص کردار فن کار کے سامنے ہو تو دوسرے حالات و واقعات کی حیثیت ثانوی و ضمنی سی محسوس ہوتی ہے بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

"جب کبھی یہ ہوتا ہے کہ ناول نگار کے پیشِ نظر کسی خاص واقعہ کی بجائے

[1] "شہاب کی سرگزشت" ص ۱۴۴

کوئی خاص کردار ہوتا ہے اور اُس کا اصل مقصد اُس کردار کی ترجمانی یا اُس کے ذریعے زندگی کے کسی خاص پہلو کی مصوّری ہوتا ہے تو واقعات اِس مقصد کے لئے وضع کئے جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اِس طرح واقعات اور اِن کے ربط کے یا ترتیب کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔"[2]

نیاز کی پوری توجہ بھی شہاب پر مرکوز ہے۔ ہم اس کی ذہانت، مشاہدہ و مطالعۂ زندگی اور فلسفیانہ گفتگو سے متحیّر ہو جاتے۔ فن کی اِنتہا حیرت ہے اور یہ حیرت یہاں موجود ہے مگر وہ حقیقی زندگی اور عام فطری ذہن و رویّہ سے دُور ہٹتا چلا جاتا ہے۔ وہ مثالی و تخیلاتی پیکر ہے جو مثالی دُنیا UTOPIA کا باشندہ ہے۔ وہ فلسفہ اور ذہانت کے خول میں بند ہے۔ یہ خول نہ تو محمود کی گفتگو سے ٹوٹتا ہے اور نہ اختر کی بے لوث محبت سے۔ ہر ستّے سے اِختلاف اور اپنی باتیں منوانے کے شوق میں، زندگی کے اصلی و سچے رنگ و روپ اور اُس کے درمیان فاصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اُس کا کردار ارتقا پذیر نہیں بلکہ گھڑا گھڑایا ہے۔ اُسے نیاز کا مثالی کردار کہنا چاہیے جس نے اُن کی خواہش کے مطابق وہی رول ادا کیا ہے جو وہ چاہتے تھے۔ اُس کا خاندانی پس منظر اور وہ حالات ہمارے سامنے نہیں آتے جنہوں نے اُس کی ماورائی ذہنیت کو بنایا ہے، فطرت نے اُسے فرشتہ نہیں، اِنسان ہی پیدا کیا ہوگا اُس کی طول طویل گفتگو اُسے نابغۂ ثابت کرتی ہے مگر اس سے فن کو خاصی ٹھیس پہنچی ہے۔

پلاٹ میں مکالمے، کرداروں کی فطرت و شخصیت کو سامنے لانے میں خاص کردار ادا کرتے ہیں یہ جتنے عام فہم، فطری اور مختصر ہوں اُتنے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔ "شہاب کی سرگزشت" کے مکالمے طویل ہیں۔ شہاب و محمود بولنے پہ آتے ہیں تو بولتے ہی چلے جاتے ہیں اگرچہ ہم اِن سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ مگر یہ گفتگو حقیقی دُنیا کی محسوس نہیں ہوتی۔ اِن

[2] سالنامہ "ادبِ لطیف" ۱۹۵۰ء ص ۲۶

کے مختصر کر دینے سے بھی کہانی کے مجموعی تاثر پہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ انداز فنی اعتبار سے یقیناً اچھا نہیں۔ اِن سے ایک چھوٹا سا منظر زمان ومکاں کی حدود سے نکلتا دکھائی دیتا ہے

رُومانوی ماحول اور منظر نگاری کی طرف "شہاب کی سرگزشت" میں خاص توجہ دی گئی ہے شہاب کا دھڑکتا ہُوا دیوانہ دل اور قدرت کے حسین وجمیل مناظر، مرقعوں اور تصویروں میں شوخ سُندر رنگ بھرتے ہیں ایسے وقت میں نیاز کا قلم تشبیہات واستعارات کا وافر خزانہ فضاؤں میں لُٹاتا ہے:

"چاند پہاڑ کی چوٹی سے بلند ہوکر اپنی چادرِ سیمیں پھیلا چکا ہے۔ جس میں پانی کی موجیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ چادر کی شکنیں ہیں، جن کو ہَوا دُور کرنا چاہتی ہے لیکن بجائے مٹنے کے وہ اور زیادہ بڑھتی جاتی ہیں۔ دریا میں ہچکولے کھا کھا کر نیلوفر کے پھول کنارے آ لگتے ہیں اور جگنو اپنے پر پھیلائے گویا چاند کی طرف پرواز بلند کیے جا رہا ہے۔[1]"

ایسے خوب صورت مناظر اکثر ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ جن کا مقصد لطافت ونزاکت سے مسرّت وانبساط پیدا کرنا ہے۔ ہم اِن مناظر سے لُطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور مصنف کے مشاہدۂ حُسنِ فطرت کی داد بھی دیتے ہیں۔ نیاز کا رُومانوی مزاج، شاعرانہ تموّج اور اضطراب سے مل کر تشبیہات واستعارات کے لازوال خزانہ کے ساتھ ایسے دلکش مناظر سامنے لاتا ہے جن میں پڑھنے والا لذت محسوس کرتا ہے اور یہ کبھی نہیں چاہتا کہ یہ لذت اُس سے چھین لی جائے۔ بقول سیّد وقار عظیم:-

"خیال کی رنگینی دل کی آواز پر لبیک کہتی ہے۔ اور حسین منظر کی مصوّری کے لئے پُر شکوہ لفظوں، مترنم ترکیبوں اور خیال انگیز تشبیہوں کا ایک سیلاب

[1] "شہاب کی سرگزشت" ص ۳۱

اُبلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اِس سیلاب کی رَو میں بہنے اور بہتے رہنے میں ایک ایسی لذت ہے کہ پڑھنے والا ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ یہ لذت اُس سے چھین لی جائے۔[1]"

نیاز کا فن اِسی لذت کا فن ہے۔ اُسلوب شاعرانہ ہے۔ شاعرانہ الفاظ، تشبیہات واستعارات شاعرانہ تراکیب پورے جوش وجذبے سے اپنی جولانیاں دکھاتی ہیں۔ طلسم وفسوں کی اِس دُنیا میں لفظوں کی دلکش قوسِ قزح کے رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔ تحریر میں روانی، جوش اور ہنگامہ ہے نیاز جس تیزی سے سوچتے ہیں۔ اُسی تیزی سے اُن کا قلم لفظوں کی متاعِ بے بہا لُٹاتا چلا جاتا ہے خوب صورت لفظ، انوکھی ترکیبیں، توازن اور موسیقیت لیے چکا چوند جلوؤں سے قاری کو اپنے جال میں یُوں جکڑ لیتے ہیں کہ وہ چاہے بھی تو اِس طلسم سے نہیں نکل سکتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تند وتیز دریا، جوش وغضب میں کہیں پہاڑوں سے ٹکراتا، کہیں دل آویز نغمے گنگناتا، کہیں سرسبز وادیوں میں رنگا رنگ پھول کھلاتا ہے اور کہیں بند توڑ کر کناروں سے بہہ نکلتا ہے۔ فنی لحاظ سے چاہے "شہاب کی سرگزشت" خام ہو مگر اس کا اُسلوب وانشا قابلِ صد تحسین وستائش ہے:-

"اگر آفتاب اپنے طلوع وغروب کی رنگین ادائیں بدل سکتا ہے۔ اگر تارے فضائے آسمان میں راتوں کو جگمگانا فراموش نہیں کر سکتے، اگر ہلال کی کشتی سیمیں آسمان کے وسیع وبے پایاں نیل کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر چاندنی رات ہی کو ہو سکتی ہے۔ دِن کو نہیں تو تم مطمئن رہو کہ پھر مجھے کوئی غم نہیں اور نہ میرے مغموم ہونے کی کوئی صورت[2]"

[1] "نیاز کے مختصر ناول" فن اور فن کار ص ۱۶۴، بار اوّل ۱۹۶۱ء، اردو مرکز لاہور

[2] "شہاب کی سرگزشت" ص ۴۲

نیاز کا اُسلوب سنجیدہ ہے۔ مگر تخیل و تصور، زور و جذبہ، جوش نے سادگیٔ بیان کا وصف پیدا نہیں ہونے دیا۔ بہت سی نادر ترکیبیں تو ملتی ہیں مگر وہ عام فہم نہیں لیکن ایسے مواقع کم ہیں۔ نیاز کا قلم جوش و روانی میں بہتا چلا جاتا ہے۔ کہیں قسم کا ضعف اور رکاوٹ نظر نہیں آتی۔ خیالات شعور کی دُنیا میں برقی رَو کی طرح تیزی سے بھاگتے نظر آتے ہیں جنہیں نیاز کا قلم اتنی ہی تیزی سے صفحۂ قرطاس پہ بکھیر دیتا ہے۔

"وہ ہلکی ہلکی ریشم کی ساریاں اور اُن ساریوں کے آنکھوں کو خیرہ کرنے والے زرکار پلّو، وہ صدف آسا کانوں میں، رنگین رُخساروں سے چھو کر کانپ اُٹھنے والے آویزے، اور ان آویزوں کے وہ درخشندہ و تابندہ الماس، وہ پیشانیوں کی محدود و مختصر فضا میں ناقابلِ شمار اداؤں سے گیسو کی آرائش اور ان آرائشوں کو وہ مبہوت و دیوانہ بنانے والی نکہت باریاں یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج یہ قطعۂ زمین پَر لگا کر اُڑ جائے گا۔"[1]

قطعۂ زمین تو پَر لگا کر اُڑے یا نہ اُڑے، قاری کا ذہن لفظوں کے حسین و دلکش، خوبرو پریوں کے ساتھ ضرور فضائے بسیط کی سیر کرنے لگتا ہے۔

"شہاب کی سرگزشت" ایک خوب صورت ناولٹ ہے لیکن اگر نیاز طول طویل باتوں سے اجتناب کرتے ہوئے، شہاب کو اسی دھرتی کا انسان دکھاتے تو یقیناً اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب رہتے۔ اس کے باوجود اس ناولٹ کا شمار اپنے زمانے کی بہترین تصانیف میں ہوا۔ فنی کمزوریوں کے باوجود اس کا اُسلوب آج بھی تازہ اور زندہ ہے جسے کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

نگارستان "نگارستان" نیاز کا بہت اہم اور مقبول افسانوی مجموعہ ہے جو چھبیس افسانوں اور

[1] "شہاب کی سرگزشت" ص ۲۵، ۲۶

انشائیہ نما تحریروں پہ مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں چند ایسی بھی ہیں: "ایک متوفّرشتہ"، "کیوپڈ و سائیکی"، "ایک رقاصہ سے"، "عورت ایک قافلہ صحرا کو دیکھ کر"، "قربان گاہِ حُسن"، "ایک سیّاح بت تراش"، "کہکشاں کا ایک ساتھ"، "روح کی فریب کاریاں"، "عالمِ محبت میں"، "شہزادۂ خرم"، "اوباش"، "بچ گئے"، "ایک مولوی کے ساتھ"، بہت اہم اور پڑھنے کے لائق افسانے ہیں۔

"نگارستان" میں رومانی و تخیلاتی افسانے بھی ہیں اور معاشرتی و اصلاحی بھی، جو انشائے لطیف کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ بعض افسانے "نگار" کے علاوہ کئی دوسرے رسائل میں بھی شائع ہوئے۔ یہ مجموعہ اولاً جنوری ۱۹۲۴ء میں نگار بک ایجنسی لکھنؤ کی جانب سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن دسمبر ۱۹۳۰ء میں نگار بک ایجنسی لکھنؤ نے ہی شائع کیا۔ تیسرا ایڈیشن جو میری نظر سے گزرا وہ ۱۹۴۳ء میں "نگار بک ایجنسی لکھنؤ" اور عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن سے بیک وقت شائع ہوا۔

نیاز کا یہ افسانوی مجموعہ خاص و عام میں بے حد پسند کیا گیا۔ روز افزوں کے مختار نے اسے بہت مقبولیت بخشی۔ "کیوپڈ اور سائیکی" جو نیاز کے بہترین افسانوں میں سے ہے، اس مجموعے میں شامل ہے۔ یہ افسانہ یونان کے دیومالا، علم الاصنام سے تعلق رکھتا ہے۔ نیاز نے خوب صورت طرز اور دلکش انشا و اُسلوب کے ساتھ یوں پیش کیا ہے کہ اُن کا طبع زاد محسوس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں خود لکھتے ہیں:-

"یہ افسانہ حقیقتاً یونانیوں کے علم الاصنام سے متعلق ہے لیکن اپنی ترتیب، اپنے اندازِ بیان اور اپنے اُسلوب کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے اور اخذ و اقتباس سے بالکل پاک۔"[1]

نیاز کا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی قوم اپنے بعد کوئی ایسی چیز چھوڑ جانا چاہتی ہے جو اس کی یاد کو خلعتِ دوام بخشے تو وہ صرف اُس کا لٹریچر ہے۔ مطالعۂ فطرت اور لٹریچر میں کوئی فرق نہیں۔ اگر وہ تخیل ہے

[1] "کیوپڈ اور سائیکی" "نگارستان" ص ۱۸، دسمبر ۱۹۳۰ء، نگار بک ایجنسی لکھنؤ

[illegible] داستان ہے مگر یہ صرف ایک حسن بے قدر ہی کی داستان نہیں بلکہ تخیل و تصور کی بلندی [illegible] ہے۔ کیوپڈ اور سائیکی کی داستان ہے جس میں [illegible] یہ فسانہ حسن و عشق کی لافانی داستان ہے جسے [illegible] زندہ و جاوید کر دیا ہے۔

کیوپڈ اور سائیکی [illegible] کا کلاسیکل قصہ ہے کیوپڈ عشق کا دیوتا اور سائیکی حسن کی [illegible] رہے گا۔ سائیکی جسے کسی دیوتا کی تلاش ہے [illegible] اور اس کی [illegible] ہو جائے گی۔

"دنیا میں کوئی [illegible] جو میرے بعد میری یادگار حسن باقی رکھے۔ کوئی شوہر نہیں جو میری [illegible] کرے۔ [illegible] نہیں جس کے [illegible] آسمان کی سائیکی۔ [illegible] جو [illegible] محبت کو گھٹے گی، کہاں ہے گا؟"

سائیکی حسن و جمال کا شاہکار، [illegible] مگر [illegible] خواب شرابی آنکھیں، پنکھڑی سے لب اس سے خوب صورت [illegible] فطرت آج تک تخلیق نہ کر سکی تھی۔ وینس (زہرہ) ایک عام عورت کی طرح سائیکی کے حسن و جمال سے حسد کرتی ہے اور اپنے بیٹے کیوپڈ، جس کے شانہ پر کمان اور ترکش میں تیر، جو حسن کی دیویوں کو اپنے نشانہ کے تیر سے ختم کرتا چلا آرہا ہے، کو بھیجا کہ سائیکی کو اپنے تیر نظر سے ختم کر دے۔ لیکن آج فطرت کیوپڈ کو خود ایک حسین آزمائش سے دوچار کرنے والی ہے۔

"کیوپڈ اپنا تیر و کمان سنبھالے۔ کنجوں میں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش سائیکی پر خالی کر دے گا۔ لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لئے

سلہ: کیوپڈ و سائیکی "نگارستان" ص ۲۲

کیوپڈ نے سائیکی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی تھا کہ تیر انگلی سے چھوٹ گیا اور [illegible] سے گر پڑا [illegible] اور کیوپڈ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔"

کیوپڈ [illegible] تو کیوپڈ [illegible] عورت کی طرح ایک [illegible] لیکن عشق کے ہوتے ہوئے حسد کی مجال [illegible] کو [illegible] اور وعدہ لیا کہ وہ ہمیشہ ایک [illegible] کی طرح اس کی پرستش کرتا رہے گا۔ دشمنوں کی سازش نے ایک بار پھر ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ دونوں [illegible] طرح تڑپ رہے ہیں۔ بالآخر ان کی آزمائش ختم ہوتی ہے اور وہ کامیاب وصال ہوتے [illegible] حسن و عشق کا ازلی رشتہ تو فطرت نے آسمان کی رفعتوں پہ ہی ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے باندھ دیا تھا [illegible] کی شراب الوہیت کے پینے سے دونوں غیر فانی ہو کر آسمانی مخلوق ہو گئے۔

ایک خوب صورت افسانہ، جو رومان پرور، شدید جذبہ اور تخیل کا لافانی شاہکار ہے اس دور میں بھی جب کہ افسانہ حقیقت، علامت و تجرید کے راستوں پہ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے "کیوپڈ اور سائیکی" اپنے ان دیکھے جہان، وفور تخیل اور وفور جذبات کی بنا پر ایک دلکش افسانہ ہے جس کا پلاٹ مضبوط، کہیں مجہول و پیچیدگی نہیں اور کردار بھی حسین و پرکشش، دیوی، دیوتاؤں کے یہ کردار انسانوں کی طرح سوچتے اور عمل کرتے ہیں۔ اس لئے ماورائی و طلسماتی ماحول میں بھی ہمیں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ افسانہ کا اسلوب و انشا لاجواب ہے۔ قصہ سے ہٹ کر صرف انشاپردازی کو ہی لے لیا جائے تو ہمیں نیاز کے کمال فن کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

سلہ: کیوپڈ و سائیکی "نگارستان" ص ۳۶

• میری آنکھیں اگر جادو ہیں تو وہ جادو ہی رہیں گی اُنہیں مسحور ہونا نہیں آتا۔ میرا حُسن اگر دیوتا ہے تو ہمیشہ اُس ہی کی پرستش کی جائے گی۔ وہ خود کسی کا پرستار کیوں ہو۔ دُنیا اگر میرے لئے تڑپ رہی ہے تو تڑپے میں کسی کے لئے کیوں تڑپوں۔ میری رعنائی ایک مستقل استغنا ہے اور سارے عالم کی حیات اِس کے ایک جلوۂ گریزپا کا ادنیٰ اخراج۔"[1]

• "ایک رقاصہ سے" مختصر، خوب صورت و دل فریب افسانہ، جو اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نیاز صرف لفظوں کے ہی بازی گر نہیں بلکہ جملہ فنونِ لطیفہ خاص طور پر موسیقی و رقص کی لطافتوں اور نزاکتوں سے بھی مکمل آگاہی رکھتے ہیں۔ رقص، دھوپ چھاؤں کا دل آویز کھیل، جس کی اِک اِک ادا، اِک اِک حرکت خوب صورت باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ یہ نارسا حُسن دُنیا بھر کی کشش رکھتا ہے۔ نیاز نے چھوٹی اُنگلی کے ارتعاش سے لے کر پاؤں کے گھونگروؤں کی تال و سَم تک دلکش متحرک تصاویر پیش کی ہیں۔ نیاز کا کہنا ہے کہ جو لوگ اِن تصاویر کو دیکھ کر جذبات میں ہیجان محسوس کریں دراصل وہ قوتِ تمیز ہی نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ پھول کو شاخ پہ کھلا دیکھ کر اُسے توڑ لینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اُنہیں اِس بات کا احساس ہی نہیں کہ پھول صرف اپنی مسحور نکہت ہی سے قابلِ قدر نہیں بلکہ اِس کا شاخ میں کِھلا ہُوا ہونا، ہَوا چلے تو جھومنے لگنا، کُھلی فضا میں مسرور سا نظر آنا، ایسا دلکش پہلو ہے جو نکہت سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔[2]

• "عورت" نیاز کی اُس عقیدت و پرستش کا والہانہ اظہار ہے، جو وہ صنفِ نازک سے رکھتے تھے۔ عورت کائنات کی محترم ترین مخلوق ہے۔ عورت بہترین آسمانی تحفہ ہے جس کے حضور کائنات کی ہر شے سربسجود ہے۔ عورت پھول ہے، خوشبو ہے، نُور ہے، نغمہ ہے،

[1]: "گریزپا در سایہ" نگارستان ص ۳۵

[2]: "ایک رقاصہ سے" نگارستان ص ۱۹

نفاست ہے، نزاکت ہے، فطرت کے سب نظارے اُس کے حُسن کے سامنے ہیچ ہیں۔

• عورت ایک لذت ہے مجسم، اِک تسکین ہے متشکل، اِک سحر ہے مرئی، اِک نُور ہے مادی عورت ایک روحانیت ہے، قابلِ لمس، نُورانیت ہے صاحبِ نطق، ایک روشنی ہے جسے ہم چُھو سکتے ہیں ایک نکہت ہے جس سے ہم گفتگو کر سکتے ہیں۔ اِک حلاوت ہے جو ہاتھوں سے چکھی جاتی ہے اِک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سُنی جاتی ہے۔"[3]

عورت، قدرتِ خداوندی کا جاذب ترین و دقیق ترین نمونۂ کمال ہے۔ اِس میں خاص قسم کا استغنا و غرور ہے۔ اِس کا حُسن، چھپ جانے، سمٹ جانے اور بدن چُرا لینے میں ہے۔ وہ ہر روپ میں عظیم ہے۔ بیوی ہے تو وفا و ایثار کی دیوی، بھوکی پیاسی، شوہر کی منتظر ہے۔ اُس وقت تک کھانا نہیں کھاتی جب تک وہ آ نہ جائے۔ مَرد سوتا ہے اور وہ پنکھا جھلتی رہتی ہے۔ ماں ہے تو مجسّم شفقت و محبت۔ اپنے بچّے کی خاطر اپنا جسم و رُوح، آرام و سکون، جذبہ و احساس سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ نیاز اپنے قلم میں اِتنی قوت ہی نہیں پاتے کہ وہ عورت کے حُسن اور محبت کو بیان کر سکیں۔ پھر بھی اُن کا قلم جذباتی ہوتا، لفظ لفظ عقیدت و پرستش کے خوشبو بھرے پھول بکھیرتا چلا جاتا ہے۔

"محبت جس پر آفرینش ناز کر سکتی ہے۔ ایک ایسا دل ڈھونڈھتی ہے جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جانے والا ہو۔ ایسی آنکھوں میں رہنا چاہتی ہے جو ذرا سی بات میں پُرنم ہو جانے والی ہوں۔ پھر اے مَردو، اپنے دِلوں کی مضبوطی پر دل دکھاؤ، اپنی آنکھوں کی خشکی پر آنسو بہاؤ کیونکہ جس وقت محبت راتوں کو دروازہ کھٹکھٹاتی ہے کوئی آرام کی جگہ تلاش کرتی ہے تو

[3]: "عورت" نگارستان۔ ص ۷۹

اے مرد اس وقت تو اپنے نشۂ قوت میں غافل سوتا ہے ۔ عورت جو

تجھے بچا بچا کر جلتی رہتی ہے۔"[1]

"کہکشاں کا ایک سانحہ" تصور و تخیل کی حسین، حیرت انگیز دنیا کا فسانہ ہے۔ کہکشاں کی ملکہ لالہ رخ مرد سے متنفر ہے۔ اور کسی مرد کو یہاں آنے کی اجازت نہیں مگر فطرت کب تک اپنے قوانین سے انحراف کرتی۔ کہکشاں کی شہزادی ریحانہ، شہزادہ قمر کی محبت میں سرشار ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے ۔

"جب ساز نغمہ سے جدا ہو جائے، جب موسیقی تاروں سے برہم ہو کر

اپنا التفات ہٹا لے پھر ساز کا ٹوٹ جانا اور تاروں کا ٹکڑے ٹکڑے ہو

جانا ہی خوب ہے۔"[2]

ریحانہ، شہزادہ قمر کی جاں سوز محبت میں مضطرب، بے چین و بے قرار ہے۔ اپنی دایہ کی مدد سے کٹھن مراحل طے کرنے کے بعد اس تک پہنچتی ہے۔ مگر کہکشاں کا یہ منور درخشاں تارہ ایک سینے سے بنا تا ہوا ٹوٹ گیا، وہ خود تو ٹوٹ گیا مگر ٹوٹتے ہوئے بھی اس کی روشن محبت سے سارا آسمان جگمگا اٹھا۔ شہزادہ قمر نے اس کی وہ عزت و احترام نہ کیا جس کا کہ وہ نازک دل مستحق تھا۔ سچ ہے کہ :-

"دنیا میں عورت محبت کرتی ہے صرف اس لئے کہ وہ محبت پر مجبور ہے

اور مرد محبت کرتا ہے صرف اس لئے کہ وہ اس کی مسرت ہے۔ پھر یہ

کبھی نہیں ہوتا کہ وہ مجبوری جاتی رہے اور ہمیشہ ہوتا ہے کہ یہ مسرت ناپائدار

ثابت ہو۔"[3]

---

[1]: "عورت" نگارستان ص ۸۱

[2]: "کہکشاں کا ایک سانحہ" ص ۱۰۰

[3]: ایضاً ص ۱۱۱

نیاز کے خیال میں کائنات جس مضبوط بنیاد پہ کھڑی ہے وہ محبت ہے ۔ ساری کائنات صرف روح کے لئے پیدا کی گئی ہے اور روح صرف محبت کے لئے مجسم سلام ہے۔ فرشتوں کا، روحوں کا، محبت کائنات کو شفاف و پاکیزہ بناتی ہے ۔ دنیا میں اگر محبت نہ رہے تو آفتاب اپنی حرارت کھو بیٹھے روانی سے بہتے ہوئے دریا تھم جائیں ۔ ہوا کے شریر جھونکے رک جائیں۔ پھول کھلنا چھوڑ دیں اور پرندے چہچہانا۔ زندگی متحرک ہے تو اسی قیمتی جذبے کی بنا پہ محبت حقیقی معنوں میں صرف عورت کرتی ہے کیونکہ اس کا خمیر محبت سے گوندھا گیا ہے ۔

یہ افسانہ یلدرم کے "خارستان وگلستان" کے خاصا قریب ہے ۔ ویسا ہی ماحول ویسی ہی فضا، ویسی ہی پابندیاں مگر مرد و عورت محبت و روح ازل سے جس نہ ٹوٹنے والے بندھن میں بندھے ہیں وہ فاصلوں کے باوجود انہیں قریب سے قریب تر کر دیتا ہے۔ قربت کی خواہش تڑپ و اضطراب ہی میں اصل حسن ہے بقول ڈاکٹر اے۔ بی اشرف :-

"کہکشاں کا ایک سانحہ، یلدرم کے افسانے "خارستان وگلستان" کی یاد دلاتا ہے۔ یعنی حسن کو عشق کی دسترس اور جسمانی ملاپ سے دور رکھنے کی خواہش نیاز اپنے رومانی افسانوں میں حسن کے حصول اور قربت سے زیادہ اس کی طلب اور جستجو کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ پانا ان کے نزدیک معراج نہیں ، پانے کی چاہت ان کا مقصود و منتہا ہے۔"[1]

"ایک مصلح بت تراش" دراصل "دنیا کا اولین بت ساز" کی تھوڑی سی بدلی ہوئی شکل ہے۔ تب جو نطر تا بت ساز و بت تراش ہے۔ پتھر کے بت میں اپنے پیار و محبت سے جان ڈالتا ہے مگر اس کے ایثار و وفا کی ناقدری کرتے ہوئے، نازک پھول سے جسم کو چھڑی سے مارتا ہے تو وہ دوبارہ پتھر میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔ عورت جسم کا نہیں ملکوتی نرمی و نزاکت، محبت اور

---

[1]: "نیاز فتح پوری کی افسانہ نگاری" نگار اکتوبر ۱۹۸۳ء شمارہ ۱۰ ص ۲۸

وفا کا نام ہے۔ یہ وہ شاہکار مجسمہ ہے جس نے شہاب کو عظیم بُت تراش ثابت کیا یہ کہ۔

"ایک عورت جو ہزار دُشواریوں سے کچھ سامان غذا فراہم کر سکی ہے۔
بوسیدہ لباس میں اپنے اندھے شوہر کے سامنے کھڑی ہوئی دن بھر کی
محنت کا ثمرہ پیش کر رہی ہے۔ اور اپنے دونوں چھوٹے بچوں کو جو بھوک
سے بیتاب ہو کر اُس سے لپٹے جاتے ہیں، ہاتھ سے علیحدہ کر رہی ہے
تاکہ سب سے پہلے شوہر کی بھوک دُور کرے جس کے لئے ہندوستان کی عورت
جان دے دینا بھی ادنیٰ خیال کرتی ہے۔[1]"

اے عورت تیری عظمت کو سلام۔ محبت صرف اور صرف تجھ سے عبارت ہے۔ عورت نام اُس کے حسن جسمانی اور تناسب اعضا کا نہیں بلکہ حسن صفات کا ہے۔ ایک مؤثر، دل میں اتر جانے والی کہانی، جو ہمارے معاشرے کی ہر عورت کی کہانی ہے۔ یقیناً اُسے نیاز سے بہتر قلم میسّر نہ آ سکتا تھا۔ "روح کی فریب کاریاں عالمِ محبت میں" "شاہزادہ خرم اور ابابیل" اور "نوجوان شہزادہ" طبع زاد نہیں بلکہ آسکر وائلڈ کے افسانوں سے ماخوذ ہیں۔ نیاز وائلڈ کے رومانی تخیلاتی اور خوب صورت داستانوی انداز سے بہت متاثر ہیں۔ یہ انداز جس میں تخیل و تصور کی نزاکتیں بھی ہیں اور حقیقی زندگی کے مختلف ادھورے پہلو بھی، جو لفظوں کے خوب صورت پیراہن میں مکمل شاہکار دکھائی دیتے ہیں۔

"روح کی فریب کاریاں عالمِ محبت میں" محبت کا ایک ماورائی، طلسماتی قصہ، جس کا طلسمِ خیال ہمارے ذہن پہ ایسا جادو بھرا جال پھینکتا ہے کہ ہم چاہیں بھی تو محبت کے اس عالم میں رُوح کی فریب کاریوں سے نہیں نکل سکتے۔ ایک غریب ماہی گیر سمندر سے مچھلیاں پکڑتا ہے۔ ایک روز جال پھینکا تو دخترِ آب سمندر کی پری جال کا مقدر بنی۔ اُس کے حسن و جمال کا تذکرہ

[1] "ایک مصلح بُت تراش" نگارستان ص ۱۴۳

نیاز نے یوں کیا ہے گویا اُن کا قلم مسحور ہے اور حسن کے سامنے سربسجود۔

"اُس کے بال ایسے تھے جیسے بھیگا ہوا سنہرا ریشم، اور جو بال ذرا الگ ہو گیا
تھا وہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیشے کے پیالے میں باریک سونے کا تار
اس کا جسم سپید تھا جیسے چنبیلی اور اس کا نیچے کا حصہ جیسے چاندنی اور موتی
۔۔۔ اس کے کان گویا صدف تھے اور اس کے ہونٹ جیسے بالکل مونگا۔[2]"

ایسے مجسمۂ حسن پہ کون فدا نہ ہوگا۔ لیکن دخترِ آب کی یہ شرط کہ جب تک ماہی گیر اپنی روح کو جدا نہ کرے وہ ایک دوسرے سے نہ مل پائیں گے۔ رُوح اپنی جُدائی اور تنہائی پہ مضطرب و اُداس ہے۔ چنانچہ وہ تین سال اپنی فریب کاریوں سے مسحور کرتی رہی۔ بالآخر ماہی گیر میں دوبارہ سما گئی۔ سمندر کی پری فراق کا یہ عظیم دُکھ برداشت نہ کر پائی۔ لہروں نے بے جان لاش کو ماہی گیر کے قدموں میں لا پھینکا۔ نوجوان ماہی گیر نے محبت کی اُس دیوی کے قدموں میں جان دے دی اور اب محبت کی اُس قربانی پہ:

"ایسے پھول منتشر ہیں جو اس سے پہلے نظر نہ آتے تھے۔ ہر شخص ان کو سونگھ
سونگھ کر بیتاب ہوا جاتا تھا۔[3]"

یہ سُندر پھول محبت و عقیدت کے گلاب ہیں جو صدیوں انتظار کرتے ہیں۔ چاہت کی خوشبو بھری یہ مست بہار جب فضا پہ چھا جائے تو اسے کبھی خزاں نہیں آتی۔ اس لئے کہ محبت مر کے بھی زندہ ہے، اَمر ہے، لازوال ہے۔

"شاہزادہ خرم اور ابابیل" انسانیت سے محبت کے جھلملاتے ستاروں اور خوب صورت آرزو کے خوابوں کی کہانی ہے۔ جو ایک ارفع مقصد بھی رکھتی ہے کہ انسانی ہمدردی اور بنی نوعِ انسان سے محبت، جہاں کائنات کی سب سے بڑی عبادت ہے وہاں خالقِ کائنات کے

[2] "رُوح کی فریب کاریاں عالمِ محبت میں" نگارستان ص ۱۶۸-۱۶۹

نزدیک سب سے بیش قیمت شے بھی ہے۔ خدا کے ہاتھ محبت بھرے دل کو کبھی نہیں چھو سکتے۔ شہزادہ خرم جو سونے کا بُت ، جس کی آنکھیں قیمتی نیلم ، جس کی تلوار میں لعل جڑے ہیں ، اُسے اہلِ شہر سے شکایت ہے کہ :-

"میرا بُت یہاں اس قدر بلند نصب کر دیا کہ میں اپنے شہر کی تمام برائیاں اور تمام مصائب خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور ہر چند میرا دل سیسہ کا بنا ہوا ہے لیکن پھر بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا"[1]

ایک ننھی معصوم ابابیل وہاں قیام کرتی ہے۔ شہزادہ اُس کی وساطت سے اپنے نیلم لعل اور سونے کے پتّرے مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرواتا ہے۔ ٹھنڈی یخ بستہ ہواؤں اور برف کے گالوں سے ابابیل کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ شہزادہ کا سیسہ دل پھٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ امیر بلدیہ اس بدصورت بُت کو اس بلندی سے ہٹا کر بھٹی میں پگھلانے بھجوا دیتا ہے۔ مگر دل ہے کہ پگھلتا ہی نہیں شہزادے کا دل قریبہ پر پھینک دیا جاتا ہے جہاں ابابیل کی لاش پہلے سے پڑی تھی مگر دونوں کی رفعت دیکھئے :-

"خدا نے اپنے فرشتوں میں سے ایک کو حکم دیا کہ جاؤ اس شہر میں جو سب سے بیش قیمت دو چیزیں ہوں وہ میرے پاس لاؤ۔ فرشتہ ، اداس سیسہ کا دل اور ابابیل کی لاش اُٹھا لے گیا۔ خدا نے فرمایا بے شک تم نے نہایت صحیح انتخاب کیا۔ میری فردوس میں یہ پرندہ ہمیشہ چہچہاتا رہے گا اور میرے شہرِ زرنگار میں شاہزادہ خرم ہمیشہ میری حمد و ثنا میں معروف رہے گا"[2]

اس کہانی کو اگر "نگارستان" کا دل کش نگارخانہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں

1: "شہزادہ خرم اور ابابیل" نگارستان ص ۲۲۴
2: ایضاً ص ۲۲۵

مقصد کی رفعت و بلندی بھی ہے اور تخیل و رومان کا سحر بھی۔ لفظوں کی خوب صورت شفاف موتیوں جیسی ترتیب بھی ہے اور خیال کی رعنائی بھی۔ گو مرکزی خیال آسکر وائلڈ کا ہے مگر نیاز ہی کے جنبشِ قلم کا معجزہ محسوس ہوتا ہے۔

"ستی" ایک سو اشرفی افسانہ جو محبت ، ایثار و قربانی کی جان گداز کہانی سمیٹے ہے۔ یہ محبت ایثار دو ناتخیلی داستوری دُنیا کا کوئی دلکش فسانہ نہیں بلکہ ہمارے گرد و پیش کی معاشرتی زندگی کا المیہ ہے۔ ایسی زندگی جو جیتے جاگتے ، سانس لیتے انسانوں کی زندگی ہے۔ سوشیلا اور رنجور ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ یہ محبت اُن کی رگ رگ میں خون کی طرح سرایت کر چکی ہے۔ محبت کی یہی حیات بخش حرارت اُنہیں زندہ رکھے ہے۔ سوشیلا کی بہن تارا رنجور کو چاہتی ہے لیکن محبت کا جواب محبت سے نہ ملنے پر یہ جان لیوا غم اس کو بیمار کر دیتا ہے۔ سوشیلا بہن کی خاطر اپنی محبت قربان کر دیتی ہے اور رنجور سے اپنی محبت کی بھیک مانگ کر دونوں کی شادی کرا دیتی ہے۔ خود ترکِ دُنیا اور زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے لیکن :-

"باوجود اس ترکِ دُنیا کے بھی ، جب کبھی محبت کا نام اس کے سامنے لیا جاتا ہے ، حتیٰ کہ کوئل کی آواز ، کسی پپیہے کی صدا بھی جب اُس کے کان میں آجاتی ہے تو وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کا دل اب بھی پھنک رہا ہے اور وہ اب تک ایک "ستی" ہونے والی بیوہ کی طرح آگ میں جل رہی ہے"[1]

ایثار و قربانی کی اس حقیقت سے بہت قریب دُنیا میں سوشیلا کا کردار تاریخی روایتی ہے کہ بہن ، بہن کے لئے ، بھائی ، بھائی اور دوست ، دوست کے لئے ایسی قربانیاں دیتے ہی آئے ہیں۔ محبت ، قربانی سے ہی جلا پاتی ہے۔ یہ ہماری معاشرتی زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے جسے نیاز نے بڑے ہی حقیقت پسندانہ انداز و اسلوب میں بیان کر دیا ہے۔ "عکسِ گذشتہ"

1: "ستی" نگارستان ص ۲۱۹

"اور چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ" "محلہ کی رونق" انشائیہ نما افسانہ ہیں۔ انشائیہ نما اس اعتبار سے کہ ان میں مسئلہ کی سنجیدگی کے ساتھ ساتھ شگفتگی و طنزیہ انداز ملتا ہے جن میں ہنسنے مسکرانے کے مواقع بھی ہیں اور یہ ہمیں سوچ بچار پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

"وقتے بخیر گذشت" ایک مختصر کہانی جس میں محبوبہ کے ساتھ خوب صورت شام میں خوب گزرتے نمو دیکھتے ہوئے۔ رنگے ہاتھوں بیوی کے ہاتھوں پکڑے جانے سے جو شرمندگی، ندامت و خفت، ایک شوہر کو اٹھانا پڑتی ہے اُسے لطیف مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ میاں صاحب کو جب یہ پتہ چلتا ہے کہ اس چھاپہ کی اطلاع بھی بیوی کو خود اُن کی محبوبۂ دل نواز نے پہنچائی تھی تو بیوی کو دیوی اور محبوبہ کو تیرہ بخت سمجھا جاتا ہے۔ ایک سماجی ناہمواری مگر اب محبوبائیں، بیویوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کی نوبت نہیں دیتیں۔ ورنہ یہی پکڑے جانے پہ شوہر اتنی مسکینی اور شرافت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بہرحال ایک خوشگوارانہ انداز ایک بڑی حقیقت کو سمیٹے ہے۔ گویا نیاز تلخی کو شیرینی میں لپیٹ کر خوب صورتی سے پیش کرنے کے فن سے بھی آشنا ہیں۔

"چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ" نیاز کی اُس زندہ جاوید نفرت کا اظہار ہے جو انہیں ہم نام مولویوں اور جبہ و دستار کے تضاد کا شکار حقیقت سے ہے۔ یہ لوگ بظاہر فرشتہ مگر حقیقت میں شیطان۔ ان کے سفید بُراق لباس اور لمبی داڑھیوں میں میلی، کثیف روحیں چھپی ہیں۔ نیاز نے ایسے ہی حضرات کے خلاف اپنے قلم سے بھرپور جہاد کیا ہے اور جہاں جہاں جب جب انہیں موقع ملا ہے انہوں نے طنزیہ، تیکھے اور چبھتے ہوئے انداز میں ان کے پردے کھولے ہیں۔ "چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ" ایسے ہی منافق مولویوں سے نفرت کا اظہار ہے۔

"دنیا میں سانپ اور مولوی دو چیزیں ایسی ہیں جن کی قسموں کی انتہا نہیں
البتہ فرق یہ ہے کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور مولوی الا ماشاء اللہ کہ یہ
حال ہے کہ

ہر کرا جامہ مولوی بینی ؎
در روش صد ہزار مار انگار [1]

"محلہ کی رونق" ایک کرداری افسانہ جو میرزا ماش کے کردار کے گرد گھومتا ہے۔ جن کی بدمزاجی اور بدمزاجی سے ہر وہ بڈھا، بچہ اہل محلہ سب تنگ ہیں۔ بات بات میں تنقید اور منفی پہلو نکالنا اُن کا شغلۂ خاص۔ مگر ایک دن اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے موت کی آغوش میں پہنچ گئیں۔ سب نے سکھ کا سانس لیا مگر اب محلہ خاموش ہے اس لیے کہ محلہ کی رونق انہی کے دم سے تھی۔

"دو گھنٹے جہنم میں" ایک خوب صورت، عبرت ناک افسانہ ہے۔ نیاز نے جہنم کے منظر کو بھی اس نفاست و خوب صورتی سے قلم بند کیا ہے کہ بلاشبہ وہاں کی سیر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ ایک تصوراتی جہنم ہے جس کی منظر کشی کرتے ہوئے نیاز نے اپنے مخصوص انداز کو نہیں چھوڑا۔[2]

"آگ کی گرمی سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سُرخ آندھی چھائی ہو۔ جا بجا
چنگاریوں کے بگولے بلند ہو رہے تھے اور کہیں کہیں آگ کے فوارے چھوٹتے
جن میں سے بعض تاریک تھے اور بعض بالکل سفید۔ اس طرح اُٹھ رہے تھے
جیسے طوفان میں سمندر موجیں لے رہا ہو۔"

جہنم کے ان دو گھنٹوں میں نیاز نے فرعون، ہامان، شداد، قارون، نمرود، سامری، ضحاک کی عذاب ناکیوں کو دیکھا۔ ملکہ کلیوپٹرا نہ صرف حسن و جمال کے جادو بکھیرتی، خوب صورت سازشوں کے جال پھیلاتی ہی اُن کی کشش کا باعث نہ تھی، بلکہ اس جہنم میں بھی وہ اس کے پیکرِ حسن سے متاثر ہوئے

[1] "چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ" نگارستان ص ۲۶۲
[2] "دو گھنٹے جہنم میں" نگارستان ص ۲۹۳

بغیر نہ رہ سکے۔ وہ اُس کے پاس کافی وقت صرف کیا:

"یہ بُت کھلونا سا تھا۔ بلند و بالا، پُرشباب، آشفتہ گیسو، اور سَر سے پاؤں تک بالکل عُریاں و بے پردہ ـــ اس کے تمام جسم پر چھوٹے چھوٹے آبلے موتی کی طرح جھلک رہے تھے۔ بتوں سے خُون کے قطرے اور آنکھوں سے عنابی رنگ کے آنسو ڈھلک ڈھلک کر آبلوں پر رنگین خط ڈالتے ہوئے نیچے گر رہے تھے گلے میں سفید انگاروں کا ہار پڑا ہُوا، آگ کی لپٹ سے جُنبش میں آکر جسم سے مَس کرتا تھا اور ہر بار اس کے گورے گورے جسم پر ایک سُرخ نشان چھوڑ جاتا تھا۔ اس عالم میں بھی اس پر ایک شاہانہ جمال کا رنگ تھا۔"[1]

اس کے بعد ہندوستانی شعرا میرؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ، آتشؔ اور غالبؔ سے ملاقات ہوتی ہے۔ غالبؔ یہاں بھی فطری شگفتگی و بذلہ سنجی سے باز نہیں آتے۔ اور بتایا کہ انہیں اس مصرع

ع دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

کی وجہ سے جہنم میں ڈالا گیا ہے۔ خدا جانے فرشتوں نے پہلا مصرعہ خدا کو کیوں نہیں سُنایا۔ غالبؔ سے ملاقات سب سے طویل ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نیازؔ حقیقتاً غالبؔ اور اُن کے فلسفۂ شعر سے بہت متاثر ہیں۔ جس خوب صورتی سے نیازؔ نے جہنم کے اِن دو گھنٹوں کا پُرلطف تذکرہ کیا ہے یہ جہنم کسی طور پر بھی محسوس نہیں ہوتی۔ وہی رُومان کی گرمی و جوش اور وہی انشا کی دلکشی اندر موجود ہے۔

جمالستان "جمالستان" نیازؔ کے افسانوں کا سب سے اہم مجموعہ ہے۔ یہ اوّلاً جنوری ۱۹۳۴ء میں نگار بک ایجنسی لکھنؤ کی جانب سے شائع ہُوا۔ ۱۹۶۰ء میں عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن اور

[1] "دو گھنٹے جہنم میں" ـ نگارستان ص ۲۹۱

نگار بک ایجنسی کی جانب سے اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۱ء کا ایڈیشن نگار کی جانب سے ہی شائع ہُوا، بھی میری نظر سے گزرا۔ اس میں تیس رُومانی، معاشرتی، سماجی اور اصلاحی کہانیاں ہیں: "دُنیا کا آخری بُت ساز"، "ایک شاعر کی محبت"، "زہرہ کا پجاری"، "درسِ محبت"، "مطربۂ فلک"، "ایک شاعر کا انجام"، "شبستان کا قطرۂ گوہر"، رُومانی و جمالیاتی افسانے ہیں۔ جب کہ "شہیدِ آزادی"، "دو خط"، "ازدواج مکرر"، "سودائے خام"، "۱۵ کا صوفی"، "فریبِ خیال"، "بعد المشرقین"، "جان عالم اور ملکہ مہرنگار"، "چنگاری"، "صدائے شکست"، "ایثار"، "خدا کا انصاف" اور "فسانۂ فردا" معاشرتی، اخلاقی اور اصلاحی کہانیاں ہیں۔ نیازؔ نے رُومان اور تخیل و تصور کے ساتھ ساتھ حقیقی مسائل اور تلخ حقیقتوں کو بھی سامنے رکھا ہے۔

"شہیدِ آزادی" مشرق کی ایک رابعہ کی کہانی ہے جو آزادیِ نسواں کی حامی، مغربی تہذیب و اطوار کی پرستار ہے۔ جیسے ظاہری نمود و نمائش، لباس، میک اپ، سستی شہرت کے لئے غزلیں اور مضامین لکھنا اسے بے حد پسند ہے۔ لیکن اُس کا شوہر رشید جس کے نزدیک:

"بیوی کا مفہوم ایک ایسے انیس و ہمدم کا تھا، جو ہرا بھی ہوا ور اندھا بھی اُس کی ساری دُنیا صرف شوہر کی ذات ہو، اور اُس کے جملہ مشاغل کا منتہا شوہر کے اسباب و آسائش کی فراہمی ہو۔"

رابعہ اس کے برعکس جسمانی پیچ و خم، صنعت گری اور ناز و ادا ہی کو بیوی کا منصب سمجھتی ہے وہ اپنے شوہر رشید کے مقابلے میں اپنے آپ کو برتر سمجھتی ہے۔ گھر اور گھرداری میں قطعاً دلچسپی نہیں لیتی۔ نتیجتاً ایک سرد، خاموش اور خوفناک جنگ دونوں کے درمیان شروع ہو جاتی ہے۔ رشید تنگ آکر ولایت سدھار جاتا ہے۔ رابعہ، حیدر رضا سے اَن دیکھی محبت کرنے لگتی ہے۔ حیدر رضا ایک گھاگ شکاری ہے، خوب صورت لفظوں کے جال میں معصوم رنگ برنگی تتلیوں

[1] "جمالستان" ص ۲۵، ۱۹۵۱ء نگار بک ایجنسی لکھنؤ۔

کو کچلنا، اس کا مشغلۂ خاص ہے۔ رابعہ اُس کے سحر میں گُم، ایمان و اخلاق، عصمت و شرافت کو فراموش کیے، کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہی ہے۔ وہ یکسر بھول چکی ہے کہ وہ ایک مشرقی، وفا شعار، بیوی بھی ہے۔ حیدر رضا سامانِ نشاط، انتہائی کیفیاتِ لذت سے سرشار، رابعہ کے تمام زیورات کا بکس اُٹھائے، اس افسانہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرکے، خاموشی سے بھاگ نکلتا ہے۔ رابعہ کا انجام وہی ہُوا جو عام طور پر ایسی عورتوں کا ہُوا کرتا ہے۔

"اُس کے بعد رابعہ نے کیا سوچا اور کیا کیا، اس کی تفصیل تو معلوم نہیں لیکن شام کے وقت کلکتہ کے ہر اخبار میں یہ عنوان ضرور جلی حرفوں سے نظر آتا تھا کہ:

گرانڈ ہوٹل میں ایک خاتون نے خود کشی کر لی۔"[1]

یہ وہ سماجی و معاشرتی حقیقت ہے، جو مقصد و اصلاح کلیہ ہو جیسے سمیٹے ہے۔ نیاز عورت کی پرستش میں سجدہ ریز ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اُسے وفا، محبت، ایثار، اور مشرقی اقدار و روایت کے اُس دائرہ میں دیکھنا چاہتے ہیں جس سے اُس کی چمک، اُس کے پُر نور رنگ، اُس کی حلاوت تمام تر حُسن اور دلکشی قائم ہے۔ اس کا اظہار انہوں نے جا بجا کیا ہے مگر جتنا مؤثر اظہار یہاں حقیقتوں کے غلاف میں لپٹا ہے، وہ شاید ہی کہیں ملے۔ مثبت و منفی ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مثبت کا پا لینے اور منفیت کو رد کرنے کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ نیاز محض رومانیت کے علمبردار ہی نہیں۔ اُن کے معاشرتی و اصلاحی افسانے بھی اُتنے ہی کامیاب ہیں جتنا کہ رومانی افسانے۔ کا ڈرامائی انجام اثر بڑھانے اور کلائمکس تک لے جانے میں خاصا کامیاب رہا ہے۔ مختصر مگر مقصد میں یہ کوشش اپنی کردار نگاری، مکالمے، پلاٹ، اُسلوب اور سب سے بڑھ کر مقصدیت و افادیت کی بنا پر نیاز کے بے مثل شاہکاروں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ یوں پلاٹ کی مضبوطی، بے ساختگی و برجستگی در سیدھا سادا بیان نیاز کو معاشرتی و اصلاحی افسانہ نگار کا ہم مانند گ

---

[1] ۔ "جمالستان" ص ۹۹، سنہ ۱۹۵۱ء نگار بک ایجنسی لکھنؤ

بھی دلاتا ہے۔

"سودائے خام" مقصدی و اصلاحی افسانہ ہے۔ جس کا موضوع غلط قسم کی مذہبی تعلیم ہے کہ محض دین سے دُنیا کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ زندگی ایک نازک، اُلجھی ہوئی، سنگین کہانی ہے۔ اور اس زبردست چیلنج کا مقابلہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب مذہب اور زندگی ساتھ ساتھ چلیں۔ "سودائے خام" ایک کرداری افسانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ساری کہانی اس کے ہیرو اسلم کے گرد گھومتی ہے۔ اُس کا کردار ارتقاء پذیر ہے۔ قدم قدم پر نئے نئے رُوپ دھارتا ہے۔ ابتدا میں وہ ایک ایسا مذہب پرست انسان ہے جو فرائض ملازمت کے مقابلے میں عبادت کو ترجیح دیتا۔ نماز، روزہ کا پابند، اُس کا دل تصنع سے پاک، زندگی کا نصب العین، صداقت پرستی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اپنی ہر مشکل کا حل عبادت میں ڈھونڈتا۔ حادثاتِ زمانہ، باپ اور بھائی کی موت سے وہ مذہب سے بالکل منحرف ہو جاتا ہے۔ خوفِ خدا اُس کے دل سے جاتا رہتا ہے۔ گھنٹوں خدا کی حمد و ثنا میں صرف کرنے والا یہ نوجوان، اب اپنی عبادت و ریاضت کو حماقتوں کے نام سے یاد کرتا ہے۔ وہ نیکی اور بدی میں کشش محسوس کرتا ہے:

"تجربہ شاہد ہے کہ نیکی کا درخت کبھی پھل نہیں لاتا۔ اور بدی کی بیل نہایت سبز و شاداب ہو کر چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہُوا کہ خدا نے دُنیا کو پیدا کرکے، انسانوں کے سپرد کر دی ہے۔ اور اُن کو اختیارِ کامل عطا کر دیا ہے جو چاہیں کریں اور جس طرح مناسب سمجھیں اپنی زندگی بسر کریں۔"[1]

انہی نظریات کے تحت وہ سود، ریس، رشوت اور ناجائز کاروبار کرتا ہے۔ قدرت کی طرف سے اُسے اور ڈھیل ملتی ہے کہ وہ مٹی کو بھی ہاتھ لگاتا تو سونا بن جاتی۔ مگر ڈھیل دینے والا او

---

[1] ۔ "سودائے خام" "جمالستان" ص ۹۹، سنہ ۱۹۵۱ء نگار بک ایجنسی لکھنؤ

رسّی دراز کرنے والا، اُسی رسّی کو گلے کا پھندا بھی بنا دیتا ہے۔ ایک گہری سازش کے تحت اسلم نے اپنے خستہ مکان کا بیمہ ۱۵ لاکھ میں کرایا۔ اور خود ہی اُس میں آگ لگا دی۔ پھر جس مُجرم کو دُنیا کی عدالت قید کی سزا کا حکم سُنانے والی تھی، آسمانی عدالت نے اُس سے زیادہ سخت سزا دینے کے لیے اُسے اپنے رُوبرُو طلب کرلیا۔ افسانہ اس نتیجہ پر ختم ہوتا ہے

"دیانت کے ساتھ فاقہ کرنا بے ایمانی کی سلطنت سے بدرجہا بہتر ہے۔"[1]

نیاز نے اگرچہ براہ راست اصلاح پر بہت کم قلم اُٹھایا ہے۔ وہ اخلاقیات کے گرد خوب صورت و مؤثر کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ مگر یہاں شدید قسم کا اخلاقی و اصلاحی رویہ ملتا ہے۔ شاید اُن کا مقصد ہی معاشرہ کی ایک تلخ حقیقت کو بے نقاب کرتے ہوئے اخلاق کی تبلیغ و تلقین ہے۔ یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہانی کے نتیجہ یا ضرب المثل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردگرد کہانی کا دائرہ کھینچ دیا گیا ہے۔ طویل مکالمے اور اخلاقی درس نے افسانے کے پلاٹ و حُسن کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ بیان سیدھا سادا ، بے ساختہ اور رواں ہے مگر لمبی لمبی تقریروں سے افسانے کا حُسن مجروح ہوا ہے۔

"۲۵ء کا صوفی" مولانا وارث علی شاہ، اور مسرور شاہ نظامی ہی کا عکس نظر آتا ہے۔ "۲۵ء کا صوفی" فوقؔ شاہ، اُس نام نہاد طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جو اپنے مکروفریب اور سیاہ چہرے پہ تقدس اور رُوحانیت کا ماسک پہنے ہوئے ہیں۔ نیاز نے زندگی بھر ایسے جھوٹے مولویوں کے خلاف پُرزور جہاد کیا۔ اور اُن کے چہروں کو بڑی بے خوفی اور بے باکی سے بے نقاب کیا ہے۔ یہ ایک ایسے ہی فریبی و دغاباز کی کہانی ہے جو مذہب کے تقدس کی چادر اوڑھے ہے۔ چشتیہ خاندان کا یہ بُزرگ، جو ظاہری طور پر نہایت وسیع الاخلاق، خندہ رُو، متواضع اور منکسر قسم کا انسان ہے۔ جو ایک حسین و جمیل امیر طوائف گلنار کو اپنے ناپاک پھندے میں پھانستا

---

[1] "وداتِ نام" جمالستان" ص ۱۲۲

ہے ... نے جعل کا رناموں سے اُس کے خاندان کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔ فوقؔ شاہ کے ... یہ خاندان اجمیر شریف کے عُرس پہ نکلتا ہے۔ اُدھر فوقؔ شاہ اُن کے گھر کا سارا مال و اسباب لے کر ... آتا ہے۔ ... وہ نقطۂ عروج ہے جہاں فوقؔ شاہ کی شخصیت سے پردہ اُٹھ جاتا ہے ... کہانی ایک بھرپور طنز ہے اُس طبقے پہ جو آج بھی ہمارے معاشرہ میں موجود ہے۔ فوقؔ شاہ ایک جیتا جاگتا کردار ہے اور نیاز ایسے ہی لوگوں کے مکروفریب سے سادہ لوح انسانوں کو بچانا چاہتے ہیں۔ طنز کی کاٹ گہری مؤثر ہے سیدھے سادے انداز کی یہ کہانی ایک منفرد نصب العین رکھتی ہے۔

نیازؔ کے خیال میں محبت، وفا اور ایثار کائنات و زندگی کی اساس ہیں۔ اور جب یہ علم مجسمہ یعنی عورت میں جمع ہو جاتے ہیں تو کسی مادی اور دُنیاوی تعلیم کی ضرورت نہیں رہتی۔ عورت کی سب سے اعلیٰ ڈگری اور فن ہی محبت و قربانی ہے۔ اس کا اظہار خاص طور پر "فریبِ خیال"[1] میں کیا ہے۔ رشیدؔ ایک عام شکل، عام تعلیم اور عام طبقہ کا فرد، جو مغربی تعلیم و تہذیب سے بے حد متاثر ہے۔ جو اپنی سیدھی سادی، اَن پڑھ مگر بے حد محبت کرنے والی بیوی اور بچی سعیدہ سے نالاں ہے۔ وہ اپنی بیوی کی محبت بھری تحریر سے بیزار ہے۔ اتنا بیزار کہ:

"اللہ تجھ خیریت چاہنے والی کو دُنیا سے اُٹھا لے یا مجھے۔ کہ پھر دوبارہ یہ فقرے نظر سے نہ گزر سکیں۔ اسی انداز تحریر پر میری خیریت چاہی جاتی ہے زہر دے کر مزاج پُرسی کی جاتی ہے۔ بار بار کہا کہ خط نہ بھیجا کریں لیکن اظہار محبت کی تکمیل بھلا بغیر میری جان لیے کیونکر ہو سکتی ہے۔"

رشید ہر لمحہ روپ بہروپ بدلنے والی، مادیت و دولت کی پجاری، نسیمؔ پہ فدا ہو جاتا ہے جو مغربی تہذیب کی دِل دادہ ہے۔ رشیدؔ اپنی ساری دولت نسیمؔ پہ اور اُس کی فرمائشوں پہ

---

[1] "فریبِ خیال" جمالستان ص ۱۵۱۔ ۱۹۵۱ء، نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ڈا دیتا ہے۔ رشید پھر تنہا ہے کہ وہ اُسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کے، نئے شکار کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔ رشید کے بچپن کا دوست محمد یوسف، رشید کا ہم خیال، اُسے اپنی [illegible] محبوبہ لوسی سے ملانے کے لئے بُلاتا ہے۔ رشید پہ بجلی گرتی ہے کہ مس لوسی دراصل نسیم کا دوسرا رُوپ ہے۔ یہ افسانہ کا کلائمکس ہے۔ وہ شدید بیمار پڑ گیا ہے۔ ایسے میں بقول اُس کے اُس کی جاہل، گنوار اور اَن پڑھ بیوی وفا کی دیوی [illegible] رات ایک کئے اُس کی تیمارداری کر رہی ہے اور وہ اب سوچ رہا ہے:

"وفا کا وجود دُنیا سے اب یکسر محو نہیں ہوا ہے۔ اور اگر اتنی تکلیف برداشت کرنے کے بعد کوئی شخص اُس کی لذت سے آشنا ہو سکے تو سودا بُرا نہیں"[1]

نیاز نے ہمیشہ تصنع، بناوٹ اور کھوکھلے رویّوں کے خلاف قلم اُٹھایا ہے۔ وہ تعلیم جو عورت سے اُس کا نسائی حُسن چھین لے، نیاز اُس کے مخالف ہیں۔ وہ عورت کو شوہر پرست اور گھر کو محبت کا گہوارہ بنانے کا درس دیتے ہیں۔ وہ عورت جو اپنا اصل مقام بھول کر کلبوں کی مصنوعی روشنیوں میں آتی ہے وہ دراصل اپنی حقیقی منزل سے بھٹک جاتی ہے۔ بالآخر معاشرے کے لئے ایک مستقل خطرہ بن جاتی ہے۔ نیاز یہی آدرش لئے "فریبِ خیال" کی تخلیق کرتے ہیں۔ افسانہ کی دلچسپی نت نئے واقعات میں ہے اور انجام جاننے تک قاری سانس روکے روانی سے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اُسلوب سادہ اور بے ساختہ ہے مگر کہیں کہیں اُن کا جمال پرست و اُسلوب پرست قلم لفظوں کی خوب صورت گل کاری کرتا ہے:-

"سارا عالمِ نباتات گُل فروش نظر آ رہا ہے۔ اور ہر ذرّہ تبسم فروش، پہاڑوں کی برف پگھل پگھل کر دریائے جہلم اور ڈل جھیل کی امواج کی خنک رعنائیوں میں گرمیٔ خرام پیدا کر رہی ہے۔ اور ہوا کا ہر جھونکا گویا موجِ خرامِ یار ہے

---

[1] : "فریبِ خیال" جمالستان ص ۱۰۰

جو ہر جُنبش پر گل کتر کر گزر جاتا ہے"[1]

نیاز روشن خیال اور وسیع النظر عالم و مفکر ہیں۔ وہ مذہبی تعصب اور تنگ نظری کو قطعاً پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی بھر اُن کا قلم نام نہاد مُلّاؤں کے خلاف بڑے جوش، روانی اور مضبوطی سے چلتا رہا۔ اُن کے خیال میں اسلام ایک نرم، آزاد اور دلکش مذہب ہے۔ لیکن اِسے کاروبار بنانے والے ٹھیکے داروں نے حقیقی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا ہے جس سے نوجوان نسل میں بغاوت و سرکشی کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ یہ موضوع ہے اُن کے افسانہ "بعد المشرقین" کا، جس میں ایک نازک مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ جو ہر حساس و باشعور ذہن کو سوچنے پہ مجبور کرتا ہے۔

اقبال ایک پڑھی لکھی، سُوجھ بُوجھ رکھنے والی، روشن خیال لڑکی ہے۔ جس کا نکاح بچپن میں چچا زاد سعادت علی سے ہو چکا ہے۔ سعادت علی جو دیوبند سے دستارِ فضیلت لے کر آئے ہیں اور "مولانا" کہلائے جاتے ہیں جو روایاتی مولانا ہیں۔ لمبی داڑھی، سر پہ ٹوپی، ٹخنوں سے اونچا لباس، حالانکہ بقول نیاز:-

"اگر دینی و مذہبی تقشف کوئی اچھی چیز ہے تو اِس کا تعلق انسان کے خیال و احساس سے ہونا چاہیئے نہ کہ لباس و وضع سے"[2]

سعادت علی لباس و وضع سے یقیناً مسلمان ہیں۔ مگر خیال و احساس کے لحاظ سے اسلام سے بہت دُور ہیں۔ وہ نماز، روزہ کے پابند مگر مرد کو حاکم، عورت کو محکوم اور ناقص العقل سمجھتے ہیں جسے مرد کی برابری کا کوئی حق نہیں۔ اُنہیں عورت کی آواز بھی پردہ سے باہر جانا گوارا نہیں۔ وہ شریعت کے پابند مگر فلسفۂ اخلاق سے اُتنا ہی دُور حالانکہ:-

---

[1] : "فریبِ خیال" جمالستان ص ۱۰۴، ۱۹۵۱ء، نگار بُک ایجنسی لکھنؤ

[2] : "بعد المشرقین" ایضاً ص ۱۹۳

"اگر ایک مولانا نام ہے خشک چہرہ، پُرشکن پیشانی، اور خونخوار صورت کا، تو یقیناً وہ رِند اچھا ہے جو شراب پیتا ہے لیکن اپنے اخلاق سے نظامِ تمدن کے قیام میں اعانت کر رہا ہے۔[1]"

اقبال تنسیخِ نکاح کا دعویٰ کرتی ہے۔ عدالت کا فیصلہ اُس کے خلاف ہے مگر اُس کی آواز بجلی بن کر نام نہاد اسلام پسندوں پہ گرتی ہے۔

"اگر کل مسلمان ہونے کی حیثیت سے اِسلامی قانون کی پابند تھی۔ تو آج عیسائی ہونے کے لحاظ سے مسیحی قانون کی پابند ہوں اور مسیحی قانون مجھے انتخابِ شوہر کے لئے مسئلے میں بالکل آزادی دیتا ہے۔[2]"

شہرِ خموشاں میں ہر فرد کی زبان گنگ ہو چکی ہے۔ وہ متحیر، اُن کے ذہن سُن ہو چکے ہیں۔ کوئی دماغ یہ نہیں سوچ سکتا کہ کہانی ایسی دردناک و عبرت ناک ٹریجڈی پر ختم ہوگی۔ یہ اُس طبقہ کے مُنہ پر یقیناً نفرت بھرا تھپڑ ہے جس نے اِسلامی تعلیمات کو تنگ نظری، تعصب اور فرقہ پرستی کے سُپرد کر دیا ہے۔ حالانکہ اِسلام میں بھی اِنتخابِ شوہر کے سلسلے میں پوری آزادی ہے یہ اس دَور کا ہی مقدمہ نہیں بلکہ آج کا اہم مسئلہ بھی ہے۔ نیاز کے مفکرانہ قلم نے اسے جس انداز میں پیش کیا ہے اُس سے ہر حسّاس دِل تڑپ اُٹھتا ہے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہم ظاہر پرستی سے ہٹ کر ذہنی، رُوحانی اور اخلاقی طور پر مذہبِ اسلام کی تقلید کریں۔

"ایک شاعر کا انجام" رُومانی و ماورائی کہانی ہے۔ مختصر سے اس افسانے کا لفظ لفظ رُومان و جمال میں ڈوبا ہُوا ہے۔ یہ ایک خوب صورت خیالات رکھنے والے، نازک و حسّاس اور تڑپتے ہوئے بے قرار دِل کا قصہ ہے۔ جس کے خوب صورت افکار و اشعار جیوپڑ دیوتا کو جگاتے ہیں۔

۱۔ بعد المشرقین بہارستان ص ۲۰۵، ۱۹۵۱ء نگار بک ایجنسی لکھنؤ

۲۔ ایضاً ص ۲۰۵

دولت کی دیوی تمام تر دولت کے عوض جیوپڑ کی بیداری چاہتی ہے۔ مگر حسّاس شاعر دولت کا پجاری نہیں۔ اِس لئے اِنکار کر دیتا ہے۔ شہرت، موسیقی، اور حُسن و شباب کی دیویاں باری باری اپنا جادو جگاتے ہوئے ایک ہی التجا کرتی ہیں مگر شاعر کا کہنا ہے:۔

"میری رُوح بالکل شل ہو گئی ہے۔ میرا دل برف سے زیادہ سرد ہو گیا ہے ایسا سرد کہ شاید اب کوئی دُنیاوی شُعلہ اِس میں گرمی پیدا نہیں کر سکتا۔[1]"

مگر شاعر تڑپ اُٹھا مشرق کی اس وفا پرست عورت کو دیکھ کر جو اپنا تن، من، دھن، اپنے شوہر پہ قربان کر رہی ہے۔ لیکن وہ اُسے سخت جسمانی و رُوحانی آزار پہنچاتا ہے۔ شاعر کے دل سے جگر خراش اور دِل دوز کراہ نکلتی ہے جو جیوپڑ کو بھی بیدار کر دیتی ہے۔ دیویاں شاعر کی تلاش میں دوبارہ نکلتی ہیں تاکہ اُسے تحائف سے نواز جائے۔ وہ ملتا ضرور ہے مگر کس حال میں:۔

"دیویاں جب شاعر کی تلاش میں پھر صحرا کی طرف جاتی ہیں تو اُس کو پتھر پر سر رکھے ہوئے اطمینان کی نیند میں مصروف پاتی ہیں۔ لیکن اس حال میں کہ اس کا کلیجہ شق ہوتا ہے اور دِل سینہ سے باہر۔[2]"

رُومان میں ڈوبی یہ کہانی ایک ظالم اور تلخ حقیقت اپنے اندر چھپائے ہے۔ عورت بلور سے نازک، پھول کی پتی سے زیادہ نرم و لطیف، چھوئی موئی کی وہ کلی جس کا دِل ہوا کے جھونکوں سے بھی دُکھ جاتا ہے۔ نیاز نے اپنی تمام تر تحریروں میں اِس کے نازک آبگینہ سے دِل اور سچے جذبات و احساسات کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اور مرد کا فرضِ اوّلین یہی بتایا ہے کہ وہ ہر لحظہ اِس کا خیال رکھے، اُس کے دِل کو آزار پہنچانے کو سب سے بڑا گناہ جانے۔ اِس خوب صورت کہانی کا حُسن، رُومان و جمال کی فضا کے ساتھ ساتھ خوب صورت و دِلکش اندازِ بیان میں بھی مضمر ہے۔

۱۔ "ایک شاعر کا انجام" جمالستان ص ۲۴۹، بارِ دوم ۱۹۵۱ء نگار بک ایجنسی لکھنؤ

۲۔ ایضاً ص ۲۴۷

"حُسن کی دیوی تمام اُن معطر صباحتوں کے ساتھ جو فردوس ہی کے یاسمن زاروں سے حاصل ہو سکتی ہیں، تمام اِن پاکیزہ نزاکتوں کے ساتھ جو کوثر سلسبیل کے ساتھ جنھیں صرف بہارِ جنت ہی پیش کر سکتی ہے۔ تمام اُن کیفیتوں، شرارتوں اور اداہائے جاں ستاں کے ساتھ جو صرف زرخیز شباب ہی میں نظر آسکتی ہیں لبوں سے شراب چھلکاتی، آنکھوں سے فسوں چھلکاتی، اعضا میں خواہشِ سپردگی، جوشِ جوانی میں التماس فشارہا اور سینہ کی عُریانیوں میں دعوتِ لذات بے اندازہ لئے ہوئے مدشانہ، والہانہ کورانہ، آگے بڑھے ؎۔"

"صدائے شکست" محبت کرنے والے راجکمار کی کہانی ہے جو رجنا کو پوجا کی حد تک چاہتا ہے۔ رجنا کا شوہر مر چکا ہے اور باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے دوسری شادی کی مخالف ہے۔ جس کا وقت بھگوان کی پوجا، مطالعہ کتب، اور موسیقی میں گزرتا ہے۔ رجنا موسیقی پہ خوب صورت اور بصیرت افروز لیکچر دے سکتی ہے تو راجکمار اپنے ساز اور دلکش آواز سے پورے کالج کا دل موہ لیتا ہے۔ وہ رجنا کا خاموش پرستار ہے لیکن محبت میں زبان چُپ بھی ہو تو انگ انگ بولتا ہے۔ رجنا یہ خاموش آواز سُن لیتی ہے مگر قدم قدم پہ راجکمار کو نظر انداز کرتی ہے۔ کالج میں مقابلۂ موسیقی منعقد ہوتا ہے۔ رجنا اور راجکمار دونوں مدِ مقابل ہیں۔ مجمع حیران ہے کہ راجکمار کی آواز اور سُر کو کیا ہو گیا ہے۔ رجنا یہ مقابلہ جیت جاتی ہے۔ راجکمار اِس شکست کے بعد ہمیشہ کے لئے کہیں چلا جاتا ہے۔ رجنا کو راجکمار کے ڈاکٹر سے پتا چلتا ہے کہ وہ اُس سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور مقابلہ میں اُس نے جان بوجھ کر بےسدھ راگ اور سُر کا استعمال کر لیا تھا تاکہ رجنا کو شکست سے بچا سکے۔ راجکمار کی شکست صدا رجنا کی صدائے شکست بن جاتی ہے۔ سچی محبت دونوں کو ایک کر دیتی ہے۔ محبت کی سیدھی سادی کہانی جو سچے جذبوں کے نور کی کرنیں ہمارے دل و ذہن میں بکھیر

؎: "ایک شاعر کا انجام" جمالستان ص ۲۴۶، بار دوم ۱۹۵۱ء، نگار بک ایجنسی لکھنؤ

دیتی ہے۔ کہ محبت کائنات کی عظیم روشنی ہے۔ محبت خدا اور خدا محبت ہے، جذبے ہوں تو اُن کی تڑپ کششِ ثقل کی طرح فراق کے تمام فاصلے پلٹتے ہوئے محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہے۔ نیاز کے پرستارِ محبت قلم نے "صدائے شکست" جیسی خوبصورت کہانی لکھ کر محبت کرنے والوں کو اجلے رُوحانی جذبوں سے آشنا کرایا ہے۔

"ایثار" میں یہ فلسفہ پوشیدہ ہے کہ نکاح کا مقصد صرف ہمدردی و ایثار نہیں بلکہ محبت اور صرف محبت ہے۔ سلیمہ اٹھارہ سال کی نوجوان لڑکی جو ایف۔اے کی طالبہ ہے۔ سانولی سلونی جس کی جوانی ہی اُس کا سب سے بڑا حُسن ہے۔ اپنی بہن شاہدہ کے گھر آتی جاتی ہے۔ شاہدہ کا دیور جعفر اُس سے محبت کرتا ہے لیکن اظہار نہیں کر پاتا۔ اچانک شاہدہ بیمار ہونے کے بعد ملکِ عدم سدھارتی ہے۔ ننھی بچی کی خاطر سلیمہ اپنے بہنوئی سے عقد کر لیتی ہے۔ ایک خط سے جعفر کی گہری محبت کا راز کھلتا ہے۔ تو احمد اُسے آزاد کر دیتا ہے سلیمہ جعفر سے اُس کی بیتابی و اضطراب کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ جواب دیتا ہے:-

"تم اور مجھ سے یہ سوال کرو! کیا شمع کبھی پروانہ سے یہ سوال کر سکتی ہے کیا چاندنی سمندر کے مدّوجزر سے کبھی یہ دریافت کر سکتی ہے کیا کبھی پھول نے بُلبل سے یہ استفسار کیا ہے کیا کبھی سرو نے قمری سے اُس کی بے تابی کا سبب معلوم کیا ہے ؎"

جعفر ایک حادثے میں اپنی بینائی کھو بیٹھا ہے۔ سلیمہ اُس کی آنکھوں کی روشنی بننا چاہتی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ نکاح کا اصل مقصود صرف ہمدردی و ایثار ہے۔ جعفر کے خوددار دل پر سخت چوٹ پڑتی ہے کہ وہ محض ہمدردی رکھتے ہوئے اُس کی ہونا چاہتی ہے۔ اگلی صبح سلیمہ کو جعفر کا سرد اور نیلگوں جسم ملتا ہے وہ سہانے رات کے کس پل کچھ کھا کے اپنی اصل منزل کی طرف روانہ ہو چکا تھا

؎: "ایثار" "جمالستان" ص ۲۹۸، ۱۹۵۱ء، نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نازک سی کہانی جس میں فلسفیانہ رویہ بھی ہے
حساس و نازک جذبات رکھنے والوں کی
کے بھرپور تاثر کا باعث بنا ہے۔
اور نفسیاتی رموز و نکات بھی۔ اس کا المیہ انجام ہی اس
"جمالستان" کے افسانے رومان و جمال کی دُنیا سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور ہماری حقیقی و سماجی
زندگی کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ نیاز نے خاص اصلاحی مقاصد کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ نیاز
کی اصل شہرت کا باعث بھی "نگارستان" و "جمالستان" کے افسانے ہی بنے۔ یقیناً انہوں نے جو کچھ
لکھا "خیالستان" سے ابتدائی طور پر متاثر ہو کر ہی لکھا۔ نیاز نے حُسن و عشق، رُومان و تخیل کے ساتھ
ساتھ افسانہ کو ہم عصر مسائل سے بھی ہم آہنگ کیا ہے۔ یُوں اِن کہانیوں میں تخیل و ارض کا حسین
امتزاج ملتا ہے۔

"جمالستان" کی شہرت اور دلچسپی کا باعث خوب صورت و رنگا رنگ اُسلوب بھی ہے کہ
طلسماتی و ماورائی دیوی، دیوتاؤں کی فضا میں نیاز کا قلم لفظوں کی سحر کاریوں کے لیے پھول بکھیرتا ہے
کہ ہم خوشنما رنگوں سے بھی محظوظ ہوتے ہیں اور اُن کی مسحور کُن خوشبو بھی ذہنوں کو معطر کرتی ہے۔ نیاز
جب اِس طلسماتی فضا سے نکلتے ہیں تو ایک مصلح کا سیدھا سادا قلم، چُبھتے ہوئے انداز اور طنز
کے تیکھا پن سے دلوں پر ایسے وار کرتا ہے کہ حساس دِل سوچنے اور غور و فکر پر مجبور ہو جاتے ہیں
"جمالستان" کی یہی رنگا رنگی، یہی قدم قدم پہ نئے روپ بہروپ آج بھی ہماری دلچسپی اور توجہ کا
باعث ہیں۔

نقاب اُٹھ جانے کے بعد "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" نیاز کے معاشرتی و اصلاحی
افسانے ہیں۔ ابتداً یہ مجموعہ دسمبر ۱۹۳۶ء میں "نگار بک ایجنسی" کی جانب سے شائع کیا گیا۔ اس
کا دوسرا ایڈیشن اِسی ادارے کی طرف سے ۱۹۴۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ایک اور ایڈیشن مجھے
۱۹۹۰ء کا بھی ملا جو ادارہ ادبِ عالیہ کراچی" کی جانب سے شائع ہوا۔ اس میں صرف تین کہانیاں
ہیں۔ "مولانا وارث علی اور اُن کی بیوی" "خواجہ مُسرور شاہ نظامی اور صفیہ" "مولوی کلیم.... اور رحم"

یہ تینوں کہانیاں سچی و حقیقی واردات ہیں۔ نام نہاد مولویوں اور مذہبی رہنماؤں کے ظاہری
اور کھوکھلے رویوں کا بڑے نوکیلے و زہریلے انداز میں پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ احرام باندھے
اِن شخصیتوں کا مَن اِتنا کالا ہے جیسے گناہ کی اندھیری رات اِن نورانی، باریش چہروں کا ظاہر
جتنا پاکیزہ و شفاف دکھائی دیتا ہے یہ اندر سے اُتنے ہی میلے اور بدصورت ہیں۔ نیاز نے مذہب
کا ہر پرستوں کا پول بہت چبھتے ہوئے لہجے میں کھولا ہے۔ یہ کہانیاں نہ صرف اُس دور کی
بلکہ آج کی بھی زندہ حقیقتیں ہیں۔ یہ "ڈبہ پیر" اور بزرگوں کا رُوپ دھارے سماج دشمن عناصر کا فقیر
بھرا، نوکیلا تجزیہ ہے۔ اِن روشن چہروں سے، ظاہری نیکی کا ماسک اُتار لیا جائے تو یہ بہت
بھیانک اور گھناؤنے نظر آتے ہیں:۔

"ضروری ہے کہ ہر چیز کا مطالعہ اُس کے حجابات دُور کرنے کے بعد کیا جائے
ورنہ اکثر و بیشتر انجام میں تمہیں اپنے آپ کو ملامت کرنا پڑے گی۔ آؤ میں
تمہیں چند واقعات ایسے سُناؤں کہ جن سے تم کو معلوم ہو کہ ہماری بعض سمجھی
ہوئی حقیقتیں نقاب اُٹھ جانے کے بعد کیا نظر آتی ہیں۔"[1]

نیاز نے اِن جھوٹے عالموں کے چہروں سے ظاہری شرافت و پاکیزگی کی نقاب کھینچ کر ان
کا اصل رُوپ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ نیاز عُمر بھر نام نہاد مولویوں کے خلاف جہاد کرتے
رہے۔ کھوکھلی، بے وزن، مذہبی اقدار و روایات کے وہ سخت مخالف تھے۔ وہ طبقہ جو درس و
تدریس اور تبلیغ پر خطابت کا پورا زور صَرف کر دیتا ہے مگر اندر سے خود جھوٹا اور ریاکار ہے۔
نیاز نے اِن مؤثر کہانیوں کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ یہ سب گُفتار کے غازی ہیں۔ اِن کی
گفتگو اور عمل کے درمیان فاصلے بعید ہیں۔ اِن کا کردار کھوکھلا، سیاہ اور ریاکار ہے۔ یہ کہانیاں
ایسے ہی جھوٹے عالموں کے منہ پر زبردست طمانچہ ہیں۔

---

[1]۔ نقاب اُٹھ جانے کے بعد" تمہید ص ۴ ۱۹۴۲ء نگار بک ایجنسی لکھنؤ

"مولانا وارث علی اور اُن کی بیوی" ایک سچّی و سماجی حقیقت ہے۔ نیاز نے بھرپور انداز میں مُلّاؤں پر طنز کیا ہے۔ مولانا وارث علی کاظمی چشتی قادری مدظلہ، مشہور عالم، زہد و تقدس کی تصویر، ہر وقت دانۂ تسبیح کی گردش کا ساتھ، گھنی داڑھی، پانچ وقت کے نمازی، امامت کے وقت "القارعۃ" اور "اذا زلزلت" پڑھتے ہوئے گریہ زاری، خطبہ و واعظ گنڈا تعویز میں بے مثل ہیں۔ اُن کی بیوی صغرا کا خط ایک سہیلی کے نام جس میں اُن کی شخصیت کے تمام بخیے اُدھڑ جاتے ہیں۔ اور مولانا کا خوفناک شیطانی چہرہ منظرِ عام پر آتا ہے کہ مولانا انتہائی ظالم، سفّاک، لالچی، دغاباز اور عیاش ہیں۔ بیوی کو بے دردی سے مارتے پیٹتے ہیں۔ دوست کی بیوہ کا دھوکے سے پانچ ہزار ہضم کر جاتے ہیں۔ جھوٹے تعویز، گنڈوں کی بڑی بڑی رقمیں پیٹ کا ایندھن بنتی ہیں۔ انتہا یہ کہ شریف بہو، بیٹیوں کی عزت و عصمت بھی محفوظ نہیں۔ اصل مکروہ روپ یہ ہے۔

"جس وقت رات کو مارے بخل کے یہ سارے کپڑے اُتار کر ایک کثیف سا بوسیدہ تہمد باندھ لیتا ہے اور پیٹ پر ہاتھ پھیر پھیر کر دن بھر کی وصول کی ہوئی رقموں کے انہضام کا جائزہ لیتا ہے تو اس کی صورت اس درجہ مکروہ اور اس کا چہرہ اس قدر ڈراؤنا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات میں کانپنے لگتی ہوں۔ خدا معلوم دُنیا اندھی ہے یا کیا کہ وہ اس کو محسوس نہیں کرتی۔ اور اس کے مکر کا شکار ہو جاتی ہے[1]۔"

دراصل نیاز یہی اصلی روپ دکھانا چاہتے ہیں تاکہ لوگ ایسے ریاکاروں اور سیاہ کاروں سے محتاط رہیں۔ اُن کا مقصد ٹھوس سماجی حقیقت کو سامنے لا کر اصلاح کرنا ہے۔ کہ توہم پرست بھولے بھالے لوگ ان سے ہوشیار رہیں۔ یہاں وہ نیاز نظر نہیں آتے جن کا قلم رومانیت اور انشا پردازی کے جوہر دکھاتا، اور لفظوں کے پھول کھلاتا ہے۔ طرزِ بیاں سیدھا سادا ہے سادگی ہر

[1]: "مولانا وارث علی اور اُن کی بیوی" نقاب اُٹھ جانے کے بعد" ص ۱۶

جگہ ملتی ہے۔ لفظوں کا جال پھیلانے کی بجائے پوری توجہ مطلب و مُدعا پر ہے۔

"یہ مسجد میں جاکر نمازیں پڑھنا، وعظ کہنا، اعتکاف کرنا، روزے رکھنا، سب گویا اسی کاروبار کی ترقی کے لئے ہے۔ ورنہ مجھے معلوم ہے کہ اس کے زہد و تقویٰ کی کیا حقیقت ہے[1]۔"

یہ افسانے سماجی، معاشرتی اور اصلاحی ہیں۔ حقیقتوں کو بے نقاب شاید اس سے بہتر انداز میں نہ کیا جا سکتا تھا۔ "خواجہ مسرور شاہ نظامی" ایک ایسے ہی پیرِ کامل کی کہانی ہے۔ جو اپنی ظلمانہ شیطانی ذہنیت سے معصوم صفیہ کی زندگی میں زہر گھولتا ہے۔ اُس کے شوہر ریاض کو جھوٹے محبت بھرے خط لکھ کر اُس سے متنفر کرتا ہے۔ دو محبت بھرے دلوں اور زندگی بھر کے ساتھیوں کے درمیان شک کی دیوار اسی برگزیدہ ہستی کی کھڑی کی ہوئی ہے۔ صفیہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی حقیقت سے بے خبر، دق کا شکار ہو کر اس دُنیا سے ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو جاتی ہے۔ یُوں دو تشنہ دل ہجر و فراق کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ اور اس کارنامے کا سہرا مسرور شاہ نظامی بزرگِ کامل کے سر رہا۔

افسانہ کا موضوع بہت سنجیدہ و حسّاس ہے۔ نازک دلوں پر ایک چوٹ سی پڑتی ہے۔ صفیہ جیسی نازک و معصوم لڑکیوں سے ہمدردیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور نظامی جیسے مولویوں سے شدید نفرت ہوتی ہے۔ اِس افسانے کو پڑھ کر یُوں لگتا ہے جیسے ہم کوئی سچّی آپ بیتی پڑھ رہے ہیں۔ اندازِ بیان سلیس و سادہ ہے۔ روانی سے کہانی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور اپنے دردناک انجام کو پہنچتی ہے۔ کوئی اُلجھن، کوئی پیچیدگی، ابلاغ کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی۔

"خدا کرے اب بھی آپ کو رحم آ جائے اور میری اِس التجا کو سن لیں۔ کیونکہ مرنے کے بعد اگر واقعی زندگی ہے تو وہ اسی طرح ضرور گزر سکتی ہے کہ مجھے

[1]: "مولانا وارث علی اور اُن کی بیوی" نقاب اُٹھ جانے کے بعد ص ۱۹

یہاں نہ سہی عالم ارواح ہی میں اِس بات کا علم ہو جائے کہ آپ میری خطاؤں
سے درگذر کر چکے ہیں[1]۔"

" مولوی حکیم..... اور ہم" ایک ایسی کہانی ہے جس میں مولوی حکیم کا کوڑھی کردار جس کی زبان پر قرآنی آیات کا وِرد ہمیشہ جاری رہتا ہے یتیموں کے نام پر جو چندہ جمع کرتا ہے وہ اُس کے اپنے پیٹ کا ایندھن بنتا ہے۔ ناکام حکیم اور جھوٹے تعویز گنڈوں سے رقم کمانا اُن کا اصل پیشہ ہے۔ بالآخر دھوکے بازی کا مقدمہ چلا اور سارا بھانڈا پھوٹ گیا۔

یہ افسانے نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کی سچی المیہ کہانیاں ہیں۔ یہ ٹریجڈی خُون کے آنسو رُلاتی ہے۔ اور صحیح چہروں کو بے نقاب کر کے ہمیں اُن سے نفرت دِلاتی ہے۔ بلاشبہ نیازؔ اِن سماجی و اِصلاحی افسانوں میں اُتنے ہی کامیاب و کامران ہیں جتنے کہ رومانی افسانوں میں، اُن کا قلم بیباک اور بے خوف حقیقتوں کو بے نقاب کرنے میں کسی تردّد سے کام نہیں لیتا۔

حُسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

"حُسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے" نیازؔ کے تاریخی افسانوں کا مجموعہ ہے، اِس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۳ء میں نگار بُک ایجنسی لکھنؤ نے شائع کیا اور شاید خوب صورت افسانوں کی وجہ سے یہ مجموعہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور بہت جلد ختم ہو گیا۔ یہ بات یُوں بھی جا رہی ہے کہ اِس کے دوسرے ایڈیشن کا اِشتہار نگار جنوری ۱۹۴۶ء (ص - ۱) پہ موجود ہے۔ تیسرا ایڈیشن جو نام کی تبدیلی کے ساتھ، ۱۹۶۰ء میں ادارہ ادب العالیہ کراچی کی جانب سے منظرِ عام پر آیا۔ اب اِس مجموعے کا عُنوان "تاریخ کے گمشدہ اوراق" رکھا گیا نیازؔ نے یہ تبدیلی شاید اِس کے تاریخی افسانوں کی وجہ سے کی۔ یہ مجموعہ جو بیس مختصر کہانیوں پر مشتمل ہے "حُسن کی عیاریاں" یورپ کی اِک حسین راہبہ، زبیدہ، عبدالرحمٰن فاتحِ اُندلس"، "تاتاری جذبۂ انتقام

[1]: خواجہ سُرور شاہ نظامی "نقاب اُٹھ جانے کے بعد ص ۳۹

"صلاح الدین ایوبی کے دو آنسو"، "حُسن کی شہر آشوبیاں" "مسلمانوں کا عسکری اخلاق" "ہندوستان کا ایک کاہن نجومی"، "آگ اور خُون سے کھیلنے والا فرمانروا"، "دریائے نیل کی دیوی"، یہ اہم ترین مختصر تاریخی قصے ہیں جنہیں تاریخ کے گمشدہ اوراق میں تلاش کر کے، منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔

تاریخی افسانہ، ماضی کے مجرد حقائق اور دفن شُدہ حقیقتوں کو خاص فنّی و افسانوی انداز میں پیش کرنے کا نام ہے۔ افسانہ نگار جہاں تخیّل و تصوّر کو حرکت میں لاتا ہے وہاں اُسے ایک کامیاب محقق بھی بننا پڑتا ہے۔ افسانہ نگار کا مقصد تاریخی صداقتوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اُن خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی بھی ہوتا ہے۔ جو کسی تاریخی غلطی کا باعث بنے ہوں۔ یُوں افسانہ نگار محض قصہ گو ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک عظیم مقصد بھی اپنے سامنے رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف محقق و مورخ ہے بلکہ اُسے افسانوی نزاکتوں اور لطافتوں کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ ایک عام افسانے اور تاریخی افسانے میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ عام افسانہ میں فن کار ہر لحظہ بدلتی، متحرک زندگی سے اپنے موضوع کا اِنتخاب خود کرتا ہے۔ اپنے ذہن اور سوچ کے مطابق اُنہیں پھیلاتا ہُوا انجام کی طرف لے جاتا ہے۔ مگر تاریخ اپنے فیصلے خود کرتی ہے۔ یہاں افسانہ نگار کو آزادی حاصل نہیں بلکہ ماضی کا قیدی ہے۔ اُس کے پاؤں میں گزرے ایّام کی بیڑیاں ہیں جنہیں وہ حال یا مستقبل کے توانا ہاتھوں سے نہیں توڑ سکتا۔ وہ ماضی کی ازسرِ نو تعمیر کرتا ہے۔ خاص رُومانوی اور افسانوی انداز میں وہ ماضی کے قبرستان میں دفن حقائق کی قبریں کھودتا ہے اور نئے، دلکش انداز میں منظرِ عام پر لاتا ہے۔

واقعات کی طرح تاریخی افسانے کے کردار بھی آزاد نہیں۔ وہ بیتے دِنوں کے زِندان میں مقید ہیں۔ ماضی میں جو کچھ، جس طرح سے ہُوا وہ اُسی کا حوالہ ہوں گے۔ کرداروں کی تخلیق میں بھی افسانہ نگار کا عمل دخل بہت کم رہ جاتا ہے۔ البتہ اُسلوب کے معاملے میں اُسے کچھ آزادی حاصل ہے۔ وہ خاص رُومانی فضا لفظوں ہی سے پیدا کرتا ہے۔ مگر احتیاط یہ کرنا ہو گی کہ الفاظ کا خوب صورت جال حقائق پہ پردہ نہ ڈال دے۔ خوب صورت پس منظر اور ماحول میں، اُسلوب

کی ساغر و مینا، ماضی کے دلکش پہلوؤں کو بھی سامنے لاتی ہے اور اُن خوفناک، اندھیر غلطیوں سے بھی پردہ اُٹھاتی ہے جنہوں نے قوموں کی تاریخ کا رُخ موڑا ہے۔

"حُسن کی عیاریاں" یا — تاریخ کے گمشدہ اوراق، مشرق و مغرب کی چونکا دینے والی تاریخی کہانیاں ہیں، جن کا تعلق سیاست سے بھی ہے اور مذہب سے بھی، اخلاقی اقدار و روایات سے بھی ہے اور معاشرتی و سماجی حقائق سے، خالص جذبوں کی محبت بھری کہانیاں بھی ہیں اور ظلم و ستم و انتقام کی داستانیں بھی۔ حسن کی شہر آشوبیاں بھی ہیں اور کاہنوں کی پیش گوئیاں بھی۔ یہ سچے تاریخ ساز واقعات زندگی کو مثبت اور روشن رکھنے کا بھی درس دیتے ہیں، وہاں ظلم و ستم اور منفی رویہ سے نفرت بھی دلاتے ہیں۔ نیاز ان کہانیوں سے شاید یہی مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے مگر وہ اس میں پورے طور پر اس لئے کامیاب نہیں کہے جا سکتے کہ ایسے واقعات نہیں لئے گئے جنہوں نے حقیقتاً تاریخ کو جھنجھوڑا ہو۔ بلکہ ذاتی و انفرادی تجربات و جذبات ملتے ہیں۔ بہرحال "ماضی کے گمشدہ اوراق" کے متلاشی نیاز نے اپنے طور پر انہیں کامیاب، مؤثر اور زندہ و جاوید کرنے کی کوشش کی ہے۔

ملکہ مصر، قلوپطرہ، شاید نیاز کا پسندیدہ موضوع ہے انہوں نے اُس کے حُسنِ عیار پہ بہت کچھ لکھا ہے۔ زیرِ بحث مجموعے میں بھی دو کہانیاں "حُسن کی عیاریاں" اور "حُسن کی شہر آشوبیاں" قلوپطرہ سے متعلق ہی ہیں۔ نیاز جہاں اُس کے حُسن و شباب، ذہانت و عیاری سے متاثر نظر آتے ہیں وہاں اُس کا عبرت ناک انجام بھی اُن کے لئے کشش رکھتا ہے، کہ زندگی مکافاتِ عمل کا نام ہے۔

قلوپطرہ جس کے حُسنِ برہم کے سامنے نیل کی موجیں بھی اپنی روانی بھلا دیتی تھیں، جس کی آنکھیں عمیق سمندر جو عظیم بادشاہوں اور حکمرانوں کو غرق کر دیتی تھیں۔ جو روما کے سیزر کو گھائل کرنے چلیں تو کچھ یوں کہ:۔

"سیزر منتظر تھا کہ اس کے اندر سے سیم و زر کی کشتیاں۔ الماس و عقیق سے جڑے ہوئے بیش بہا زیور نظر آئیں گے لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ

رہی جب اس کے اندر سے بجائے سیم و طلاء، الماس و عقیق کے، اِک سروِ زریں، ایک مجسمۂ شباب، اِک پیکرِ حُسن و جمال ملکہ قلوپطرہ نہایت باریک ریشمی لباس میں نمودار ہوئی، گویا وہ وینس (زہرہ) تھی جو ابھی ابھی سمندر سے نہا کر نکلی ہو۔"[1]

حُسن و شباب کا یہ مجسمۂ وینس، سیزر کا سکون و چین لوٹ لے گیا۔ اُس کی مدد سے قلوپطرہ نے اپنے بھائی ٹولمی کی حکومت پر قبضہ کیا۔ سیزر کے بعد انطانی کو اپنے حُسن سے مسحور کیا۔ قلوپطرہ کا مقصد صرف اور صرف اقتدار تھا۔ انطانی کے بعد آگلاشکار آکٹیویس حکمران اسکندریہ تھا۔ لیکن فطرت حُسن کی ان قاتل تماشہ زائیوں سے بیزار ہو گئی۔ قلوپطرہ کو زنجیریں پہنانے، غلام بنانے کی خواہش حکمرانِ اسکندریہ کے دل ہی میں رہ گئی۔ وہ ملی تو کس حال میں:۔

"اِس حال میں کہ اس کے عُریاں سینہ پر اِک چھوٹا سا سانپ لہرا رہا ہے اور اس قدر سرشاری کے ساتھ کہ باوجود تمام ہنگاموں کے وہ اپنے دانت قلوپطرہ کے سینہ سے جُدا کرنا نہیں چاہتا۔"[2]

"حُسن کی شہر آشوبیاں" میں قلوپطرہ کی زندگی کا وہی عکس ہے جس میں وہ اپنے سحرِ جمال سے سیزر کو مسحور کرتی ہے۔ حکومت پہ قابض ہوتی ہے مگر جب رُوم کے قانون کے مطابق وہ اُسے دوسری بیوی کے طور پہ قبول نہیں کر سکتا تو اُسے قتل کروا دیتی ہے۔

ان دونوں افسانوں کو اگر اس مجموعے کا حُسن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ ان میں تاریخ کی سچی شہادتیں بھی ہیں۔ حُسنِ عیار کی شہر آشوبیاں بھی اور ایک ٹھوس نتیجہ بھی کہ عیاری و غرور کا نشہ ایک دن ضرور ٹوٹتا ہے۔ سازش مکر و فریب کا بدلہ فطرت خود دیتی ہے

---

[1] "حُسن کی عیاریاں"، تاریخ کے گمشدہ اوراق ص ۵ بنشنه ۱۹۶۰ء ادارہ ادب العالیہ کراچی ۱۸

[2] ایضاً ص ۱۰

اِن تاریخی کہانیوں میں جہاں حُسن و رُومان کی متحیر کر دینے والی فضا ہے وہاں اُسلوب و انشاء کی دلکشی نے اِن کے حُسن کو دوچند کر دیا ہے۔

"شام کا وقت ہے۔ ہلکی ہلکی تاریکی اُفق سے بڑھ رہی ہے۔ اور اُن
چڑیوں کی طرح جن کو بسیرا لینے کے لئے دیر ہو گئی ہو۔ ماہی گیر اپنی اپنی
کشتیوں کے بادبان جلدی جلدی لپیٹ رہے ہیں۔ ساحل اسکندریہ پر
آخری کشتی آہستہ آہستہ پہنچی ہے۔ ایک آدمی سیاہ لبادہ میں لپٹا ہُوا کشتی
سے اُترتا ہے۔ اور ایک عورت کو ہاتھ سہارا دیتے ہوئے نیچے اُتارتا ہے[1]"

تاریخ اور رُومان کے امتزاج کی دلکش فضا، لفظوں کا سحر ہمیں جادو کی اُس نگری میں لے جاتا ہے جہاں حُسن و جمال کے ساتھ ساتھ تاریخ کی حکمت عملی ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

نیاز نے صرف روم و مصر کی داستانیں ہی بیان نہیں کیں بلکہ مسلمانوں کے تاریخی رُومان اُن کے سُنہری اَدوار اور اخلاقی اقدار روایات کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی تاریخ محبت و اخلاق کے عظیم الشان واقعات اپنے اندر سمیٹے ہے۔ "زبیدہ و عبدالرحمٰن فاتح اُندلس" "صلاح الدین ایوبی کے دو آنسو" "مسلمانوں کا عسکری اخلاق" اور "ایک سپاہی کا عہد" اِسی سلسلے کی اہم ترین کڑیاں ہیں۔

فاتح اُندلس عبدالرحمٰن کی فتوحات تاریخ کا سُنہرا باب ہیں۔ مگر ایک شدید ذاتی تجربہ جس سے کم لوگوں کی ہی واقفیت ہوگی۔ عبدالرحمٰن کے جانی دشمن بنو اُمیہ کے لوگ اُس کے متلاشی ہیں۔ وہ اپنے ممنونِ احسان کے گھر پناہ گزین ہے۔ زبیدہ، فارس جمیل مردانہ بھیس میں اُسے خطرات سے آگاہ کرتی ہے۔ اور اُس کی جان بچاتی ہے۔ قرطبہ کا یہ حکمران معصوم زبیدہ کے جذباتِ محبت سے ناآشنا ہے۔ جب یہ پتا چلا کہ زبیدہ، مرد نہیں عورت ہے تو اُس کا

لہ:۔ حُسن کی شہر آشوبیاں "تاریخ کے گمشدہ اوراق" ص ۹۳۔ ادارہ ادب العالیہ کراچی ۱۸

ایک بڑے سردار سے عقد کا ارادہ کیا تو زبیدہ زہر کھا لیتی ہے۔ قلبِ مجروح کا مداوا نہ ہُوا اور فاتح اُندلس شاید زندگی میں پہلی بار جی بھر کے رُویا۔ محبت کی یہ سیدھی ساری کہانی ہے کہ یہ جذبہ بے اختیار کسی کی میراث نہیں۔ محبتیں دل کے کعبہ میں پیدا ہوتی ہیں اور دل ہی میں گھر کرتی ہیں۔ بعض اوقات یہ تشنہ، ادھورے جذبے موت بن جاتے ہیں۔ نیاز نے ایک بڑے حکمران، عظیم الشان فاتح کے دل میں بسی ایک معصوم محبت کی کہانی سُنائی ہے۔ تاریخ میں کتنی زبیدہ ہوں گی جو نجانے کتنے ہی عبدالرحمانوں کو چاہتی ہوں گی۔ یہ مختصر، سیدھی، معصوم کہانی جسے نیاز کے قلم نے نہیں بلکہ زبیدہ کی محبت نے حُسن بخشا ہے۔

فاتح بیت المقدس اور مصر و شام صلاح الدین ایوبی کی صلیبی جنگوں تاریخی کارناموں سے کون واقف نہیں مگر مسلمانوں کے اخلاق و محبت کی داستانیں شدید جنگ و جدل میں بھی ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ صلاح الدین ایوبی جو بچپن میں اہلِ فرنگ کے قصور و محلات میں ایک ننھی بچی کو محبت سے آغوش میں لئے پھرتا ہے یہ ننھی بچی آج ملکہ اینٹانٹ ہے۔ میدان کارزار ہے اور اُس کے بیٹے کی شادی ہے۔ صلاح الدین کو دعوت کے ساتھ اس کی اطلاع کی جاتی ہے خط پڑھ کے بے اختیار صلاح الدین کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے اور تاریخ نے ایفائے عہد کا یہ نظارہ کاہے کو دیکھا ہوگا کہ :-

"وہ رات قلعہ کرک کی عجیب و غریب رات تھی کہ اندر اہلِ قلعہ مسرور نشاط
تھے اور باہر دشمن کی فوج[1]"

صلاح الدین ایوبی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں اُس کے عظیم الشان کارناموں اور اعلیٰ اخلاق سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ مگر اس عہد ساز تاریخی شخصیت کا یہ پہلو دلچسپ بھی ہے اور حیرت انگیز بھی جسے نیاز نے کہانی سنانے کے انداز میں بیان کر دیا ہے۔ یہ قلم

لہ:۔ صلاح الدین ایوبی کے دو آنسو "تاریخ کے گمشدہ اوراق" ص ۴۰، ادارہ ادب العالیہ کراچی

کا دوست ہے مگر ایک کاہن نجومی جب اپنے دلگیر و دل سوز الفاظ میں ہندوستان کے لوگوں کو آزادی کی طرف بلاتا ہے اور دعوت دیتا ہے کہ

"آؤ ان خونیں کھیتوں کو کاٹیں۔ اسے کاٹو، ورنہ عاقبت اندیش کسانو، دن طلوع ہو گیا ہے اور آفتاب اپنے خنجرے کو بلند کر چکا ہے۔ آؤ، چلو، بڑھو اور ان سُرخ کھیتوں کو کاٹنا شروع کرو۔"

ناناصاحب نے ان الفاظ کا گہرا اثر قبول کیا اور انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ ۱؎ مگر کچھ پتا نہ چل سکا کہ آزادی کا یہ گمنام سپاہی کہاں گیا؟ مگر اس کاہن نجومی کی پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

نیاز نظریاتی طور پر ہندوستان کی تقسیم کو اتنا بہتر و مؤثر خیال نہ کرتے تھے مگر انگریز و مغرب کے تسلط سے آزادی کا عنصر اُن کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ اس کہانی میں یہ عنصر موجود ہے، جسے کسی طور بھی افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔

"آگ اور خون سے کھیلنے والا فرمانروا تاریخ کا ایک سیاہ ورق، ایک بھڑکتی تجلّی جو روما کے شہنشاہ اعظم نیرو کی کہانی ہے جس نے ۶۴ء میں سارے شہر کو مع جیتے جاگتے انسانوں کے جلا کر راکھ کر دیا۔ چیخ و پکار، لال لال شعلوں میں، خون کے فواروں کے درمیان اُس کی بے نیازی کا یہ عالم کہ:

"اُس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی اور رخساروں پہ خوشی کی مہک۔ لبوں پر اطمینان و سکون کا تبسم تھا اور رفتار میں عجیب و غریب انداز گلگشت۔ اُس کے ہاتھوں میں اُس کا محبوب سُرود تھا جس کے تاروں پر اُس کی انگلیاں اس طرح چل رہی تھیں گویا اس سے بہتر فرصتِ نغمہ اس کو کبھی مل ہی نہیں سکتی۔ شعلوں کی لپٹیں گویا اس کے لیے بادِ نسیم کے جھونکے تھے جو اُسے مست کیے ہوئے

۱؎: "ہندوستان کا ایک کاہن نجومی" "تاریخ کے گمشدہ اوراق" ص ۹۱

کا زورِ بیاں صرف کیا ہے اور نہ لفظوں کے طلسم کا جال پھینکا ہے۔

"مسلمانوں کا عسکری اخلاق" ایک مؤثر کہانی جو ایک فرانسیسی نوجوان خلیپ اور ایک مسلمان سپاہی عامر کی بے لوث دلگیری محبت کی عکاسی ہے۔ ۱؎ ۵۸۲ھ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کی سرکردگی میں عامر نے بہت بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں بہت سے کارنامے سرانجام دیئے۔ اُس کی خون سے رنگین تلوار دیکھ کر سلطان نے وعدہ کیا کہ جنگ کے بعد وہ اُس کی منہ بولی تمنا ضرور پوری کرے گا۔ عامر نے تمنا کی تو خلیپ کی رہائی اور جان بخشی کی۔ دونوں نے اکٹھے زندگی بسر کی اور آج بھی:

"جبلِ زیتون کی بلندی پر ایک گھنا سایہ دار درخت ہے جس کے نیچے دو قبریں نظر آتی ہیں۔ جن میں سے ایک پر پتھر نصب ہے اور دوسری پر لکڑی کی صلیب۔ یہ قبریں عامر اور خلیپ کی ہیں۔ جنہوں نے مذہب کے نام پر تو ایک دوسرے کے خلاف تلوار اٹھائی لیکن انسانیت کے نام پر دونوں نے مل کر ساتھ ہی جان دی۔"

خلوص و محبت، دوستی و مروت کی یہ داستان، جسے نیاز کے قلم نے حیاتِ نو بخشی ہے۔ دوستی و مروت کی لازوال داستانوں سے تاریخ بھری پڑی ہے کہ دوستی و محبت، مذہب، قوم اور نسلی تعصب سے بالاتر ہے۔ محبتوں کا یہ حسین سفر ازل سے ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ نیاز اس موضوع کے لیے اس سے بہتر کہانی کا انتخاب بھی کر سکتے تھے جو ان عام کرداروں سے ہٹ کر عظیم اور جانے پہچانے کرداروں کی کہانی ہوتی۔

نیاز نے دنیا بھر کے اہم تاریخی قصے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ برصغیر کی تاریخ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ "ہندوستان کا ایک کاہن نجومی" دانندو پنتھ نانا صاحب کی کہانی ہے۔ جو ابتدا میں انگریز

۱؎: "مسلمانوں کا عسکری اخلاق" "تاریخ کے گمشدہ اوراق" ص ۱۷۰

تھے اور مخلوق کی چیخ و پکار گویا نغمۂ فرحت ہوتی تھی؎۱"

ظلم کی یہ داستان یہیں ختم نہیں ہوتی۔ دیوموس ایک یونانی وفادار غلام شراب، اور جشن رقص و سرود سے چند لمحوں کے لیے غیر حاضر ہوا تو اُس کے دونوں ہاتھ سرِ محفل کٹوا دیئے۔ اُس کی تکلیف و تڑپ پہ قہقہے لگائے گئے۔ مگر دیوموس کی وفاداری میں کمی نہ آئی۔ وہ پاؤں سے کام کر کے، آقا کی خدمت کرنے لگا۔ نیرون متاثر ہوا۔ آزادی کے ساتھ بے شمار دولت اور غلام بخشے۔ مگر آج تاریخ دیوموس کو ایک باکمال بُت تراش اور نقاش کی حیثیت سے جانتی ہے۔ نیاز دراصل یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وفا اور محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ فطرت ایک قوت چھین لے تو اُس کا اُس سے بہتر نعم البدل عطا کرتی ہے۔ "رومہ کا دورِ استبداد" اسی نیرو کے ظلم و ستم کی عبرت ناک کہانی ہے۔ کہ وفا شعار بیوی کی بے گناہ موت اور اُس کے شوہر کے دُکھی دل کی بددعا بالآخر نیرو کو لے ڈوبی اور ایک سال بعد ہی ۶۸ء میں بغاوت کی وجہ سے اُسے خودکشی کرنا پڑی۔

نیاز کے یہ افسانے کسی نہ کسی طور پر اخلاقی و اسلامی پہلو لیے ہوئے ہیں۔ تاریخی افسانوں کا نصب العین بھی یہی ہے۔ کہ لفظوں اور اسلوب کی بھول بھلیوں سے ہٹ کر اصل مدعا کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ ماضی کو نئے طور اور نئے انداز سے زندہ کرنا کہ وہ اپنے مقصدِ عظیم سے نہ ہٹنے پائے تاریخی افسانہ کی اصل منزل ہے لیکن قصہ یا کہانی کو متعلقہ وقت اور زمانے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وقت اور زمانے سے الگ یہ حقیقتیں اور سچائیاں ایسے ادھورے سپنے ہیں جن کی تعبیر نہیں مل سکتی۔ افسانہ نگار کو تخیل و تصور کی حسین و دلکش دُنیا سے ہٹ کر حقائق کے خشک صحراؤں کی دشت نوردی کرنا پڑتی ہے جیسا کہ خود نیاز کا کہنا ہے۔

"افسانہ نگاری اس سے قبل افسانہ نگاری کا نام تھا۔ صرف خیال سے لطف اندوز ہونے کا لیکن اب وہ عملی زندگی کی چیز ہے۔ پہلے تصور سے کام چل جاتا تھا

؎۱ "آگ اور خون سے کھیلنے والا فرمانروا" "تاریخ کے گمشدہ اوراق" ص ۱۴۴

جس کے لیے مخصوص فرصت درکار تھی۔ اور اب معاملۂ حقائق کا ہے جن کے لیے خاک چھاننا ضروری ہے؎۱۔"

نیاز اس حقیقت کا عرفان رکھتے ہوئے بھی اس سے خاصے دُور نظر آتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے تاریخ کی مجرد سچائیوں کو مجسّم تو کیا مگر بُت تراشنے اور پتھروں میں چھپی مورتیں تلاش کرنے میں جس ہُنرمندی اور چابک دستی کی ضرورت ہے اُس میں پورے طور پر انہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ تحقیق اور حقائق کی خاک چھاننا، تاریخ کے گم شدہ، گرد آلود اوراق سے زندہ کہانیاں تلاش کرنا، یقیناً ایک کٹھن مرحلہ ہے جس میں وقت، زمانہ، دَور اور ماحول کی طرف توجہ اوّلین ضرورت ہے۔ نیاز کے تاریخی افسانوں کا یہ پہلو کمزور ہے۔ چند افسانوں کو چھوڑ کر کہیں بھی تاریخ کی عرق ریزی اور محققانہ تنقید نظر نہیں آتی۔ اُسلوب کی خوب صورتی نے بعض اوقات اس کمزوری پر پردہ ڈال دیا ہے مگر اس سے مقصد پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود تاریخ کے گمشدہ اوراق "خوب صورت و مکمل افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ اوّل تو اُردو میں تاریخی افسانہ بہت کم لکھا گیا ہے۔ دوسرے اس کی فنی روایت و اقدار بھی موجود نہ تھیں۔

شبستان کا قطرۂ گوہرین

"شبستان کا قطرۂ گوہرین" دلکش افسانوں کا مجموعہ، جس میں پانچ دل موہ لینے والی کہانیاں ہیں اوّلاً یہ افسانوی مجموعہ ۱۹۴۰ء میں ادارہ فروغِ اُردو لاہور کی جانب سے شائع ہوا۔ بعد میں فروری ۱۹۶۰ء ادارہ ادبِ عالیہ کراچی ۱۸ سے شائع ہوا۔ "شبستان کا قطرۂ گوہرین" "درسِ محبت"، "دُنیا کا اوّلین بت ساز"، "زہرہ کا ایک پجاری"، "قربان گاہِ حسن" یہ نیاز کے پسندیدہ موضوع حُسن و عشق، رومانیت و انشاپردازی کا خاص رنگ لیے ہوئے ہیں۔ نیم تاریخی پس منظر نے حُسن و صداقت کو یکجا کر کے، کہانیوں کی تاثیر و کشش میں مزید اضافہ کیا ہے۔ یہاں نیاز کا قلم ایک

؎۱ "سالنامہ نگار نیاز نمبر ۱۹۶۲ء، مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۴۱

ماہر مصوّر کا قلم محسوس ہوتا ہے۔ جو لفظوں کے خوب صورت رنگوں سے خوب صورت تصویریں بناتا ہے۔ لفظ، تخیل میں اپنی دُنیا بسائے ہوئے ایسے پورٹریٹ بناتے ہیں کہ ان کی خوب صورتی آنکھوں میں جم کے رہ جاتی ہے۔

"شبستان کا قطرہ گوہریں" ملکہ ناہید کی کہانی جو حقیقتاً "شبستان" کا قطرۂ گوہریں ہے۔ ایسا سحر انگیز حُسن کسی نے کاہے کو دیکھا ہوگا کہ:-

"جب کبھی وہ صبح خانہ باغ کی روشوں پر ٹہلتی ہوتی اور آفتاب طلوع ہوتا تو یہ تمیز کرنا دشوار ہو جاتا کہ آیا آفتاب اس پر طلوع ہوا ہے یا یہ آفتاب پر اور سورج کی کرنیں اس کے چہرے کو منوّر کر رہی ہیں یا اس کے جسم کی شعاعیں آفتاب کو۔"[1]

یہ شعاعیں بکھیرتا ہوا البیلا، آفاقی حُسن اپنے آپ کو کسی مرد کی پناہ میں دینے سے منکر ہے۔ اور مرد ذات سے نہ صرف خود متنفر ہے بلکہ شبستان کی کوئی دوشیزہ شادی نہیں کر سکتی۔ ملکہ ناہید کی کنیز نسرین وقتاً فوقتاً ملکہ کے ذہن اس زہر کو صاف کرنا چاہتی ہے:-

"دُنیا اگر آپ سے محبت کرتی ہے تو کرنے دیجئے آپ اس کے مٹانے کے پیچھے کیوں پڑی ہیں۔ آپ کہاں تک اس آفت کا مقابلہ کریں گی، جو قدرت نے آپ کے سراپا ودیعت کر کے اس وقت تمام شبستان پر نازل کی ہے۔"[2]

محل میں ایک نئی کنیز نو بہار کی آمد جس نے اپنی محبت، ایثار و قربانی، اور خوب صورت گفتگو سے ملکہ ناہید کا دل موہ لیا۔ اُس نے یہ بات ذہن نشین کرائی کہ عورت نسائیت، لطافت و پاکیزگی ہے وہ آسمانی دیوی ہے۔ اُس کا ہلکا سا تبسم مرد کی تمام تھکن کو دُور کر دیتا ہے۔ مگر جب عورت نے خود اپنے ہاتھ میں پھاوڑا لے کر محنت شروع کی تو یہ تبسم مفقود ہو گیا۔ یہاں تک محبت مٹ گئی۔ عورت

[1]: "شبستان کا قطرۂ گوہریں" ص ۵، ادارہ ادب عالیہ کراچی ۱۸

[2]: ایضاً ص ۸

صرف محبت اور چاہت کے لئے بنائی گئی۔ یہ مؤثر باتیں رفتہ رفتہ ملکہ ناہید کے دل میں گھر کرتی رہیں۔ مگر جھوٹی انا اُسے جھکنے نہ دیتی تھی۔ شبستان کے لوگ ایک عورت کی حکمرانی برداشت نہ کر سکے، اور بغاوت کر بیٹھے۔ اس فتنہ کو ختم کرنے کے لئے نو بہار نے مردانہ بھیس میں ملکہ سے شادی رچائی۔ نو بہار جو حقیقتاً شہزادہ خرم ہے۔

الف لیلوی ماحول، اور داستانوی انداز کا یہ دلکش افسانہ اپنے اندر حیرتوں کی تمام تر رعنائیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں تحیّر بھی ہے اور تجسس بھی، خوب صورت مناظر بھی ہیں۔ اور مرد و عورت کے نفسیاتی مسائل بھی۔ نیاز یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مرد و عورت کی رفاقت و محبت ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ یہ کشش فطری ہے۔ رُوح و جسم کا یہ رشتہ کبھی نہ ٹوٹنے والا بندھن ہے۔ اس لئے کہ یہ بندھن خالق کائنات نے انسانی رُوح کو پیدا کرتے ہی باندھ دیا تھا۔ جو اس سچی رفاقت سے منکر ہوں دراصل وہ فطرت سے منکر ہیں۔ اسی سچے اُصول پہ نیاز نے اپنے افسانے کی بنیاد رکھی جس میں سب سے زیادہ کامیاب کردار نو بہار کا ہے۔ جو بالآخر ملکہ ناہید کو جیتنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

شاہ رُخ اور نیلوفر، دو محبت بھرے دلوں کی کہانی۔ ضمنی طور پہ ملکہ ناہید کی نفسیات و کردار کو ابھارنے کے لئے سامنے لائی گئی۔ جس سے افسانے میں تجسس کا عنصر بڑھا۔ کہ واقعات، حالات کے کن دائروں پہ سفر کرتے ہیں۔ مگر جو ڈوری فطرت باندھ دے، اُسے توڑنا ناممکن ہے۔ یہی آفاقی صداقت اپنے منطقی و فطری انجام کو جنم دیتی ہے۔ افسانے کی خوب صورتی اس کی انشاپردازی اور رومانیت میں ہے۔ خوب صورت لفظوں کی خوب صورت تصویریں پورے ماحول و مناظر کو تمام تر جزئیات سمیت سامنے لے آتی ہیں۔ خوابگاہ میں کنیزوں کی حالت ملاحظہ ہو:-

"خوابگاہ کے مختلف گوشوں میں اس طرح خاموش و ساکت نظر آتی تھیں گویا کسی عجائب خانے کی مومی تصویریں ہیں۔ کسی کی اُنگلی تار کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی لیکن چھو نہ سکتی تھی۔ کسی کا ہاتھ دف سے علیحدہ ہو کر بٹا ہی تھا کہ وہیں رہ گیا۔ کوئی رقص کرتے کرتے کمر کو لچکا کر ہاتھ سے فرش کو چھونا ہی چاہتی تھی کہ

اسی حال میں قائم ہو گئی۔ کسی نے نقرئی گھونگروں میں آواز پیدا کرنے کے لئے
اپنی گلاب کی کلی کی طرح رنگین و خوب صورت ایڑی کو اٹھا کر نیچے فرش پر
ٹھوکر مارنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اسی حالت میں مجسمہ بن کر رہ گئی تھی۔"[15]

عورت، شباب، حسن و عشق، نیاز کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ اور جب یہ موضوعات، یونانی پس منظر میں کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں تو تخیل و تصور کی خوب صورت، نازک، شیشے و بلور کی دُنیا ہمیں مسحور کر دیتی ہے مگر حقائق اس لطیف دُنیا کا اہم جزو ہیں۔ "درسِ محبت" ایک ایسا ہی افسانہ ہے جو محبت کے سچے رُخوں کو سمیٹے ہے۔ کہ محبت محض خوب صورت جسم کی لذت کا نام نہیں۔ بلکہ یہ رُوحانی پرستش، عبادت اور ریاضت بھی ہے۔ دُردانہ، خانقاہِ زہرہ کی کنواری، جسے دیوی سمجھ کے پرستش کی جاتی تھی۔ دُردانہ سے زیادہ حسین ہونا گویا خدا ہو جانا ہے۔ ملک کا ہر وہ شخص جس کی رگوں میں خون دوڑ رہا ہے، دُردانہ کے لئے پیکرِ اضطرابِ شوق ہے۔ جن میں شہزادہ نیروبی سرِ فہرست ہے مگر دُردانہ عاشقِ صادق کی متلاشی ہے جو اُس کے جسم کے ساتھ اُس کی رُوح کی بھی عبادت کرے:۔

"وہ لوگ جو میرے جسم کو چاہتے ہیں ان سے کیونکر کہوں کہ میری رُوح تو اس سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ میرے چہرے کو بے نقاب دیکھنے کی آرزو رکھنے والے کاش میری رُوح کو بے حجاب دیکھتے مگر افسوس کہ صورت پر جان دینے والے بہت ہیں اور مجھ سے محبت کرنے والے کم۔"[16]

دُردانہ کے چہرے سے نقاب ہٹا تو وہ انتہائی بدصورت و بدشکل، شہزادہ نیروبی اور سب عاشق اس مسخ شدہ شکل سے متنفر ہو گئے۔ مگر ایک معمولی، غریب کسان کا بیٹا جو دُردانہ کی رُوح کی

[15]: "شبستاں کا قطرۂ گوہریں" ص ۴

[16]: "درسِ محبت" ص ۴۰

پرستش کرتا ہے، اُس کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور جب دُردانہ اپنا اصلی چہرہ دکھاتی ہے تو وہ چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا ہوتا ہے۔ مجمع میں کسی کے اندر اس نظارۂ حسن کی تاب نہیں۔ نیروبی، دُردانہ کے حجرے میں پہنچتا ہے تو اُسے موم کا بدنما خدوخال کا ایک نقلی چہرہ ملتا ہے۔

"درسِ محبت" ایک خوب صورت افسانہ، جس میں مادیت، جسم، نمود و نمائش سے متنفر کا انداز ملتا ہے۔ جذبہ، حقیقت اور رُوحِ محبت سے سرشار آسمانی بلندیوں پر پرواز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ آج کی بھی اٹل حقیقت جو مادیت کے پرستاروں کو "درسِ محبت" دیتی ہے۔ دُردانہ ایک ذہین کردار جو حقیقی و رُوحانی محبت کی گہری دُھند میں لپٹی ہوئی ہے۔ جب یہ دُھند چھٹی تو تا حدِ نظر روشنی ہی روشنی، نور ہی نور پھیل گیا۔ محبت نام ہے فطرت کا، رُوح کا، وجدان کا۔ جس میں رفعت ہے بلندی ہے، ارتقا ہے اور یہی تحفہ نیاز نے "درسِ محبت" کے ذریعے قارئین کی نذر کیا ہے۔

"دُنیا کا اولین بت ساز" نیاز کی عورت سے گہری محبت و عقیدت کا عکاس ہے کہ عورت محبت ہے، رعنائی ہے۔ نزاکت ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مجسمۂ ایثار و وفا ہے۔ زرتا بت تراش ایک حسین عورت کا مجسمہ بناتا ہے۔ آسمانی ملک سے رو رو کر دُعا مانگتا ہے کہ اس مجسمہ کو جیتی جاگتی عورت بنا دے۔ دُعا قبول ہوتی ہے اور وہ مجسمۂ حسن و نزاکت زرتا کی خدمت و پرستش میں مصروف رہتی ہے۔ ایک دن پھل لانے میں دیر ہوئی۔ زرتا نے غیظ و غضب میں اُسے مارا تو وہ حسین جیتی جاگتی عورت دوبارہ پتھر کا مجسمہ بن گئی۔ زرتا سر پٹک پٹک کر وہیں مر گیا لیکن مجسمے میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ اس لئے کہ:۔

"اگر عورت کو خود مرد سنگ دل بنا دے تو پھر اس کی تلافی مرد کے جان دینے سے بھی نہیں ہو سکتی۔"[17]

یہ مختصر سا افسانہ ایک اٹل حقیقت کو سمیٹے ہے۔ عورت نرمی، نزاکت اور معصومیت کا نام ہے

[17]: "دُنیا کا اولین بت ساز" ص ۶۳

مگر جب مرد کی سنگ دلی اسے پتھر بنادے تو یہ پتھر دُنیا کی کسی طاقت اور کسی جذبے سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ عورت خوب صورت جذبوں کی آبشار، اور دلکش باتوں کی پھوار ہے۔ مگر جب اُسے چُپ لگ جائے تو وہ پتھر کی بےجان مُورتی بن جاتی ہے۔ یہ پسلی سے پیدا کی گئی اور اگر سختی کی جائے تو پسلی کی ٹیڑھی ہڈیوں کی طرح ٹوٹ جائے گی۔ نیاز نے عورت کی پرستش دیوتا کی ہے اس لئے انہیں جہاں موقع ملتا ہے وہ اس مجسمۂ حُسن کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ "دُنیا کا اوّلین بُت ساز" اسی عقیدت و پرستش کا اظہار ہے۔

"زہرہ کا ایک پُجاری" اور "قربان گاہِ حُسن" تاریخی پس منظر میں حُسن وعشق کی خوب صورت کہانیاں ہیں۔ "زہرہ کا ایک پُجاری" یونانی پس منظر میں زہرہ کے پُجاری سارآردخا کا قصہ ہے، جو خوب صورت ماحول وفضا کی وجہ سے ابتدا ہی میں اپنے طلسم میں جکڑ لیتا ہے۔

"بہار کی خنک ہوا پھولوں کی خوشبو سے لبریز آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ آفتاب کی گرم و نرم شعاعیں شبنم کے قطروں میں جگمگاہٹ پیدا کرکے درختوں کو بادلے کا لباس پہنا رہی تھیں اور چڑیاں اپنے نغمہ ہائے رنگا رنگ سے فضا کے سکوت میں موسیقی کی غیر مرئی امواج پیدا کر رہی تھیں۔"[1]

اس خوب صورت ماحول میں سارآردخا اپنی شیریں آواز کا جادو جگا رہا ہے۔ شاہِ یونان کی بیٹی سیلنگا سارآردخا کی خوب صورتی، اُس کی شاعری اور بانسری کی خوش الحانی پہ عاشق ہو جاتی ہے۔ مگر سارآردخا کا دِل برف کی قاش ہے۔ پتھر ہے۔ اُس سے محبت کرنا پہاڑوں سے سر پھوڑنا ہے۔ سیلنگا اس سے محبت کی بھیک مانگتی ہے۔ انکار پہ عزت وعصمت پہ حملے کی دھمکی دیتی ہے۔ مگر زہرہ کا یہ پُجاری اپنے سینے میں خنجر اُتار کر، سچائی وصداقت کے عَلم کو بلند رکھتا ہے۔ محبت کی خوب صورت کہانی جسے یونانی پس منظر نے حقیقت کے بہت قریب کر دیا ہے

---

[1] "زہرہ کا ایک پُجاری" ص ۲۴

یونانی علم الاصنام میں یقیناً یہ قصہ موجود ہو گا جسے نیاز کی جُنبش قلم نے حیاتِ نَو عطا کی ہے۔ جو آدابِ محبت، سلیقہ وقرینہ سکھاتی ہے۔ محبت، کائنات کا سب سے سچا و سُچا، نازک نغمہ کہ کسی قسم کی منفعت اور جھوٹ کی ضرب کو برداشت نہیں کر سکتا۔ سیلنگا نے محبت کی عظمت کو بلند رکھا ہے اور اُس کے کردار میں افسانے کا تمام تر حُسن سمٹ آیا ہے۔ یہ حُسنِ فطرت کی سادگی لئے ہے جسے انشا پردازی کے زور نے حقیقت سے دُور نہیں کیا۔

"قربان گاہِ حسن" ارضِ بابل کی مرندا کی کہانی ہے، جو راہب میرآن کی محبت میں تڑپ رہی ہے۔ مگر وہ اس محبت سے انجان ہے۔ انکار پہ غضب کی دیوی بن جاتی ہے، اور عصمت دری کا الزام لگا کر اُسے گرفتار کرا دیتی ہے۔ میرآن کی معصومیت وبےگناہی، قدرت کا انتقام بن کر ٹوٹ پڑتی ہے۔ اپنی ابن سلیمہ کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے زہر دلواتی ہے، سازش میں پکڑی جاتی ہے اور ذلیل خوار ہو کر ملک بدر کی جاتی ہے اور پھر فقیروں کے انداز میں زندگی بسر کرتی ہے۔ مکافاتِ عمل کا مؤثر انداز، کہ انسان سے محبت خدا سے محبت ہے۔ جس نے دوسروں کے حقوق پامال کئے، قدرت اُس سے ہولناک انتقام لیتی ہے۔ جھوٹ، فریب، ناپائیدار مگر سچ وصداقت آفاقی ہیں۔ سانچ کو آنچ نہیں۔ فطرت انسانوں کا بدلہ خود لیا کرتی ہے۔ نیاز نے یہ اصلاحی سبق، ایک دلکش داستان کے ذریعے پہنچایا ہے۔ جس میں تاریخی صداقت بھی ہے اور فطری حُسن بھی۔ کہانی بڑی روانی وسلاست سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور اپنے فطری انجام کو پہنچتی ہے۔ قارئین اسی انجام کی توقع رکھتے ہیں۔

"شبستان کا قطرۂ گوہریں" حقیقی و دلکش افسانوں کا مجموعہ جو محبت اور عورت کے مسائل سے متعلق مثبت ومنفی اقدار رکھتا ہے۔ ان مثبت ومنفی اقدار میں صداقت وحقیقت ہے۔ یہی صداقت وحقیقت ان کہانیوں کا حُسن ہے۔ یہ حُسن فطری و رُومانی ہے۔ ان کے کردار ہماری اپنی دُنیا کے جیتے جاگتے کرداروں کی نفسیات و ذہن لئے رہتے ہیں۔ ان میں فطرت کے دلکش مناظر بھی ہیں۔ انشا پردازی و لفظوں کی طلسماتی خوب صورتی بھی، خوابوں کے پرکشش مہتاب خانوں میں

لے جاتی ہے۔ بلاشبہ اِنشاپردازی اور رُومانیت نے اِن کہانیوں کے حُسن میں اضافہ کیا ہے۔

یُوں افسانے کی دُنیا میں نیاز فتح پوری یقیناً ایک بڑا نام ہے۔ رُومانیت اور جمال پرستی کا سحر اُنہیں عظیم افسانہ نگاروں کی صف میں لاکھڑا کرتا ہے لیکن وہ محض رومان پرور اور جمال پرست ہی نہیں اُن کے مقصدی، اصلاحی اور تاریخی افسانے بھی اُتنے ہی دلکش ہیں جتنے رُومانی و تخیلی افسانے البتہ اُن کا قلم اُسلوب و اِنشا کے جو دِلکش پھول رُومانی افسانوں میں بکھیرتا ہے۔ اِصلاحی و مقصدی افسانوں میں اُتنا ہی سادہ اور ٹھوس نظر آتا ہے۔ کسی بڑے فن کار کی یہی خوبی ہے کہ موضوع کے اِعتبار سے اِس کا اُسلوب نِت نئے پیراہن بدلتا ہے۔ اُردو افسانہ، نیاز فتح پوری کی افسانوی خدمات کو کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کرسکتا خواہ وہ موضوع کی متنوع دُنیا ہو یا اُسلوب و اِنشا کی رنگین دُنیا۔

باب ۳

تنقید

ابتدائے آفرینش میں خالقِ کائنات نے جب بھُربھُری مٹی کے سیاہ پُتلے میں اپنی رُوح پھونکی تو جہاں اُسے فطری طور پر بے شمار صلاحیتوں سے نوازا۔ وہاں اچھے بُرے کی شناخت ادنیٰ و اعلیٰ میں تفریق، مثبت میں کشش اور منفی سے تنفّر کی قُدرتی صلاحیت بھی بخشی۔ گویا تنقید وہ فطری جوہر ہے جو انسان کی سرشت میں شامِل ہے۔ اِسی لیے تنقید انسانی زندگی کے لیے اتنی ہی ناگزیر سمجھی گئی جتنی کہ سانس یہ اِنسان میں کھوٹے کھرے کی یہ پہچان، بلند و پست میں تمیز، اچھی روشن اقدار کو اپنا لینے اور بُری سیاہ چیزوں کو چھوڑ دینے کا عمل ہی تھا جس نے اُسے موجودہ دَور کے شاندار تمدّن کی تخلیق پر قادر کیا ہے۔ ورنہ شاید وہ آج بھی کل کے وحشی جانور نما اِنسان کی طرح جنگلوں میں زندگی بسر کر رہا ہوتا۔ درختوں کے پتّے اُس کا لباس اور کچا گوشت اُس کی خوراک ہوتی۔ مگر تنقید کی خداداد صلاحیت نے اُسے جہاں زمینی طور پر خوب صورت و پُرآسائش دُنیا آباد کرنے کی طرف مائل کیا وہاں چاند ستاروں پہ بستیاں بسانے کے سنہرے خواب کو حقیقت بنا دیا ہے۔ اِنسان کا تحفّظ و بقا تنقید میں ہی مضمر و پنہاں ہے۔ تنقید کا

امکانات پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے نتیجے کا استخراج کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے خاص صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر شخص تنقیدی اُصول و مباحث کے مطالعے سے نقاد نہیں بن سکتا۔ اُسے ذاتی پسند و ناپسند، محبت و عناد سے بلند تر ہو کر فیصلے کرنے پڑتے ہیں، اس اعتبار سے اُس کے لئے تھوڑا سا ماورائی اور "فوق الانسان" ہونا بھی ضروری ہے۔

اُردو ادب میں تنقید کا سفر "داد کی روایت" سے شروع ہوتا ہے۔ جو عربی و فارسی سے ہوتی ہوئی اُردو میں منتقل ہوئی ——— اور جو ایک شاعر دوسرے شاعر کا کلام سُن کر اپنی رائے کی صورت میں دیتا تھا۔ یہ محض تاثراتی انداز تھا جس میں زیادہ تر الفاظ و اُسلوب، وزن، ردیف، قافیہ اور بحور کو زیر بحث لایا جاتا۔ مگر اس کی اہمیت اور تنقیدیت کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدا میں اس رائے کا اظہار زبانی ہوتا تھا بعد میں تحریری صورت میں پیش کیا جانے لگا۔ دراصل یہی رائے "تقریظ" کی ابتدا تھی۔ "تقریظ" تبصرہ کی ایک قسم ہے جس میں کسی کتاب پر فرضی و خیالی بحث ہوتی۔ خامیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کر کے محض خوبیوں اور محاسن کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ زیر تبصرہ کتاب کی بجائے عام بحث کا رویہ بھی ملتا ہے۔ "تقریظ" کی یہ روایت بہت عرصہ تک قائم رہی۔ یہاں تک کہ غالب جیسے نرگسی، انا پرست و خود پسند فن کار نے بھی بے شمار تقریظیں لکھیں۔

اُردو تنقید میں تذکرے، خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اور انہی سے باقاعدہ طور پر تنقید کا آغاز ہوا ہے۔ تذکرے دو طرح سے لکھے گئے۔ ابتدا میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے لکھے جاتے تھے بعد میں تاریخی ادوار کے حساب سے لکھے جانے لگے۔ اس طرح حروفِ تہجی کے اعتبار سے جو فکری انتشار و بے ربطی پیدا ہوئی اُس کا انسداد ہوا۔ یہ تذکرے اختصار یا Biographical Dictionary کے انداز میں لکھے جاتے رہے۔ شاعر کے حالاتِ زندگی، پیدائش سے وفات تک اہم ترین واقعات کو مختصر طور پر پیش کیا جاتا۔ ان میں تھوڑی بہت تنقید بھی ہوتی جو محض تاثرات کی صورت میں ہوتی۔ جس سے پتا چلتا کہ زیر تبصرہ شاعر کا عمومی

عمل زندگی کے ہر ہر پہلو اور ہر ہر قدر میں جاری و ساری ہے۔

تنقید، دراصل فکر کا وہ شعبہ ہے جو یا تو یہ سوال اُٹھاتا ہے کہ شعر و ادب کیا ہے؟ شاعری کی ماہیت و منصب کیا ہے؟ شعر کیوں لکھے جاتے ہیں اور کیوں سُنائے جاتے ہیں؟ اچھے و اعلیٰ ادب و شعر کی پہچان کیا ہے؟ شاعری کے جملہ عناصر کیا ہیں؟ یہ نظری تنقید ہے، جس کا مقصد اُصول و نظریات سے بحث کرنا ہے لیکن جب ان اُصولوں کی روشنی میں تخلیقات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ حکم لگایا جاتا ہے کہ فلاں نظم اچھی ہے اور فلاں نظم اچھی نہیں ہے گویا جب ان اُصولوں کا عملی نفاذ کیا جاتا ہے تو یہ "عملی تنقید" کہلاتی ہے۔ تنقید کی یہ دونوں شاخیں نظری تنقید THEORETICAL CRITICISM، عملی تنقید FRACTICAL CRITICISM کسی نہ کسی طور پر ہر تخلیقی تجربے میں پنہاں ہوتی ہیں۔ نقاد کا کام کماحقہ ان دونوں اہم فرائض کو انجام دینا ہے۔ اُسے انتہائی سوچ و فکر، سنجیدگی و تدبّر سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ادبی عدالت کا جج ہے اور اُس کا کام ادبی نوعیت کے اہم فیصلے کرنا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو اُس کے فرائض حاکم عدالت سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں بقول نیاز فتح پوری۔

"نقاد کے فرائض حاکم عدالت کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں کیونکہ حاکم کے سامنے صرف حال ہوتا ہے لیکن نقاد کو ماضی، حال، مستقبل تینوں پر غور کرنا پڑتا ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے، اس کے لحاظ سے وہ مورخ ہے جو ہو رہا ہے اس کے لحاظ سے وہ مفکر ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اُس کے لحاظ سے وہ کاہن و پیغمبر ہے اور ان تینوں فرائض کو دیانت و امانت، کامل حزم و احتیاط کے ساتھ ادا کرنا آسان نہیں۔[1]"

حقیقت یہی ہے کہ نقاد کو ادب کے ماضی، حال اور مستقبل تینوں کے وقوع پذیر اور آئندہ

---

[1] "نگار" انتقاد نمبر ص ۔۔، فروری مارچ ۱۹۵۹ء، حصہ دوم

رنگ شاعری کیا تھا۔ پھر کلام کا مختصر انتخاب پیش کیا جاتا۔ انگریزی اثرات سے تذکرہ نگاری میں دو عناصر خاص طور پر اُبھرے۔ ایک تو یہ کہ ہر تذکرے کے شروع میں زبانِ اردو کی تاریخ کا ایک جزو آ نکلا۔ دوسرا عنصر حد بندی کا تھا۔ جو گرچہ پہلے سے موجود تھا مگر اتنی باقاعدگی کے ساتھ نہیں۔ انگریزی اثر کے بعد ادوار بندی کا رُجحان زیادہ وضاحت اور تعین کے ساتھ پھیلا۔ علی ابراہیم خان کا "گلزارِ ابراہیم"، گردیزی کا "تذکرۂ ریختہ گویاں"، میر حسن کا "تذکرۂ شعرائے اُردو"، میر کا "نکات الشعراء"، مرزا علی لطف کا "گلشنِ ہند"، کریم الدین کا "طبقات الشعرائے ہند"، مصطفٰے خاں شیفتہ کا "گلشنِ بے خار"، قائم کا "مخزنِ نکات"، مصحفی کا ... لچھمی نرائن شفیق کا "چمنستانِ شعراء" اہم ترین تذکرے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر ان میں بہت سی خامیوں کا احساس ہوتا ہے۔ شاعر کا عہد، زندگی اور ماحول سے متعلق پوری معلومات نہیں ملتیں۔ گزرتے گئے اور بے بنیاد واقعات شامل کر دیے گئے ہیں۔ محض رسمی الفاظ مبالغے اور دور کی پیوند سے شعراء کی تعریف و مذمت کی گئی ہے۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد

> "اُن سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی سرگزشت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ نہ اُس کی طبیعت و عادت و اطوار کا حال کُھلتا ہے۔ نہ اُس کے کلام کی خوبی سامنے آتی ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے معاصروں میں اور اُس کے کلام میں کیا نسبت تھی۔ انتہا یہ ہے کہ سال ولادت اور سالِ فوت تک نہیں کُھلتا۔"[1]

یوں آزاد نے تذکرہ نگاری کی اصلاح کی طرف قدم اُٹھایا۔ اُردو شاعری کی تاریخ کو ادوار میں تقسیم کیا۔ اور شعراء کا حال اس تفصیل اور خوبی سے لکھا کہ ان کی چلتی پھرتی، بولتی چالتی تصویروں کے جیتے جاگتے مرقعے پیش کر دیتے۔ اس سے ہمیں علم ہو جاتا کہ کوئی شاعر کس زمانہ و دور میں گزرا؟ اُس کے معاصرین کون کون تھے؟ "آبِ حیات" قدیم تذکروں سے مختلف ہے۔ اس

۱؎ دیباچہ آبِ حیات" ص ۸۔ سنگِ میل پبلی کیشنز اُردو بازار لاہور

میں اُردو زبان کی تاریخ، لسانی مسائل، مختلف ادوار کی خصوصیات شاعری اور شعراء کی شخصیت و کلام پر رائے زنی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو تاریخ، تنقید اور سوانح میں برتا جاتا ہے۔ "آبِ حیات" اپنی انشا پردازی و مرقع نگاری کی وجہ سے لازوال ہے لیکن اس کا تحقیقی پہلو بہت ہی کمزور ہے۔ آزاد نے تذکرہ نگاری کے فن کو ترقی دی۔ مگر وہ [illegible] نے رائے دینے میں تعصب و طرفداری سے کام لیا۔ شعراء کے تحلیل و تجزیے میں ذاتی پسند و ناپسند کو دخل دیا۔ پہلے ایڈیشن میں جو ۱۲۹۷ھ میں منظرِ عام پر آیا۔ مومن، میر ضاحک، حقیقت، انیس و دبیر جیسے اہم شعراء کو نظر انداز کرنے اور ذوق کو غالب سے برتر قرار دیتے ہوئے انھیں ملک الشعراء کا خطاب دینے میں یقیناً ان سے غلطی سرزد ہوئی۔ تنقید میں محض تأثرات سے کام لیتے ہوئے مختلف شعراء کے سلسلے میں ایک ہی سی تنقیدی طرز سے کام لیا ہے۔ ان کمزوریوں کے باوجود بعد کے مؤرخین اور ناقدین کے لئے ایک نئی راہ ہموار کی اور مولانا حالی اس راہ کے پہلے مسافر اور جدید تنقید کے بانی اور مجتہد قرار پائے۔ تذکروں کی تنقید مختصر اور محض رسمی تھی۔ اس کا حصہ محض زبان و لغت کے فنی پہلو، محاورات و استادی کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھا۔ مگر حالی نے مغربی اثرات کے تحت تنقید کے اس رنگ کو بدل دیا۔ انگریزی خود تو نہ جانتے تھے لیکن تراجم اور دوستوں کی مدد سے مغربی تنقید کے افکار و خیالات سے اُردو تنقید کے رنگ ڈھنگ میں تبدیلی پیدا کی یہی وجہ ہے کہ "مقدمہ شعر و شاعری"[1] اُردو میں جدید تنقید کا پہلا نمونہ ہے۔ یوں ادب اور زندگی کا تعلق، شاعری اور سوسائٹی کا ربط، شاعری اور اخلاق، شاعری کی ماہیت، اعلیٰ شاعری کی خصوصیات، لفظ و معنی کا تعلق، جیسے اہم ترین موضوعات سامنے آئے۔ نظری تنقید کے علاوہ "مقدمہ شعر و شاعری" کی عملی تنقید کا حصہ بھی بہت اہم ہے جس میں حالی نے غزل، مثنوی، قصیدہ کی اصلاح کے سلسلے میں مفید مشورے دیئے۔ اس کے علاوہ "حیاتِ سعدی"، "یادگارِ غالب"،

۱؎ ڈاکٹر فرمان فتح پوری "تذکرہ نگاری" ص ۷۶، ارژنگ پاکستان اصنافِ ادب نمبر سالنامہ ۱۹۶۶ء

حیاتِ جاوید" کا تنقیدی حصہ مقالاتِ حالی اور تقریظیں، حالی کی تنقید کے سلسلے میں توجہ طلب ہیں۔ "مقدمہ شعروشاعری" کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ اب تک ناقدین نے اِسے قیمتی تنقیدی سرمایہ سمجھا ہے۔ یہاں تک کے کلیم الدین احمد جیسا سخت گیر نقاد بھی یہ کہنے پہ مجبور ہے۔[1]

"اپنے زمانے، اپنے ماحول، اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ لائق ستائش ہے۔ حالی صرف اُردو تنقید کے بانی ہی نہیں اِس وقت اُردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔"

حالی کے بعد اُن کے رفیق و ہمعصر شبلی نعمانی کا مرتبہ بھی نقاد کی حیثیت سے مسلّم ہے اُن کی نظر میں جدت، وسعت اور گہرائی ہے۔ "شعر العجم" پانچ جلدیں۔ "موازنہ انیس و دبیر" اور "سوانح مولانا روم" میں شبلی نے باقاعدہ طور پر نظری اور عملی تنقید ہمارے سامنے پیش کی ہے اُن کے تنقیدی مباحث میں نفاست، خوش ذوقی اور تفصیل ہے۔ شبلی نے حالی کی طرح مغرب کے تنقیدی نظریات و خیالات سے استفادہ کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے شبلی کی تنقید میں مشرقی انداز کا رنگ گہرا ہے۔ وہ نقاد سے زیادہ معانی و بیان کے عالم نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر فارسی شاعری کو سامنے رکھا ہے یوں اپنے موضوع کی سماجی اہمیت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ نقاد سے زیادہ وہ ایک شارح ہیں۔ یعنی شاعر کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے وہ اُس کے اشعار کا مطلب و معنی تفصیل سے لکھ دیتے ہیں۔ بہرحال اُنہیں مشرقی تنقید کا عالم و فلسفی نقاد کہا جاسکتا ہے۔

شبلی اور حالی کی تنقید نے بعد میں آنے والی نسل کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کے ہی تنقیدی خیالات کو آگے بڑھایا گیا۔ اور کوئی قابلِ قدر نمایاں اضافہ نہ ہو سکا۔ امداد امام اثر کی "کاشف الحقائق" جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ تنقیدی حیثیت سے قابلِ قدر ہے۔ جس میں شاعری کی ماہیت کے ساتھ ساتھ عملی تنقید کے نمونے ملتے ہیں۔ مہدی افادی

---

[1] اُردو تنقید پر ایک نظر ص ۸۰، بار اوّل جون ۱۹۶۵ء عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور

شبلی سے بہت متاثر ہیں۔ اُن کی نظر ترقی پسندی کی طرف تھی۔ وہ پُرانی طرز اور پُرانی ڈگر پر نہیں چلنا چاہتے تھے مولانا عبدالحئی ندوی کی "گل رعنا" تاریخ ہے جسے تذکرہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ مگر اس کا مقصد شاید صرف "آبِ حیات" کی تنقیص تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے شبلی کی "شعرالعجم" کی تقلید میں "شعرالہند" لکھی۔ ہند کی شعری روایت و تاریخ کو پیش کیا۔ مگر اس کا دو تہائی حصہ محض اشعار کے لئے وقف ہے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے باقاعدہ طور پر تنقید کی کوئی کتاب "الاصول" تو نہیں لکھی۔ اُن کی تنقید تقریظیں و تبصرے جو انہوں نے مختلف موضوعاتِ ادب، شاعری، خطوط، فلسفہ، سائنس اور مذہب کی کتابوں پہ تنقید لکھتے ہوئے کچھ اُصول متعیّن کئے ہیں۔ جو مختلف اصناف کی اصلاح سے متعلق ہوتے ہوئے تنقیدی اعتبار سے خاصے اہم ہیں۔ مولانا حامد حسین قادری نے "نقد و نظر" میں فنِ شعر اور شاعری کی ماہیت سے متعلق بحث کرتے ہوئے شعر کی معنوی اور صوری خصوصیات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ وہ تشریح، محاسن و معائب دونوں کو سمجھنے اور بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے "محاسنِ کلامِ غالب" لکھ کر تاثراتی تنقید کا قابلِ تقلید نمونہ پیش کیا۔ جس میں غالب کی شاعری کو الہامی ثابت کرتے ہوئے یوں سمیٹا گیا ہے گویا دریا کوزے میں بند ہے۔

ڈاکٹر محی الدین زور نے "روحِ تنقید" اور "اُردو کے اسالیبِ بیان" میں تنقیدی مباحث پر اختصار سے روشنی ڈالی ہے۔ اُردو تنقید کے تحت حالی، آزاد، شبلی، عبدالرحمان بجنوری، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا ظفر علی خاں کی تنقیدی صلاحیتوں پر تبصرے کئے ہیں۔ "اُردو کے اسالیبِ بیان" میں اُردو نثر کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ارتقائی سفر پر روشنی ڈالی ہے۔ حامد اللہ افسر میرٹھی نے "نقد الادب" "مغربی اثرات کے تحت پیش کی جس میں مباحث یونانی و سنسکرت، اصولِ نقد اور اُردو اصنافِ سخن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

گویا نیاز فتح پوری تک پہنچتے پہنچتے تنقید کی راہیں متعیّن ہو چکی تھیں۔ ناقدانِ فن یا تو مغرب سے استفادہ کئے خیالات کو پیش کر رہے تھے۔ یا پھر عربی و فارسی نقد کے حوالے سے عملی تنقید کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ہر ادب خاص سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، ثقافتی روایات و اقدار سے نمو پاتا ہے۔ تخلیقی تجربہ اُسی ماحول میں جنم لیتا ہے۔ جس فضا میں اُس کا خالق سانس لیتا ہے۔ فضا خوشگوار ہو یا ناخوشگوار اُس کے اثرات تخلیقی عمل پر ضرور پڑتے ہیں۔ لہٰذا اُنہی حالات و فضا میں اصولِ نقد ترتیب دیئے جانا چاہئیں۔ یہ نہیں کہ ہم یہاں کے ادب کو یونانی فکر و تنقید پہ پرکھیں۔ یا پھر بیسویں صدی کے ادب کا جائزہ دسویں صدی کے اُصول و ضوابط کی روشنی میں لیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ اُصول اپنی طاقت، توانائی اور تازگی کی وجہ سے آفاقی و کلاسیکل حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ چنانچہ ناقدین کا روایت اور مروّجہ اُصولوں سے انحراف مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اگر انحراف کیا بھی جائے تو خاص عقلی، منطقی اور تاریخی جواز کا ہونا لازمی شرط ہے بقول سیّد احتشام حسین:-

"کوئی نقّاد اپنے عہد سے اتنا بلند نہیں ہو سکتا کہ وہ شعر و ادب کی تمام مروّجہ روایتوں سے رشتہ توڑ لے۔ اور بالکل نئی روایتیں پیش کر دے۔ یہ کسی حد تک اُسی وقت ممکن ہے جب سماج کا کوئی اہم حصّہ عصری روایات سے بیزار ہو جائے اور تاریخ اس بیزاری کے لئے وجہِ جواز بھی مہیا کر دے[1]۔"

ہمارے ہاں اِسی طرزِ احساس نے تنقید کے ارتقا و عروج میں کچھ رکاوٹیں بھی پیدا کیں مگر جلد ہی ناقدینِ فن نے اِس ٹھوس حقیقت کو جان لیا۔ تذکروں کے روایتی انداز اور مغربی اندازِ فکر سے ساتھ ساتھ کافی متاثر ہوئے، ہماری تنقید آگے قدم بڑھانے لگی۔ چنانچہ لٹریچر کے

---

[1] "تنقید کے ایک نئے نقطۂ نظر کی ضرورت" نگار تنقید نمبر سالنامہ ۱۹۵۰ء ص ۱۲۱، جلد ۴۰، شمارہ ۱

ساتھ ساتھ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرف بھی توجہ کی جانے لگی۔ نیاز فتح پوری اِس حقیقت سے باخبر تھے کہ انسان فطرتاً جستجو پسند واقع ہُوا ہے۔ اس کی فرصت کا بہترین مشغلہ یہی ہے وہ ہر اُس چیز کی نسبت معلومات حاصل کرے جو اُس کے علم سے باہر ہے۔ اور کائنات کے ہر اُس راز کو دریافت کرے جو اُس سے وقت نظر کا طلب گار ہے۔ فطرت کی اِسی خصوصیت کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کے عُہدہ پر فائز ہے۔ اور اُس سے ترقی و ارتقا کے مدارج جلد طے کرا دیئے۔ اِس لئے خود آگہی و خود شناسی ہی علم اور جاننے کی ابتدا ہے بقول نیاز وہ چیز جس کی نسبت ہم کو سب سے پہلے تحقیق کرنی چاہیئے خود ہماری ذات ہے جب تک ہمیں اتنا علم حاصل نہ ہو جائے ہمیں کوئی حق نہیں کہ دیگر موجودات عالم پر غور کریں[1] وہ اِس بات کو بھی سنجیدگی کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ دُنیا ترقی کرتی جا رہی ہے اور اُس کی رفتارِ ترقی اِس قدر سریع کہ آسانی سے نہ کوئی تاریخ اس کا تعاقب کر سکتی ہے اور نہ کسی کی قوتِ خیال۔ لیکن ہمارا معاشرہ شاید دُنیا سے کوئی الگ حصّۂ زمین ہے جہاں نہ قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ اپنا اثر رکھتا ہے اور وہ نہ اُصولِ ارتقا اپنی قوت۔ تنقید کا میدان بہت وسیع ہے چنانچہ ہمیں اُس کی تمام تر وسعتوں کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ نیاز نے اِسی اُصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے زندگی اور اُس کو حُسن بخشنے والے تمام تر علوم اور اُن کی توجیہات پر غور و فکر کیا ہے۔ اُن کے مطالعہ اور تنقید کا دائرہ ادبیات سے ہٹ کر بہت سے معاشرتی، ذہنی اور سائنسی علوم تک پھیلا ہُوا ہے۔ حتیٰ کہ اِسلامیات، تاریخِ اِسلام، مذہبیات کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اُنھوں نے سرسیّد اور شبلی کی طرح ناقدانہ اظہارِ خیال نہ کیا ہو۔ اُنہوں نے نہ صرف قدیم مذہبی و دینی مکتبۂ فکر کے علماء اور ان کی تعلیمات پر اظہارِ خیال کیا ہے بلکہ اپنے عصر کے بڑے عالموں مثلاً سیّد سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، مولانا تمنا عمادی سے

---

[1] "مقدمہ گہوارۂ تمدن" ص ۱۳، دارالطبع انڈین پریس لکھنؤ۔

بھی علمی و فلسفیانہ بحثیں کی ہیں۔ یہ مباحث بہت اہم ہیں۔ اُن کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا مگر ان علمی و فلسفیانہ مباحث سے ہٹ کر وہ رقص، موسیقی، مصوری اور فن تعمیر کے بارے میں بھی صحت مند و روشن نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ جب وہ ان میدانوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھاتے ہیں تو ایک ماہر فنون لطیفہ کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے باقاعدہ تصانیف تو پیش نہیں کیں مختلف افسانوں، مضامین و استفسارات میں اس کا اظہار کیا ہے۔ مجموعی طور پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان لطیف فنون کو تہذیبِ فطرت اور تحفۂ قدرت سمجھتے ہیں۔ جن کا مقصد روحانی، جمالیاتی، جذباتی و احساساتی مسرت و تسکین دینا ہے۔ اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا یہ بلور سے نازک شیشے جیسے محسوسات و احساسات سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں محسوس کرنے کے لئے اُنہی جیسے محسوسات کی ضرورت ہے۔ نیاز ان فنون کو بہتر سے بہتر اور خوب سے خوب تر دیکھنا چاہتے ہیں۔ تاریخ، مذہب، اخلاقیات، سیاست، صحافت، عمرانیات اور تہذیب و کلچر پہ اُن کی گہری نظر تھی۔ اُنہوں نے نہ صرف فنی اعتبار سے ان علوم کے اصول و ضوابط متعین کئے ہیں بلکہ تاریخی اعتبار سے ان علوم کے تدریجی ارتقاء پر روشنی بھی ڈالی ہے لیکن حیرت ہے کہ نیاز کے ناقدین نے اُن کے تنقیدی نظریات کے اس پہلو کی گہرائیوں اور لامتناہی وسعتوں کو ابھی تک نظر انداز کیا ہے۔ تنقید کا یہ رویّہ اور اس انداز کی مثال اُردو تنقید میں شاید ہی کہیں مل سکے۔ اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی حالانکہ یہ ایک الگ مقالے کا موضوع بن سکتے ہیں۔ میرا مقصود چونکہ صرف نیاز کی ادبی زندگی اور خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینا ہے اس لئے بقیہ تحریروں سے صرف نظر کرکے یہاں صرف نیاز کی لسانی و ادبی تنقیدوں کو زیادہ اہمیت دوں گی۔ نیاز فتح پوری کا کہنا ہے کہ

"دُنیا اَب اخلاق کے مواعظ سے تنگ آ چکی ہے۔ اور اَب اُسے حقائق کی ضرورت ہے۔ وہ پریوں اور فرشتوں کے تذکرہ سے گھبرا چکی ہے۔ اور

اب وہ گوشت پوست کے انسانوں کی بابت دریافت کرنا چاہتی ہے۔ وہ زندگی کے حُسن کو ہی دیکھنا چاہتی ہے، اور اس کے عیب کو بھی وہ صرف شہزادیوں اور کروڑ پتیوں ہی کو نہیں بلکہ مزدوروں، فقیروں اور غلاموں کو بھی دیکھنا چاہتی ہے۔[1]"

حقیقت یہ ہے کہ نہ تمام دُنیا خوب صورت ہے اور نہ تمام زندگی دلچسپ و دلکش ایک سچّے فن کار کا کام صداقت، حُسن، روشنی اور حلاوت ہی کو پیش کرنا نہیں اُسے جھوٹ، سیاہی، کثافت کرختگی کو بھی پیش کرنا ہوگا۔ تبھی خیر و شر کے تقابل سے خیر سے محبّت اور شر سے نفرت کا عنصر پیدا ہوگا۔ نیاز کا عقیدہ یہ ہے کہ فن کار کو سچ محسوس کرنا چاہیے۔ سچ دیکھنا چاہیے، سچ کہنا چاہیے۔ لیکن اس سچ کا کوئی مقصد ضرور ہو تاکہ دُنیا اس کو سُنے سمجھے، محسوس کرے اور کسی نتیجہ پر پہنچے۔ نقّاش ہو یا بت تراش، شاعر ہو یا ادیب، اُس کی تمام فن کاریاں اُس کی ذات کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے ہیں اس لئے اگر اُس کی زندگی اور اُس کا فن دُنیا کے حقائق کو اہلِ دُنیا کے لئے گوارا نہ بنا سکا تو یہ قصور حقیقت کا نہ ہوگا بلکہ فن کار کا ہوگا، جو حقیقت کو موزوں لب و لہجہ اور مناسب و مؤثر زبان میں پیش نہ کر سکا۔

نیاز ادب و شعر، علم بدیع، فنِ عروض، لفظ و اسلوب کے ماہر تھے۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے اختلاف کی گنجائش کم ہی نکلتی ہے۔ زبان و ادب کے زاویہ سے بھی نیاز کا دائرہ تحقیق و تنقید اپنے عہد کے اور اپنے ہم عصر ادیبوں کے مقابلے میں بہت ہمہ گیر ہے۔ ہمہ گیر ان معنوں میں کہ اُنہوں نے اُردو زبان و ادب کی ہر صنف اور ہر مسئلہ پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایشیا کی اکثر بڑی زبانیں یعنی عربی، فارسی ہندی و سنسکرت، اُردو ہی کی طرح اُن کی توجہ کا مرکز رہیں۔ اُنہوں نے انگریزی زبان و ادب

[1] "فنونِ ادبیہ و حقیقت نگاری" انتقادیات حصّہ دوم ص ۲۹۸، ۱۹۴۴ء پہلا ایڈیشن نگار بک ایجنسی لکھنؤ

سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ ان کے اثرات اُن کی تحریروں میں نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔ اُن کے ہم عصروں میں بھی کوئی ادیب و انشا پرداز ایسا نہیں ملتا جس نے بیک وقت ہندی، فارسی اور اُردو ادبیات پر گہری بصیرت کے ساتھ مسلسل لکھا ہو اور اپنا اثر بھی چھوڑا ہو۔ اُن کی یہ تحقیق اور قلم کاری اُردو زبان کے حق میں آئندہ نسلوں کے لیے یوں مفید ثابت ہوئی کہ وہ ان زبانوں کے باہمی رشتوں، ایک دوسرے پر ان کے اثرات اور اُن کی قدر و قیمت کی تعیّنات میں کشش محسوس کرنے لگے جو علمی، لسانی، اور ادبی اعتبار سے یقیناً دلچسپ بھی ہے اور ضروری بھی۔ اِس عالمانہ انداز کے علاوہ وہ فنون کی جمالیاتی و وجدانی ضرورتوں سے بھی آگاہ ہیں۔

نیاز کے مطابق فنونِ لطیفہ جمالیاتی طور پر مسرت بخشنے کا عظیم فطری جوہر و عطیہ ہیں۔ اِن کا تعلق حواسِ ظاہری سے ہے۔ بیرونی تحریک ختم ہونے پر ان کا لُطف بھی زائل ہو جاتا ہے لیکن ادبیات کا ذہنی و جمالیاتی لُطف و اثر کسی بیرونی تحریک سے وابستہ نہیں۔ وہ اپنے اثرات بغیر کسی مادی وساطت کے انسان کے ذہن و دماغ پہ چھوڑ جاتا ہے۔ ادب فرد سے قوم اور انفرادیت سے اجتماعیت کا علم و سُراغ دیتا ہے۔ اِس کی اہمیت و افادیت اسی راز میں پنہاں ہے۔ تمام فنونِ لطیفہ میں ادب و شاعری کی اہمیت و ارفعیت مسلّم ہے بقول نیاز:۔

"تمام فنونِ لطیفہ میں لٹریچر کو وہی حیثیت حاصل ہے جو گلدستہ میں چوٹی کے پھولوں کو حاصل ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ، جس طرح ہم کسی پھول کو دیکھے بغیر محض اُس کی خوشبو سے اُس کی نوعیت کا اندازہ کر لیتے ہیں اُسی طرح ایک قوم کے لٹریچر کو دیکھ کر اُس کی حیاتِ اجتماعی کے تمام پہلوؤں کو سمجھ سکتے ہیں[1]۔"

---

[1]:۔ "ادبیات اور اصولِ نقد" نگار پاکستان اصنافِ ادب نمبر سالنامہ ۱۹۶۶ء، ص ۱۴۲، انتقادیات حصہ دوم ص ۲۰۳، ۲۰۴، نگار بک ایجنسی لکھنؤ پہلا ایڈیشن ۱۹۴۴ء

گویا ادب سماجی حرکت و عمل کا اظہار ہے اور اُن تمام نشیب و فراز کا حوال ہے جن سے کوئی فرد یا قوم گزرتے ہوئے ترقی و عروج یا زوال و انحطاط کا شکار ہوتی ہے۔ مثبت سے منفی اور منفی سے مثبت ردِ عمل، زندگی کی مکمل کہانی ہے۔ زندگی کے مثبت و منفی نتائج کا جو حقیقی طور پہ اگر ہمیں کہیں مل سکتا ہے تو وہ ادب ہی ہے۔ ادب اور زندگی دائروں میں سفر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے متلاشی اِردگرد گھومتے ہیں۔ دائرے کے دونوں سرے ملنے پر ان کی تکمیل ہوتی ہے، اور اندر کے خلاء میں جو بظاہر خالی نظر آتا ہے۔ صدیوں کے مشاہدات تجربات، احساسات و جذبات، تخیّلات و تصوّرات پنہاں ہوتے ہیں۔ اس میں وہ زندگی بھی نظر آتی ہے جو حقیقتوں کے ٹھوس و مادی سکرین پہ نغموں کی طرح گزرتے ہوئے اختتام پذیر ہو چکی ہے اور زندگی کا وہ رُوپ بھی دکھائی دیتا ہے جو نازک و لطیف خوابوں خیالوں اور رُومانی دُنیا میں خوشبو پہ سفر کرتا ہے۔ یہ قافلہ تو بہار لفظوں کے دوش پہ جہاں ٹھہرتا ہے وہ ادب ہی ہے۔ بقول نیاز فتح پوری:۔

"ادب حقیقتاً ایک ریکارڈ ہے اُن تمام تجربات و احساسات کا، جن سے ایک انسان اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔ گویا کہ ادب زندگی کا اظہار ہے الفاظ کے ذریعے سے اور اسی لئے جس طرح ادب کی تخلیق زندگی سے ہوتی ہے۔ اُسی طرح زندگی کی تخلیق بہت کچھ ادب پر منحصر ہے[1]۔"

نقاد کا کام اِسی اِنسان و زندگی کے رابطے و رشتے اور تجربات و احساسات کے ریکارڈ کا تجزیہ کرتے ہوئے ایسی اقدار و روایات کا تعیّن کرنا ہے جو نہ صرف حال بلکہ مستقبل میں بھی جذبات و احساسات، ادب و زندگی کا ساتھ دے سکیں۔ نقّاد عملی و فلسفیانہ ہوتا ہے۔ بیک وقت تحلیلی و تخیّلی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ ذوقِ سلیم اور تیز ادراک کی بھی ضرورت ہے۔

---

[1]:۔ انتقادیات (ادبیات اور اصولِ نقد) حصہ دوم ص ۱۰۲۷۰، ۱۹۴۴ء نگار بک ایجنسی لکھنؤ۔

اس لئے تنقید کی منزل خاصی دشوار گذار و کٹھن ہے، ہر شخص آسانی سے اِس پُل صراط کو پار نہیں کر سکتا۔

شعور فہم اور ادراک وہ فطری قوتیں ہیں جو ہر انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں۔ لیکن احساس و تأثر کی میزان پہ ان قوتوں میں تفریق ہو سکتی ہے۔ ہر انسان کا دماغ مختلف نقوش رکھتا ہے اور انہی نقوش کے اختلاف سے نقطۂ نظر میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اسی سے خواہشات، جذبات و احساسات، کیفیات اور تجربات بدلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص جذبہ، احساس اور ذہن رکھنے کے باوجود شاعر نہیں ہو سکتا۔ شاعر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کی وہبی قوتیں اپنے ماحول میں نشوونما پاتی ہیں اور وہ گرد و پیش کی زندگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یوں وہ ادراک و اکتساب سے بہت کچھ حاصل کرتا ہے۔ شاعرانہ صلاحیت فطری و وہبی ہے۔ جذبات و کیفیات سے خالی کوئی شعر ہو ہی نہیں سکتا۔ بقول نیاز شاعری اُلفت کی زبان ہے۔ اور اُلفت و محبت بھرے حساس دل ہی اس کی گہرائیوں اور سوز کو محسوس کر سکتے ہیں۔ شاعری حقیقت نہیں بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے۔ صداقت نہیں بلکہ صداقت کی تعبیر ہے۔ خود کوئی کیفیت نہیں بلکہ کیفیت کا ایک بیان ہے۔ ہر لمحہ گردش میں رہنے والی زندگی اور ہر لمحہ تخلیق کرنے والی فطرت جب صحیح معنوں میں ہم معنی و ہم آہنگ ہوتی ہیں تو فن کار جنم لیتا ہے۔ ذہن و اکتساب، فطرت اور ماحول، شعور اور لاشعور کی یہی موافقت یا مخالفت فن کار کی ناکامی و کامیابی کا باعث بنتی ہے۔ نیاز کے مطابق:۔

"شاعر کے کلام پر گفتگو کرنے سے قبل یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ فطرت کی طرف سے شاعر بنا کر بھیجا گیا ہے یا وہ اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے میں فطرت سے جنگ کرتا ہے۔ اِس کا فیصلہ کرنے کے بعد میں یہ دیکھتا ہوں کہ قدرت نے اِس کے دماغ کو کس نوع کی شاعری کے لئے وضع کیا تھا اور ماحول نے کس حد تک اس کی فطری اُفتاد کی

موافقت یا مخالفت کی۔ اور آخر کار نتیجہ کے لحاظ سے وہ کامیاب ہُوا یا ناکام۔"[1]

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نیاز کا یہ ذہنی و نفسیاتی انداز خاصی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ شاعر کو اُس کی ذات کے انفرادی اور ماحول کے اجتماعی حوالوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ اُس کی فطری صلاحیتوں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں، اور اکتساب و ادراک کو بھی نظر انداز نہیں کرتے نتیجہ میں جو کامیابی یا ناکامی ہوگی وہی شاعر کا درجہ متعین کرتی ہے۔ شاعری کا ملکہ فطری سہی مگر اس میں حقیقی کامیابی حاصل کرنے کے لئے خاص تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تنقید میں بھی یہ دونوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ یعنی وہ کسبی بھی ہے اور وہبی بھی ہر نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوت تخلیق کا بھی مالک ہو۔ اسی طرح فن کار کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ تنقیدی صلاحیت رکھتا ہو کیونکہ بغیر اس کے کوئی قابلِ ذکر فن کارانہ تخلیق ممکن نہیں۔ ہر فن کار خود آگاہ و خودشناس ہوتا ہے۔ اُس کے فن کارانہ تجربے میں اُس کا شعور نمایاں طور پر نظر آتا ہے اسی طرح ہر ناقد تخلیق کی فطری صلاحیت سے نئے جہانِ معنی تلاش کر لیتا ہے۔ نیاز کا ایمان ہے کہ ادب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جذباتِ انسانی کو حرکت میں لائے۔ یہ "جذباتی قیمت" دوسرے انسانوں کے جذبات کو بھی اُبھارتی ہے۔ وہ اس قول کو دل سے تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی نظم نہ اخلاقی ہوتی ہے نہ غیر اخلاقی بلکہ وہ صرف آرٹ کا نمونہ ہوتی ہے۔ ادب رُوح کی ایک زبردست آواز ہے۔ جو گرد و پیش کے ماحول و زندگی کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر وہ صرف ہمارے احساس میں تحریک ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ معلومات اور اطلاعات میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ احساس و ادراک کی جن منازل سے ہم ناآشنا ہیں، اُن سے آشنا کرتا ہے۔ اور جن چیزوں سے متعلق عرفان و آگہی کی منزلیں طے کر چکے ہیں

---

[1] "طرز کی شاعری" انتقادیات حصہ اوّل ص ۴۰، مکتبہ معین الادب لاہور

اُن میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ یہ جمالیاتی، اخلاقی، رُوحانی، جذباتی و تصوّری منزل اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک انسان بیک وقت زبردست فلاسفر، بے مثل آرٹسٹ اور رُوحانی قسم کا لطیف اخلاق نہ رکھتا ہو۔ گویا ایک شاعرِ فطرت کے پیغام کے ساتھ اپنے ذہن و دل میں بستی، ہر لحظہ متحرک دُنیا کا بھی کوئی نہ کوئی پیغام ضرور رکھتا ہے۔ خواہ وہ ضروری یا غیر ضروری۔ جیسا کہ خود نیازؔ کہتے ہیں:۔

"ہر فطری شاعر کسی نہ کسی فطری پیغام کا حامل ہُوا کرتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ پیغام دُنیا کے لیے مفید و ضروری بھی ہو۔ نظامِ فطرت میں اہرمن و یزداں دونوں دوش بدوش کام کر رہے ہیں۔ اِس لئے یہ ضروری نہیں کہ جو شاعر خیامؔ و حافظؔ کی طرح ساری دُنیا کو مستِ مئے ہوش رُبا دیکھنا چاہتا ہے اس کے پیام کو ہم غیر فطری پیام سمجھیں۔ بہرحال ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی موضوعِ سخن ایسا ضرور ہوتا ہے جس سے اُس کی دل کی باتوں کا پتا چلتا ہے۔" ۱؎

نیازؔ نے اِس "فطری پیغام" اور "دل کی باتوں" کے کھوج اور گہرائیوں میں اُتر جانے کی زیادہ کوشش نہیں کی۔ کیونکہ اُن کا تعلق اُس مکتبۂ فکر یا دبستانِ تنقید سے ہے جسے ہم رُومانی، جمالیاتی یا تأثراتی تنقید کہتے ہیں۔ جو عقلیت، مقصدیت و افادیت کی نفی کرتی ہے۔ اِس دبستان کی خصوصیت یہ ہے کہ نقّاد صرف اُن تأثرات کا اظہار کرتا ہے جو کسی تخلیقی تجربے سے اُس کے دل و دماغ پر ثبت ہوتے ہیں۔ وہ صرف اُن نقوش اور لکیروں ہی کی پیشکش کو اپنی معراج و منزل سمجھتا ہے جو کسی فن پارے نے اُس کے دل و دماغ پر مرتب کئے۔ سُرور و انبساط کی وہ لہریں، جو تخلیق سے اُس کے ذہن میں پیدا ہوئیں وہ صرف اُن کی تصویر کشی کو اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ وہ ادب کا مقصد تفریحِ طبع اور لذت اندوزی سمجھتا ہے۔ یُوں اُس کے نزدیک ادب محض تأثرات EXPRESSION

۱؎: سیّد میر سوز۔ "انتقادیات" حصّہ اوّل ص ۱۴۴، مکتبہ معین الادب لاہور

یا اظہار کا نام ہے۔ چاہے اُس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ وہ اپنی پسند و ناپسند کا کوئی عقلی یا منطقی جواز پیش نہیں کر سکتا۔ اُس کی پسند جذباتی و احساساتی ہے۔ اُس کا رویّہ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر مجھ سے پوچھو تو میں کچھ نہیں جانتا اور اگر نہ پوچھو تو سب کچھ جانتا ہوں۔ نیازؔ کے مطابق:۔

"میں شاعری میں کیا چاہتا ہوں، اس کا جواب مشکل ہے اور اسے اگر شاعری نہ سمجھا جائے تو کہوں گا کہ میں اس میں وہ کچھ چاہتا ہوں، جسے میں بتا نہیں سکتا۔" ۱؎

نیازؔ کے ہاں یہ تأثراتی انداز ہمیں جا بجا ملتا ہے۔ حُسن کاری، حُسن آفرینی اور مسرّت و جمالیات تأثراتی تنقید کا خاصا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ شاعری کا تعلق وجدان سے ہے۔ اِس لئے یہ براہِ راست وجدان پر اثر انداز ہوتی ہے اور انسانوں کے لُطف کا باعث ہے۔ اگر حُسن، جمال، مسرّت و وجدان کی وضاحت کو کہا جائے تو شاید نہ کر پائے۔ نیازؔ نے اِس انداز سے اکثر کام لیا ہے۔ وہ رُومانیت کے بہت بڑے علمبردار ہیں، چنانچہ اُن کی تنقید پر باوجود اُن کے مفکّرانہ و عالمانہ انداز سے جذبات و تأثرات ہی غالب نظر آتے ہیں۔ جہاں اُنہوں نے شعر و شاعری سے قوموں کی تاریخ و تقدیر کو وابستہ کیا ہے۔ زندگی کے اسرار و رموز کا زبردست پیغام کہا ہے وہاں شعر کی تعریف اُنہوں نے یوں بھی کی ہے:۔

"ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں اور اُس کے رنگ و بُو سے متاثر ہو کر اُس کی تعریف کرتے ہیں، یہ بھی شعر ہے ہم شفق کی رنگینی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں، یہ بھی شعر ہے۔ ہم قوسِ قزح کو دیکھتے ہیں اور بے اختیارانہ کلماتِ تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں، یہ بھی شعر ہے۔" ۲؎

یہ رویّہ عقل و منطق کی دُنیا سے دُور ہی، حقیقت و صداقت سے بعید فاصلے پہ ہی مگر اس سے مُنکر ہونا بھی مشکل ہی ہے۔ کیونکہ اِس کا تعلق جمال و جذبات سے ہے اور شاعری جمالیاتی و جذباتی

۱؎: "فراق گورکھپوری" "انتقادیات" حصّہ اوّل ص ۳۲۷، ۲۸ مکتبہ معین الادب لاہور

۲؎: غزل گوئی اور ترقی زبان پر عہد بہ عہد تبصرہ" "نگار" "اُردو شاعری نمبر" جنوری ۱۹۳۵ جلد ۲۷ شمارہ ۱ ص ۱۵۳۔ "انتقادیات" حصّہ دوم ص ۱۶۲، نگار بک ایجنسی لکھنؤ۔

طور پر یقیناً مسرت بخشنے کا نام ہے۔ اس طرح یہ تنقید ٹھوس، مادی جواز نہ ہونے کے باوجود ہنر ہے اور بعض اوقات ایسی باتیں منظرِ عام پہ آتی ہیں کہ "عقل محوِ تماشائے لبِ بام" ہم جہاں تخلیق کے حُسن سے محظوظ ہوتے ہیں وہاں تنقید اپنے جذبات و تاثرات سے گہرے نقوش ثبت کرتی ہے کیونکہ حُسن کا کوئی جواز نہیں۔ یہ مادہ و مجسمہ میں نہیں بلکہ دیکھنے والے کی آنکھوں کے گہرے ساگر میں ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ:-

"جذباتی و تاثراتی تنقید میں بحث کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ایسی تنقیدوں میں نقاد اُصول بندی بھی کرتا ہے تو اپنے تاثر کی حاکمیت کے زیرِ اثر۔ اور تاثر کا ہی فیصلہ قبول کرتا ہے۔ صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ نہ میں اپنی پسندیدگی پر آپ کو مجبور کر سکتا ہوں اور نہ آپ مجھ سے اپنی عدم دلچسپی کو بہ جبر تسلیم کرا سکتے ہیں[1]۔"

لیکن نیاز محض تاثراتی و جمالیاتی ہی نہیں اُنہوں نے اپنے انتقاد میں عقلی و منطقی اُصول بندی بھی کی ہے۔ تاثر کی حاکمیت کے ساتھ ساتھ حُسن کی حقیقت کو بھی سمجھا ہے۔ اور اس حقیقت کے پیدا کرنے والے عناصر کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ جہاں اُنہوں نے شاعری کو محبت، عشق، پھول، شفق اور قوسِ قزح کی بے پناہ و لازوال حُسن کہا ہے وہاں اُنہوں نے اس کے لئے "ترنم" کو بہت ضروری قرار دیا ہے اور یہ ترنم اُن کے مطابق مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان و بحور سے پیدا کیا جا سکتا ہے نیاز میں اظہارِ تاثرات کی غیر معمولی صلاحیت ہے وہ ایک کامیاب تاثراتی کی طرح اپنے طرزِ بیان، ندرتِ قلم اور حُسنِ اُسلوب سے سُرور و مسرت کی ایک لہر دوڑا دیتے ہیں۔ دل و ذہن سُرور انبساط کی لہروں پہ رقص کرنے لگتا ہے۔ اُن کی یہ جادوگری عجیب کیفیت پیدا کر دیتی ہے وہ تحریر کے نشے میں نہ تو خود بیخود و مدہوش ہوتے ہیں اور نہ ہی سب لوگ اس ارفعیت کی اداکی

---

[1]: نیاز کے انتقادی خیالات - نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۳ء نیاز نمبر حصہ اوّل ص ۲۱۴

کیفیت میں سرشار ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات تاثرات گہرے نہیں ہوتے مگر زورِ قلم اُن میں گہرائی اور جادو پیدا کر دیتا ہے۔ پروفیسر محمد عبدالقیوم حسرت نعمانی نیاز کی تنقید کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"وہ ہوشیار جمالیاتی ہیں۔ باریک بین نگاہیں اس حقیقت کو تاڑ جاتی ہیں کہ کبھی کبھی وہ خود تو تاثرات میں زیادہ گہرے نہیں ہوتے ہیں مگر اپنے زورِ قلم سے لوگوں کو بڑے تیز دھارے میں بہا دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں اردو کا والٹر پیٹر بلکہ تاثراتیوں کا خدا آسکر وائلڈ کہا جا سکتا ہے[1]۔"

نیاز آسکر وائلڈ کے اصولِ فطرت، ذوقِ سلیم اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے بہت متاثر ہیں۔ والٹر پیٹر کی طرح اُن کے ہاں تاثرات و اظہار کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ نیاز "فن برائے فن" اور "ادب برائے ادب" کے قائل نظر آتے ہیں وہ شاعری کو ماحول و اخلاقیات سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن زندگی سے بالکل الگ ادب کا جواز ہی نہیں۔ زندگی کسی نہ کسی طور پر اس میں اپنی تمام رعنائیوں سمیت موجود رہتی ہے۔ ادب کسی نہ کسی انداز میں زندگی کے سورج کے گرد گردش کرتا ہی رہتا ہے۔ ماحول و اخلاقیات اسی زندگی کا حصہ ہیں۔ ہمیں کسی بھی فنکارانہ تجربہ کی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ ساتھ اُس کے اثرات کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے۔

نیاز کی تحقیق ہے کہ ہر زبان کی شاعری کا آغاز بالکل اچانک ہُوا ہے۔ یعنی کسی خاص حادثہ، کسی خاص تاثر یا مسرت، غم کے تحت کوئی ایسا فقرہ زبان سے نکل گیا جو کسی لحن کے حدود میں آ سکتا تھا۔ یہ مجموعۂ الفاظ جمالیاتی حدود، یعنی ردیف، قافیہ، تشبیہہ، استعارہ، کنایہ اور دوسرے صنائع بدائع سے مل کر اچھی شاعری کی تخلیق کا باعث بنا۔ نیاز کا خیال ہے کہ شاعری خواہ کسی موضوع کو سامنے رکھ کر کی جائے دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جس میں کسی حال یا واقعہ کا اظہار

---

[1]: اُردو میں تنقید کا ارتقا "نگار" انتقاد نمبر فروری مارچ ۱۹۴۶ء حصہ دوم ص ۱۲۱

ہو، دوسری وہ جس میں کسی دعویٰ کا اظہار ہو۔ اوّل الذکر بہت آسان چیز ہے لیکن مؤخر الذکر نہایت مشکل ہے، کیونکہ دعوے کے ساتھ اِس کا ثبوت فراہم کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ شاعری مقصد کے لئے نہیں نہ ہی اِس میں سماجی و معاشرتی مسائل کی گنجائش ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد مسرت، لُطف اندوزی و انبساط ہی ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ شاعر کے دِل سے نکلنے والی باتیں سبق آموزی کا اہم پیغام بن جاتی ہیں۔

نیاز اچھی شاعری کے لئے صحیح و حقیقی جذبات و احساسات اور محبت کی نفسیات سے آگہی کو بہت ضروری قرار دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ سب سے بڑا شاعر وہی ہے جو سب سے زیادہ مذہب سے علیحدہ ہو۔ اُنہیں شاعری کا خون تصوّف کے ہاتھوں بالکل پسند نہیں۔ اُن کے مطابق تصوّف کی حدود وہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، اور یہ فضا عقل و شعور کی سرحد سے دُور ہے۔ وہ اِنسانی زندگی سے ماورا باتوں کو شاعری میں پسند نہیں کرتے۔ اور تصوّف بھی ماورائی اظہار ہے جسے شاعری سے متعلق کر دینا بقول نیاز ایسا ہی ہے

"میرے نزدیک شاعری کو تصوّف سے متعلق کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی خوبصورت عورت سے شادی کر لی جائے کہ اِس کے بعد حُسن و عشق دونوں کا صفایا ہے۔[۱۵]"

نیاز کے خیال میں شاعری صرف دِل کا معاملہ ہے۔ یہ تأثرات کی زبان ہے۔ جذبات و محسوسات کی سچی کہانی ہے۔ مناظرِ فطرت، تخیّل کی نزاکت و لطافت سب شعر کے جملہ اوصاف ہیں۔ شعر نثر کے مقابلے میں زیادہ قوت و حُسن رکھتا ہے۔ ادب میں برتر درجہ حاصل ہے تو صرف شاعری کو جیسا کہ:

"مناظرِ فطرت کا حُسن، تخیّل کی نزاکت، نغمات کی لطافت، سب شعر ہی کے

---

[۱۵]: فراق گورکھپوری "اِنتقادیات حصّہ اوّل ص ۲۳۲، مکتبہ معین الادب لاہور۔

واسطے ظہور میں آتے ہیں۔ نثر کا تعلق صرف تصوّر سے ہے لیکن شعر تصوّر و احساس دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ شاعر کا ذہن عالمِ احساس و عالمِ تصوّر دونوں کی سیر کرتا ہے اِس لئے وہ ہر شئے کا وصف اُسی وقت کرتا ہے جب اُس کے تمام ذاتی و عارضی خصوصیات پر احاطہ کر لے۔ وہ ہر چیز کے پوشیدہ اسرار ظاہر کرنے کا موجب ہے[۱۶]۔"

نیاز نے تصوّر و احساس کے حسین امتزاج کی وجہ سے شعر کو نثر کے مقابلے میں فوقیت دی ہے اور شاعر کو اسرار و رموز کے اظہار کا بڑا موجد قرار دیا ہے۔ وہ صدیوں کی فرسودہ اور کمزور روایات کو ڈھانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اِس طرح نیاز بُت تراش ہی نہیں بلکہ بُت شکن بھی ہیں۔ اور بعض اوقات بُت شکنی کے لئے اُنہیں بُت بھی خود تراشنا پڑتے ہیں۔ نیاز نے جرأتِ فکر و آزادیٔ رائے کو اپنا نصب العین جانا ہے۔ بارہا یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاعری میں کلاسیکل روایوں کے قائل ہیں۔ زندگی اثبات سے نفی اور نفی سے اثبات کے سفر کا نام ہے۔ چنانچہ جب پابندیاں کی قید حد سے بڑھ جاتی ہے کہ وہ ہر لمحہ سوچتے ذہن کی ہر لہر کو قید میں جکڑ لے تو نتیجہ آزادی چاہنے کے لئے ردِّعمل پیدا ہوتا ہے۔ یہی شدید ردِّعمل سخت قسم کے اوزان، بحور، عروض و قوافی کی مقیّد شاعری کے خلاف ہُوا تو آزاد شاعری نے جنم لیا۔ نیاز نے ابتداً اِس کو ناپسند کیا۔

"یہ آزاد شاعری کیا چیز ہے یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر خود آزاد شاعروں سے پوچھا جائے کہ اِن کی شاعری کے اُصول کیا ہیں تو غالباً وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکیں گے[۱۷]۔"

مگر بعد میں اِس نظریئے میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ نیاز نے کچھ نرم رویّہ اختیار کیا۔ وقت اور زمانے کے

---

[۱۶]: شعر ۔۔۔ عربوں کے نقطۂ نظر سے "سالنامہ نگار" اِنتقاد نمبر حصّہ اوّل جنوری ۱۹۳۰ء ص ۱۸۱

[۱۷]: "مالہٗ و ماعلیہ" ص ۲۰، بار اوّل ۱۹۴۸ء، نگار بُک ایجنسی لکھنؤ

بدلتے تقاضوں کے تحت اُنھوں نے آزاد شاعری کی اہمیت کو مانا اور سمجھا لیکن اس کے لیے جس صلاحیت اور پاکیزگیٔ ذوق کی ضرورت ہے اُس کی اشد ضرورت کی طرف خاص توجہ دلائی ہے۔

"میں آزاد شاعری کا مخالف نہیں ہوں۔ اس کا تجربہ ضرور کرنا چاہیے لیکن اس کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی صلاحیت اور حد درجہ پاکیزگیٔ ذوق کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وزن و ترنم، اور ردیف و قافیہ کی دلکشی تو اس میں باقی نہ رہے گی اور اس کمی کو صرف حُسنِ تخیّل اور اندازِ بیان کی نُدرت و لطافت ہی سے پورا کرنا ہوگا۔"[1]

نیازؔ کی طبیعت میں جدّت پسندی ہے۔ وہ بہت اچھے اختراعی و تخلیقی ذہن کے مالک ہیں۔ چنانچہ اُن کے ہر خیال اور ہر تحقیق میں ایک جدّت و نُدرت ہے۔ ادب و شعر، شاعری کے انداز و تیور، اُس کے حُسن و ناحُسن میں تنقیدی آرا سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نئی راہ پیش کرتے ہیں اور اس میں ہمیشہ اس قدر وزن رہتا ہے کہ باوجود شور ہنگامے کے وہ اپنی حیثیت و وقعت منوا لیتی ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے دوسروں کے افکار و تاثرات کو آنکھیں بند کر کے کبھی قبول نہیں کیا، بلکہ انتہائی غور و خوض، فکر، مشاہدہ و مطالعے کے بعد اپنے نظریات خود قائم کرنے کے بعد بڑے وثوق و اعتماد سے اُنھیں پیش کیا ہے۔ اُن کی تنقید کی سب سے بڑی خوبی دراصل اپنی رائے پر اعتبار و اعتماد ہی ہے۔ نیازؔ کو نہ صلے کی تمنا ہے نہ ستائش کی پرواہ۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں بڑی بے باکی اور بے خوفی سے لکھتے ہیں ——— بڑے بڑے شعرا بھی خارزک کی صداقت و سچائی سے نہیں بچ سکے۔ اپنے لئے لکھتے ہیں۔ ادب و شعر کی اصلاح کے لیے لکھتے ہیں اس لیے نہ کسی قاری کے منتظر ہیں نہ آرزو مند۔ مگر اس کے

[1] نیازؔ: آزاد شاعری "جدید شاعری نمبر" سالنامہ نگار ۱۹۶۵ء جولائی اگست ص ۲۰

باوجود اُن کے تنقیدی فیصلوں کو نظر انداز کرنا آسان نہیں۔

نیازؔ نے تنقید کی کوئی باقاعدہ تصنیف پیش نہیں کی۔ اُن کے بھرپور ناقدانہ فیصلے مختلف جگہوں پہ بکھرے نظر آتے ہیں۔ جن میں خاص اہمیت اُن مضامین کو حاصل ہے جو مختلف موضوعات پر وقتاً فوقتاً "نگار" میں چھپتے رہے ہیں۔ بعد میں "انتقادیات" کے نام سے دو حصّوں میں شائع ہوئے۔ نیازؔ کے ناقدین نے اُنہی کو سامنے رکھتے ہوئے اُن کے بارے میں فیصلہ دیا ہے۔ حالانکہ مکتوبات، تبصرے، مقدمات "باب الاستفسار"، "باب الانتقاد" اور "مطبوعات موصولہ" کے مستقل کالم جو "نگار" کی زینت بنتے رہے اُنہیں کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی زندگی میں نیازؔ نے ہزاروں کتابوں پہ بے لاگ تبصرے کئے ہیں جو مذہب، اخلاق، سائنس، فلسفہ، نفسیات، تاریخ، صحافت، خطاطی، سیاست، سوانح، سیرت، ادب، نظم و نثر، تنقید و تذکرہ، غرض کسی موضوع کو نہیں چھوڑا۔ مگر ہمارے ناقدین نیازؔ پہ تنقید کرتے ہوئے نہ جانے کیوں اُنہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ ڈاکٹر امیر عارفی جنہوں نے ۱۹۷۳ء میں "نیازؔ فتح پوری" پہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اُن کا مقالہ انجمن ترقی اُردو ہند کی جانب سے شائع بھی ہو چکا ہے[1]، اُنھوں نے بھی اس پہلو سے قدرے انحراف کیا ہے۔ اور زیادہ تر "انتقادیات" کے حوالے سے ہی نیازؔ کی ناقدانہ حیثیت کو متعین کیا ہے۔

نیازؔ نے نوعمر اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا لحاظ رکھا۔ معاصر اور ناموروں کی کمزوریوں کو بالکل نہیں بخشا۔ اُن کے چند سطری تبصرے بھی بعض شاعروں اور ادیبوں کے سلسلے میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ خالص ادبی و تنقیدی نقطۂ نظر سے اُن کی باتیں اتنی ہی سچی اور کام کی ہیں جتنی دوسرے ناقدین کی۔ ان کی تقریظوں اور مقدمات میں بھی جو مختلف کتابوں پر ہیں، ایک توازن و صحت مند رویہ ملتا ہے۔ اُن کی تنقید کے سلسلے میں "نگار" کے مختلف خاص نمبر بھی بے حد مسلّمہ اور توجہ طلب ہیں۔ جو بعض اوقات پورے کے پورے

[1] یہ مقالہ ۱۹۷۳ء میں انجمن ترقی اُردو دہلی کی جانب سے شائع ہوا۔

اُنہوں نے خود ترتیب دیئے ہیں۔ غالبؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، مصحفیؔ، مومنؔ اور مختلف اصنافِ ادب وشاعری وانتقاد کے سلسلے میں یقیناً ایک کامیاب کسوٹی ہیں۔ مختلف شعرا خاص طور پر غالبؔ واقبالؔ کے سلسلے میں اور مختلف اصناف کے بارے میں اُن کے تنقیدی فیصلے جس طرح سے بدلتے رہے ہیں اُس کا مطالعہ "نگار" کے اِن خاص نمبروں سے کیا جا سکتا ہے جو حیرت انگیز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ عربی، فارسی اور ہندی، شاعری کے متعلق اُن کی تنقیدی تخلیقات قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔ مگر افسوس نیازؔ کے زیادہ تر ناقدین نے صرف "اِنتقادیات" کے مضامین کو ہی پیشِ نظر رکھا ہے۔

نیازؔ صحیح معنوں میں نقّاد ہیں۔ اُن کی تحقیق وتنقید ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ وہ کسی بھی تصنیف پہ تنقید سے پہلے زبان، ادب اور مطلوبہ کتاب کے تمام تاریخی وتحقیقی پس منظر کو سامنے رکھتے ہیں۔ سارے موضوعات پر اُن کی معلومات قابلِ رشک ہیں اور اُنہی کی روشنی میں وہ تخلیقات کو جانچتے، پرکھتے اور فیصلہ کرتے ہیں، یہی اُن کی تنقید ہے اور یہی اُن کا فن۔

نیازؔ کے مطابق تخلیق کی طرح تنقید کا فن بھی وہبی وفطری ہے۔ اِس کا وجود ابتدائے آفرینش سے پایا جاتا ہے لیکن صدیوں کے متواتر انقلاب کے بعد اِس نے باقاعدہ علم کی صورت اختیار کی ہے۔ وہ تنقید کو آرٹ، فن اور حُسن سمجھتے ہیں۔ تنقید اُن کے خیال میں حقیقت ہے صداقت ہے، تجزیہ ہے، تشریح ہے، تحلیل ہے، ذوقِ سلیم ہے۔ اُن کا کہنا ہے فنِ نقد تمام علوم وفنون پر حاوی ہے۔ وجدان، جمالیات اور نفسیات جو تمام علوم میں کسی نہ کسی طور پر شامل سمجھے جاتے ہیں۔ فنِ نقد میں بھی کام کرتے ہیں اور یہ تنقید خاص طور پہ ادب وشعر کو جانچنے میں مستعمل ہے۔ بقول نیازؔ:-

"ادبیات اور خصوصیت کے ساتھ شاعری کے پرکھنے کے لئے مقررہ اُصول کے علاوہ اُس قوتِ فیصلہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے جس کا تعلق صرف ذوق ووجدان سے ہے۔ جو بڑی نازک چیز ہے اور اِسی لئے نقدِ شعر کو

میں اِنتقادِ عالیہ کہتا ہوں [۱۵]"

اِسی نقدِ شعر اور "اِنتقادِ عالیہ" کے لیے حد درجہ ذوق کی نفاست وپاکیزگی اور فکر واحساس کی غیر معمولی ذہانت ونزاکت کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِنتقاد کے اُصول وضوابط کی پیروی کرتے ہوئے بھی ہر شخص نقّاد نہیں بن سکتا۔ نیازؔ کا کہنا ہے کہ اِنتقاد ایک بے لاگ کوشش اور بے لوث تبصرہ ہے۔ ادبیات میں تین قوتیں سرگرمِ کار ہوتی ہیں۔ ایک قوتِ تصنیف دوسری لذّت اندوزی، اور تیسری قوتِ اِنتقاد۔ اِن تینوں قوتوں میں سے اوّل الذکر دو قوتوں کا وجود پہلے پایا جاتا ہے۔ اُس کے بعد قوتِ اِنتقاد اپنا کام کرتی ہے۔ جونہی ایک شخص کو اِس کا احساس ہوتا ہے کہ ایک سے زائد چیزوں میں سے کسی خاص چیز کو ترجیح دینا ہے، اِنتقاد شروع ہو جاتا ہے۔

نیازؔ نے فنِ نقد سے تین اغراض وابستہ کی ہیں۔

۱۔ تشریح ۲۔ حکم ۳۔ تعیّنِ مراتب

اِنہی کے توازن وتناسب سے ایک صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ تشریح سے مراد یہ ہے کہ نقّاد فن کار کی سوانحِ حیات پر نظر ڈالتا ہے۔ اُس کے وطن، جغرافیائی محلِ وقوع، ماحول، خاندان، قوم، کون لوگ اساتذہ تھے، کن سے تربیت پائی۔ دماغی، جسمانی صحت، زمانہ موافق تھا یا مخالف، معاشی حالات کیسے تھے، گویا وہ فن کار کی زندگی کا مشاہدہ ومطالعہ کرتا ہے، اور اُس کی روشنی میں اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کرتا ہے۔ حکم سے مراد یہ ہے کہ نقّاد اپنے ذاتی میلانات ورُجحانات اور انفرادی ذوق ورویوں سے ہٹ کر منصفانہ رائے دے۔ سچّا، صحیح اور حقیقی فیصلہ کرے۔ اِسی لئے نقّاد کے لئے نیازؔ نے "فوق الانسان" ہونا بھی ضروری قرار دیا ہے، کہ وہ اپنی پسند وناپسند کے دائرے سے نکل کر بے لاگ اور بے خوف عدالت کا جج ہو کر فیصلہ سُنائے۔ نقّاد

---

[۱۵]: انتقادی استقرار کی ایک مثال" نگار انتقاد نمبر جنوری ۱۹۴۶ء نمبر جنوری ۱۹۴۶ء حصہ اوّل ص ۱۱

ادبی عدالت کا منصف ہے اور اُس کا ایک غلط فیصلہ ادب وشاعری کی سمت ورفتار کو متاثر کر سکتا ہے۔ اُس کے فیصلے انصاف پسندانہ ہونا چاہئیں، وہ اگر ڈرامہ پسند کرتا ہے تو خواہ مخواہ ناول کی بُرائی نہ کرے۔ اُس کا دِل اگر نظم کی طرف مائل ہے تو غزل کو "نیم وحشی صنف" کہہ کے رَد نہ کرے۔ اُسے گر مراثی انیس اچھے معلوم ہوتے ہیں تو وہ غالب کے تغزل پہ اعتراض نہ کرے۔

تعیّن مراتب کی منزل نظری بھی ہے اور عملی بھی یہ سب سے زیادہ نزاکت واہمیت رکھتی ہے۔ ناقد کو تعیّن مراتب میں خاص توجہ کرنا ہوگی۔ ایک وقت میں مختلف فن کاروں کی تخلیقات کا نظری اور عملی اعتبار سے تجزیہ کر کے بتانا ہوگا کہ کون بڑا شاعر ہے اور کون کم تر یعنی اگر ہم آتش، مومن، غالب کے حالاتِ زندگی، شخصی ضروریات، اور مجموعی اسالیب بیان کر کے ذوقِ سلیم سے کام لیں تو ان میں سے ہر ایک کا درجہ متعیّن کرنا پڑے گا۔ یوں نیاز ناقد پہ اہم ترین ذمہ داری ڈالتے ہیں۔ اِسی لئے اُنہوں نے اِسے "مورّخ، مفکر، اور پیغمبر" کے نام سے یاد کیا ہے، کیونکہ ماضی، حال، مستقبل تینوں پہ اُس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ناقد کو اپنی ذاتی و انفرادی پسند و ناپسند اور ذاتی خواہش و تمنا سے ماوراء ہو کر، استدلالی انداز میں فیصلہ کرنا ہوگا۔ کوئی رائے پہلے سے قائم کرنا اور پھر اُس کے لیے جواز ڈھونڈنا سخت ترین عیب ہے۔ نیاز کا کہنا ہے کہ اگر ہم سچے، صالح اور حقیقی ادب کی تخلیق چاہتے ہیں تو ہمیں غیر صالح انتقاد ترک کر دینا چاہیئے۔ دُنیا میں ہر شخص تنقید کا اہل نہیں بلکہ یہ خصوصیت صرف اُن لوگوں کی ہے جو وسعتِ معلومات کے ساتھ قوتِ تمیز بھی رکھتے ہیں اور قدرت نے اُنہیں حُسن وقبح معلوم کرنے کا صحیح ذوق عطا کیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھا شاعر، اچھا نقاد بھی ہو۔ یا پھر ایک اچھا نقاد، اچھا شاعر بھی ہو۔ بعض اوقات قدرت دونوں صلاحیتوں سے نواز دیتی ہے مگر عام طور پہ ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ نیاز کا کہنا ہے:۔

"اگر ایک شخص اچھا شاعر ہے تو وہ "سخن گو" ہے لیکن دوسرا جو شاعر نہیں

مگر اچھا ذوقِ شعری رکھتا ہے وُہ "سخن فہم" ہے۔ پھر جس طرح ہر سُخن فہم کا سُخن گو ہونا ضروری نہیں اِس طرح ہر سُخن گو کا سُخن فہم ہونا بھی لازم نہیں"[۱]

نیاز کا یہ فیصلہ دُرست دکھائی دیتا ہے اِس سلسلے میں اُنہوں نے میر کی مثال پیش کی ہے کہ وہ "خدائے تغزل" جب خود اپنے اشعار کا انتخاب کرتا ہے تو وہ اشعار جن کی دُنیا میر کے نشتر سمجھتی ہے وہ خود میر کے نزدیک پھانس چُبھونے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔

نیاز کی رائے میں ادبیات میں سب سے بلند تر چیز تخلیقی ادب ہے، جو زندگی کی تشریح کا نام ہے۔ نقاد پہ لازم ہے کہ وہ ادبیات کی اُن تمام صورتوں پہ غور کرے جن سے زندگی کی تشریح کی جاتی ہے۔ اِس طور سے جو نتیجہ ہو وہی نقاد کا فیصلہ کہلائے گا اُسے تنہا جینے، تنہا لکھنے اور تنہا سوچنے کا جذبہ محو کرنا ہوگا۔ اُسے وہ راستہ اختیار کرنا ہوگا جو انفرادیت کی طرف نہیں بلکہ اجتماعیت کی طرف لے جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں اُسے حد درجہ غیر جانبدار اور حق گو ہونا چاہیئے۔ نقاد کی سب سے بڑی خوبی بقول نیاز غیر جانبداری ہی ہے لیکن ہر بڑے مفکر وفلسفی کی طرح وہ خود اپنے نظریات پہ پورے طور پر عمل نہ کر سکے غیر جانبداری کو سچی تنقید سمجھنے کے باوجود وہ اکثر خود غیر جانبدارانہ رہ سکے۔ کرنل غلام سرور کے مطابق:۔

"نیاز نے نقاد کی ایک خصوصیت غیر جانبداری بتائی ہے مگر جب ہم اُن کی اپنی تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اُن کی اپنی تنقید غیر جانبدارانہ نہیں ہے۔ اُن کے ہاں ایک چونکا دینے والا انداز ہے جو اُن کی انتقادیات میں بھی ملتا ہے۔ وہ دنیائے فکر میں کسی ایسے انکشاف کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو تقریباً نیا ہو۔"[۲]

---

[۱]: ادبیات اور اصولِ نقد" اصنافِ ادب نمبر نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۶ء ص ۱۵ "انتقادیات" حصّہ دوم ص ۲۸۶، بار اوّل ۱۹۴۴ء، نگار بک ایجنسی لکھنو

[۲]: "نیاز فتح پوری کے تنقیدی نظریات" نگار پاکستان مئی ۱۹۸۴ء ص ۷۰

یہ انداز اُن کی عملی تنقیدوں میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ اُن کے فیصلے نئے اور چونکا دینے والے ضرور ہیں جن میں ایک خاص قسم کی چمک نظر آتی ہے جو بصیرت و آگہی سے پیدا ہوتی ہے لیکن ہر جگہ وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکے۔

نیازؔ کی خوبی یہ ہے کہ وقت اور بدلتے ماحول کے تقاضوں کو ضرور پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اُن کا استدلال ہے کہ شاعر سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ کوئی پیغام دُنیا کو پہنچائے، بالکل جدید چیز ہے خاص کر اس صدی میں جب کہ "ریاضی" ہر چیز کی حدود متعین کرنا چاہتی ہے۔ شاعر کو دیوانہ سمجھا جاتا رہا مگر اب یہی دیوانگی لوگوں میں فرزانگی پیدا کر رہی ہے اور اب دُنیا وہی کہنے لگی ہے جو شاعر کہتا تھا۔"[۱]

نیازؔ قدیم شاعر کو بے پناہ خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اُس نے موضوع اور اُسلوب سے نئی راہیں متعین کرتے ہوئے بے پناہ کام کیا ہے۔ وہ اُس کی محنت و کاوش کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اسی محنت و کاوش کی روشنی میں نیازؔ نے بعض اصنافِ ادب کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن کا صحیح فنی دائرہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

نیازؔ کی تنقیدوں کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے مختلف اصناف کا محاکمہ کرتے ہوئے اُنہیں خاص نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ فنی اعتبار سے اُن کے اُصول و قوانین کا تعین کیا ہے۔ اس سلسلے میں "غزل" اُن کا پسندیدہ ترین موضوع رہی ہے۔ وہ غزل کو تمام اصناف میں بلند و برتر سمجھتے ہیں:۔

"میرے نزدیک شاعری کی تمام اصناف میں غزل گوئی جس قدر بلند چیز ہے اور کوئی نہیں۔ رُوح کی گہرائیوں اور قلب کے اعماق سے خبردار کرنے والی چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف غزل ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غزل کا

۱؎: مکتوباتِ نیازؔ، مارچ نگار ۱۹۳۲ء، جلد ۲۱، شمارہ ۳، ص ۵۹

ارتقاء تصوف سے ہے۔[۱]

یہاں تصوف سے اُن کی مراد روایاتی و تقلیدی تصوف نہیں بلکہ جذبے کا وہ حد درجہ حصول کا انتہائی پہنچا ہوا مقام ہے، کہ شاعر اس حصول سے غافل نہیں ہوتا اور تیاری زیر و بم میں بھی اس نغمۂ سرمدی کو سُنتا رہتا ہے۔ جو ہر ساعت، ہر لحظہ، ہر دم اُس کو اپنے قلب میں خود رکھتا ہے۔ گویا نیازؔ مجاز کے حوالے سے حقیقت کو دیکھنے اور اُس تک پہنچنے کے قائل ہیں۔ وہ احساس و محسوسات کی دُنیا سے ہوتے ہوئے عقیدت و پرستش، ایثار و سپردگی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ غزل اُن کے خیال میں حکایاتِ محبت اور جذباتِ عشق کی صحیح ترجمانی کا نام ہے۔ سادگیٔ بیان، بے ساختگی اور ہر وہ کیفیت جو مطالعۂ حُسن سے پیدا ہوتی ہے نیازؔ کے نزدیک غزل ہے۔ وہ غزل میں روایاتی تصوف، زندگی کا اصلاحی و مقصدی رویّہ، منفعت و افادیت کو پسند نہیں کرتے کہ اس سے غزل کا حُسن مجروح ہوتا ہے۔ جذباتِ عشق و محبت کی عکاسی و ترجمانی ہی نیازؔ کے خیال میں بہترین تغزل ہے:۔

"تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف جذباتِ محبت سے ہے جو اس گوشت پوست کی دُنیا میں گوشت پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔"[۲]

گر وہ وقت، ماحول اور عصری تقاضوں کے تحت غزل میں اصلاحی و فلاحی پہلوؤں کو داخل کر دینے کی نفی نہیں کرتے۔ غزل اُن کے خیال میں متفرق نقوش کا مرقع ہے، جنہیں نقاش نے مختلف اوقات میں مختلف کیفیات کے ساتھ کاغذ پر پیش کیا ہے۔ اسی لئے اُن کے نزدیک نظم کی

۱؎: مذاکراتِ نیازؔ یا مقالات، ص ۱۳۲۔ بار دوم ۱۹۴۲ء، یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ
۲؎: غزل گوئی اور ترقی زبان پر عہد بہ عہد تبصرہ "نگار" اُردو شاعری نمبر جنوری ۱۹۳۵ء، جلد ۲۷، شمارہ ۱، ص ۱۵۲، انتقادیات حصہ دوم ص ۶۲، ۶۳، نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نسبت غزل، کہنا زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ غزل میں افکارِ پریشاں کے لئے کافی گنجائش ہے لیکن نظم ایک ایسی تصویر ہے جس میں مصوّر اُس کے پس منظر کی فضا، اُس کے خطوط، سایوں کا اُتار چڑھاؤ اور اُس کے رنگوں کے امتزاج سے صرف ایک ہی کیفیت پیش کرنا چاہتا ہے۔ نظم میں ایک لفظ بھی بے محل استعمال ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے ساز کے کسی تار کا اُتر جانا یا مضراب کا بے سُرا ہو جانا۔ غزل میں آزادی ہے تو نظم میں قید اور نقاد کو بھی اسی انداز میں محتاط ہونا پڑتا ہے۔

"شاعر غزل میں جس قدر آزاد ہے اُسی قدر نظم میں پابند ہے۔ اور ایک نقاد اگر غزل کے ایک ایک شعر پر علیحدہ علیحدہ نقد کرنے کے لئے مجبور ہے تو نظم میں اُس کو شروع سے لے کر آخر تک ایک ایک شعر کو مسلسل و مربوط کر کے دیکھنا پڑتا ہے کہ کہاں کیا نقص ہے۔ اور کون لفظ بے محل استعمال کیا گیا ہے[15]۔"

یہ بات درست صحیح مگر اب نظم کی طرح مسلسل غزلیں بھی لکھی جا رہی ہیں چنانچہ نیاز کی رائے کے پیشِ نظر وہ آزادی جو غزل کے سلسلے میں نقاد کو حاصل تھی اب سلب ہو چکی ہے۔

"غزل" اور "نظم" کے علاوہ اُنہوں نے افسانہ اور اُس کے فن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جس سے نہ صرف افسانہ کے فن کو سمجھنے میں آسانی رہتی ہے بلکہ اُن کے افکار کی روشنی میں اچھے افسانے بھی تخلیق کئے جا سکتے ہیں۔ نیاز خود ایک بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے اختراعی، تخلیقی اور رومانی ذہن نے اُردو کے شاہکار افسانے تخلیق کئے ہیں۔ اُن کی طبیعت و ذہن کو اس فن سے فطری و دلی مناسبت تھی۔ افسانہ کی واقعیت، "کردار" یا "سیرت" کی فنی حیثیت متعین کرتے ہوئے مزید یوں رقمطراز ہیں:۔

---

[15] "جوش کی بعض نظمیں" انتقادیات حصہ اوّل ص ۲۰۸، مکتبہ معین الادب لاہور

"کسی ایک مسئلہ پر مکالمہ میں صفحات کے صفحات رنگین کر دینا خلاق ذہنی افسانہ نگار کی بات ہے۔ یہ درست ہے کہ تمہارے فسانے ذہنی ہوتے ہیں جن میں خود تنقیدی کا عنصر غالب ہو لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک خاندان کی تباہی دکھانے پر آئے تو باپ کو بیٹے میں مبتلا کر دیا ماں کو بچھو سے ہلاک کرا دیا باپ کو سانپ سے ڈسوا دیا اور بہن کو کنوئیں میں دھکیل کر ختم کر دیا ——[16]"

نیاز کی ناقدانہ نظر بہت گہری ہے چنانچہ مختلف اصناف سے متعلق اُن کے فیصلے آج بھی درست تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مکتوبات کے علاوہ "باب الاستفسار"، "باب الانتقاد"، "مطبوعات موصولہ" اور "نگار" کے خاص نمبر بھی نیاز کی تنقیدوں کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں مگر افسوس اُن کی طرف توجہ ہی نہیں کی گئی۔

نیاز کی تنقید مشرق و مغرب کا حسین امتزاج ہے۔ چنانچہ یہی وہ مرکز ہے جہاں استخراجی و استقرائی دونوں نقطہ ہائے نظر کے دھارے آ کر ملتے ہیں۔ یعنی اُن کے تجزیے کا خارجی عمل بھی نظر آتا ہے اور وہ تخلیق کے باطن سے اُبھرنے والی اُس روشنی کو بھی نظر انداز نہیں کرتے جس کی کرنیں فن کار کے ذہن و تخیل سے پھوٹتی ہیں۔ لیکن نیاز نے مشرقی مزاج کے اظہار میں فخر محسوس کیا ہے۔ بغاوت کی بجائے اجتہاد کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اُن کے ہاں جو توازن استقامت اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے وہ اسی مشرقی اندازِ ہی کی وجہ سے ہے۔ وہ اپنے مشرقی ماحول میں ایک خاص قسم کا کلاسیکل رویہ دیکھنے کے قائل ہیں۔ وہ گرد و پیش کی فضا کو ذہنی لحاظ سے تندرست، توانا، پُرنور اور علم کی روشنی سے منور دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ "باب الاستفسار" میں اُنہوں نے عورتوں کی غزل گوئی کی مخالفت کی ہے، کہ یہ اُن کے لئے مفید چیز نہیں۔ ایسے

---

[16] "مکتوباتِ نیاز" حصہ اوّل ص ۱۱، نگار بک ایجنسی لکھنؤ

رسائل جو اُن کے کلام کو شائع کر رہے ہیں، معاشرے کے بدترین مجرم ہیں عورت کا نصب العین بقول نیاز اِصلاحِ معاشرت اور بچّوں کی تربیت ہونا چاہیئے۔[1]

ان معاشرتی و اِصلاحی پہلوؤں کے تجزیّہ کے ساتھ "باب الاستفسار" میں ادبی و تنقیدی مباحث بھی ملتے ہیں۔ نیاز نے اپنے قارئین کے سوال و جواب کے اہم ترین سلسلے میں بہت کام کی باتیں بیان کی ہیں۔ چنانچہ زبان و لسّانیات، شاعری و نثر، ان پہ تاریخی تبصرہ جیسی اہم معلومات ہمیں یہاں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ اِس کے علاوہ مختلف شعراء پر تقابلی تنقید کا اندازہ بھی ملتا ہے۔ اِس باب میں غالب و مومن، اور غالب و اقبال کے بارے میں اُن کے نظریات نہایت اہم ہیں۔ جناب محمد قطب الدین ایم۔ ایس۔ سی عثمانیہ کے غالب و اقبال کے موازنہ سے متعلق طویل سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"غالب صرف شاعر تھا اور اقبال شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی، غالب وہ سب کچھ تھا جو ایک شاعر کو ہونا چاہیئے اِس لئے کامیاب تھا۔ اقبال چونکہ فلسفی شاعر تھے اور جو فلسفہ یا پیام اُنہوں نے پیش کیا وہ "فاسزم" تھا۔ اِس لئے کچھ نہ کہیئے ـــــ اقبال کے ملکہ شاعرانہ کا مَیں بڑا مدّاح ہوں۔ لیکن اُن کے پیام و فلسفہ کا سخت مخالف اُس نے اپنی ساری عمر ایسا تنگ نظر درس دینے میں صَرف کر دی جس کا عُنوان "شمشیر ہے اور انجام مسولینی"[2]"

لیکن جس طرح غالب کے سلسلے میں اُن کے نقطۂ نظر میں تبدیلی ہوئی۔ اِسی طرح اقبال سے متعلق اُن کی رائے پہلے سے مختلف دِکھائی دیتی ہے۔ اِس کی مثال "نگار" کا اقبال نمبر ہے، جو

---

[1]: "باب الاستفسار" نگار نومبر ۱۹۲۲ء، ص ۲۹۲

[2]: "باب الاستفسار" نگار اگست ۱۹۳۹ء، جلد ۳۶ شمارہ ۲، ص ۶۷

نیاز کا اپنا تحریر کردہ ہے۔ نیاز کے نظریہ سے اِتفاق ہو یا اختلاف اِس بحث سے قطعِ نظر، ہم "باب الاستفسار" کی ناقدانہ حیثیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جہاں حتمی فیصلے تأثرات کے سَنگ سَنگ تنقیدی سفر طے کرتے، قارئین کے ذوق کو نکھارتے ہیں۔

نیاز کی دُنیا تأثرات کی دُنیا ہے۔ زندگی حادثوں کے حسین سفر کی تأثراتی کہانی ہی تو ہے چنانچہ نیاز نے تأثرات کو بہت اہمیت دی ہے۔ اِس سلسلے کی اہم ترین کڑی، ان کا مستقل کالم "مطبوعات موصولہ" جس میں نئی مطبوعات پہ تبصرہ کیا جاتا مگر اِس میں بھی اُنہوں نے فنّی اور ناقدانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ایک نئی روشن راہ نکالی۔ وہ نہ تو بے جا تعریف کے قائل تھے نہ بے جا تنقید کے۔ جیسا جس تصنیف کو پایا، اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے ہزاروں کتابوں پہ تبصرے کیے۔ ان میں خیالستان، خطوطِ سرسیّد، بانگِ درا، شعر الہند، سیرت النبیؐ، تاریخِ ادبِ اُردو، مضامینِ پطرس، خطوطِ شبلی، تاریخِ مرثیہ گوئی، ہندوستانی لسّانیات، کمن کی اور دوسرے افسانے، نکرونشاط، اُردو شاعری پر ایک نظر، فنِ شاعری، "تنقیدی اشارے" کے علاوہ بے شمار عظیم فنکاروں کی عظیم تخلیقات شامل ہیں۔ یہ تبصرے ہر قسم کے موضوعات پر ہیں۔ ادب ہو یا سائنس، فلسفہ ہو یا نفسیات، شاعری ہو یا تنقید۔ نیاز کا قلم بڑی روانی سے بڑی خوب صورت و بصیرت آمیز باتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ ساتھ ہی فنّی نکتے بھی واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً "خطوطِ شبلی" پہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ایک شخص جب خط لکھتا ہے تو یہ خیال اُس کے سامنے نہیں ہوتا کہ کبھی یہ شائع بھی ہوں گے۔ اِس لئے اِس میں وہ بہت سی ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس سے اُس کی زندگی اور اُس کے جذبات پر نہایت صحیح روشنی پڑتی ہے۔ اور یقیناً اِس مجموعہ میں بعض خطوط مولانا شبلی کے بھی ایسے ہیں جن سے اُن کے ذوقِ رنگین کا پورا پتا چلتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اِس حال میں لکھے گئے ہیں کہ مولانا شبلی اِس واقعہ سے خالی الذہن

تھے کہ کبھی یہ شائع ہوں گے ۔[۵۰]"

خطوط کے سلسلے میں یہ بات نہایت اہم رہی ہے جسے کسی طور پہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔

نیاز کی تنقیدوں کا اہم ترین حصّہ اُن کی عملی تنقیدیں ہیں۔ کیونکہ اس کی طرف اُنہوں نے باقاعدہ اور باضابطہ طور پر توجہ کی ہے۔ تنقید کا یہ عمل جس پہ آج کے بیشتر نقّاد متفق ہیں کہ بہت مشکل ہے کسی شاعر کی تخلیق کی رُوح تک پہنچنا، اُس کے شعری تجرّبے کا تجزّیہ کرنا اور اُس کی بازیافت کرتے ہوئے دوسروں تک پہنچانا، یقیناً ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ عملی تنقید کا وجود اُردو میں کسی نہ کسی صورت میں ہر زمانے میں ملتا ہے۔ پُرانے تذکروں میں اِس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ الفاظ کی صحت و عدم صحت پر گہری نظر سے گفتگو کرنا، ان میں جو نزاکتیں ہوں اُن کا سنجیدگی سے محاکمہ کرنا، آسان بات نہیں۔ اِس کے لئے زبان و لسّانیات سے مکمل آگاہی، الفاظ و اسالیب کا مزاج شناس ہونا بہت ضروری ہے۔ جن لوگوں نے زبان و بیان کے اِس اعتماد و بھرم کو قائم رکھا۔ اُن میں نیاز کا نام سرِفہرست نظر آتا ہے۔

نیاز تنقید کی صلاحیت فطرت کی طرف سے لے کر آئے تھے۔ فطرت کے ساتھ ساتھ اِکتسابی شرائط کو بھی پورا کرنا اُنہوں نے سیکھا۔ وہ ایک زمانہ میں شعرائے اُردو کی صف میں نمایاں مقام رکھتے تھے مگر جب اُنہوں نے شعراء کے کلام پہ تنقید کی طرف توجہ کی تو اُنہیں اِس بات کا احساس ہوا کہ ایک شاعر کا تنقید میں اپنے ہم عصروں کے ساتھ انصاف کرنا مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ سب سے پہلے خود اُنہوں نے شعرگوئی ترک کی۔ یہ بات یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ ہمعصر نقّاد عموماً اپنے ہم عصروں پہ لکھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں لیکن نیاز کا بے باک و بے خوف قلم ہر میدان میں کسی زور رعایت سے کام نہیں لیتا۔ اُنہوں نے شعر کے ظاہری پیکر کو نکھارنے اور اُسے داخلی رُوح سے متعلق کرنے پر توجہ کی اور اِس میں قدیم و عظیم کی رعایت بھی نہ رکھی

۵۰۔ "مطبوعات موصولہ" نگار جنوری ۱۹۲۶ء، ص۔ ۹

تو یہ خیال ہوگیا کہ نیاز نہ صرف جابر نقّاد ہیں بلکہ جلّاد بھی ہیں اور اُن کی تیغ تنقید پڑ بڑے سے بڑا شاعر گاجر مولی کی طرح کٹ جاتا ہے۔ ایک طبقے نے یہ بھی کہا کہ نیاز اپنی شاعری میں ناکامی کا انتقام جارحانہ تنقید سے لینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ نیاز تنقید کو لسّانیات کے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اِس بات پہ ایمان رکھتے ہیں کہ ادب تخلیق لفظوں کی محتاج ہے۔ اور لفظوں کا صحیح و حسین اِنتخاب ہی ادب کو ادب بناتا ہے۔ اُن کا یہ طریق کار خالص مشرقی ہے۔ وہ رُوح کی پاکیزگی کے ساتھ لباس کی طہارت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں بقول ڈاکٹر انور سدید:-

"نیاز کے اِس طریق کار میں مشرقی تہذیب کا عمل دخل زیادہ نظر آتا ہے۔ وہ رُوح کی طہارت کے ساتھ لباس کی آراستگی کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں اور ادب پارے میں تاثر کی عمدہ ترسیل کو لفظ کی صحیح نشست اور برموقعہ استعمال کا مرہونِ منت تصوّر کرتے ہیں۔ شاعر کی فکر جتنی بھی عظیم کیوں نہ ہو اگر اِس کے ابلاغ کے لئے لفظوں کا اِنتخاب غیر موزوں ہے تو سامع تک اپنا صحیح مفہوم پہنچانے سے قاصر رہے گا۔[۵۱]"

گویا نیاز الفاظ کا صحیح و حقیقی اِستعمال، صنعتوں، محاورہ، زبان اور روزمرّہ کی پابندی کو بہت ضروری قرار دیتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی عملی تنقید کی بُنیاد اِسی لسّانیات و لفظیات پہ رکھی، اور ان کے انحراف کو احتساب کی کسوٹی پہ پرکھا۔

نیاز کا خالص حوالہ لفظیاتی تنقید ہی ہے اور اِس سلسلے میں اُنہوں نے بڑے بڑے شعراء کی غلطیوں کو بھی نہیں بخشا۔ اُن کا یہ اُصول رہا ہے کہ وہ ناموں سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ اُس غلطی کو پکڑتے ہیں جو فنّی اور لسّانی اعتبار سے کمزوری کا باعث ہو۔ اِس میں عظیم و غیر عظیم

۵۱۔ نیاز فتح پوری کی تنقید پر ایک نظر"، نگار مئی ۱۹۸۳ء، شمارہ ۵ ص۔ ۱۰، ۱۱

شاعر کی تغزلیت نہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ محاسن کے ساتھ ساتھ خامیوں کا بھی فراخ دلی سے جائزہ لینا چاہیئے۔ اِس سے توازن رہے گا۔ مگر افسوس ہماری تنقید میں اِس کی کمی ہے۔ نیاز تحریری لفظوں کے ذریعے فن پارہ کی تشریح و تفسیر کرتے ہیں تاکہ تنقید فن پارہ کی توضیح اور [illegible] مذاق کا کام انجام دے سکے۔

نیاز نے تا تمام "ذ نار سا" شاعری پر سخت گرفت کی ہے۔ وہ کھردری بے ساختگی [illegible] کے قائل نہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ شاعر کو کلام پر بار بار نظر ڈالنی چاہیئے تاکہ خامیوں کی [illegible] وہ سہل انگاری کے سخت مخالف ہیں جس کے تحت شعرا لفظ و زبان پر پوری دسترس کے بغیر تخلیقات کو پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں جب تک لسانیات، زبان، الفاظ کے استعمال اور اُن کے تاریخی و تہذیبی پس منظر سے واقفیت نہ ہو، شاعری کے میدان میں قدم رکھنا غلطی ہے جس کا ازالہ ناممکن۔ کیونکہ ہر جسم رُوح اور لفظوں سے معنی و مفہوم کی طرف سفر کرتے ہیں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

واقع ہوئے [illegible] کا کام متعین کرنے کے ساتھ ساتھ [illegible] جوش، جگر [illegible]، ہماری [illegible] کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے [illegible] خوب صورت اور نادر تشبیہات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہاں بھی اُن کی توجہ کا مرکز [illegible] اور اُسلوب ہی ہے۔

"شاعری کی روح اُسلوب بیان ہے۔ اِس لحاظ سے [illegible] مالامال ہے۔ [illegible] کا شاعر معمولی سی بات کو اِس رنگ سے بیان کرتا ہے کہ اِس میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور [illegible] متاثر ہوتی ہے۔"

[illegible]

[illegible]

"غالب کی شاعری نہایت وسیع کائناتی شاعری تھی۔ جو دل و دماغ دونوں کے انتہائی متفکرانہ احساس سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ روایاتی نہیں بلکہ درایتی شاعر تھا۔ وہ مقلد نہیں مجتہد تھا۔ اور ایک ایسے نئے طرز شاعری کا خلاق تھا جس سے دُنیا بالکل واقف نہ تھی ـــــ غالب نے نئی زبان پیدا کی نیا لب و لہجہ اختراع کیا۔ نیا انداز بیان ایجاد کیا۔ اور جو کچھ کہا اس قدر اعتماد کے ساتھ کہا ایسی بلند آہنگی سے کہا گویا وہ ایک لڑکا تھا ایک تیز روشن شہاب ثاقب تھا جس کے سُننے اور دیکھنے پر دُنیا مجبور ہو گئی تھی۔"[1]

غالب کی شاعرانہ عظمت اور اُسلوب بیان کی جدت و نُدرت کے لئے یقیناً یہ ایک بہت بڑا خراج تحسین ہے۔ اسی طرح نیاز نے مومن، حسرت، نظیر اکبر آبادی، اقبال پر مستقل نمبر اور بہادر شاہ ظفر، نظم رامپوری، ریاض خیر آبادی، مصطفےٰ خان شیفتہ، داغ اور میر سوز پر مضامین لکھ کر ان شعراء کی دریافت نو کا فریضہ انجام دیا اور ان کے بارے میں نئی تنقیدی آرا پیش کر کے ان کی نئی تعین مرتب کی۔

حسرت شاید وہ واحد شاعر ہے جس کے نیاز دل سے قدردان ہیں اور زندگی بھر کوئی منفی بات حسرت کے لئے اُن کے قلم سے نہ نکل سکی۔ وہ حسرت کے سچے و صادق لب و لہجے سے جو مبالغہ اور تصنع سے بالکل پاک ہے، بہت متاثر ہیں۔ سہل ممتنع اور سادہ نگاری اُن کا وصف خاص ہے۔ حسرت کی شاعری نیاز کے مطابق، انسانی جذبات کی شاعری ہے جس میں نہ "جنون زندگی" ہے اور نہ وہ "ماورائی" ہے۔ اس میں تفاول و جمالیات کا پہلو ہے۔ مشرقی ماحول، شائستہ طبقہ اور خاص کلچر کی حامل ہے۔ جنسی جذبات ہیں لیکن ہوس ناکی سے معرّا۔ حسرت کی باتیں دل سے نکلتی ہیں اور دل میں اُتر جاتی ہیں نیاز کے مطابق:۔

[1]: "نگار" غالب نمبر سالنامہ ۱۹۶۱ء شمارہ ۱ ص ۵

"حسرت کی شاعری میں نہ فلسفہ طرازی ہے نہ معنی آفرینی نہ بلند خیالی ہے نہ جدت بیان۔ وہ آسمان کے تارے توڑ لانے کی فکر نہیں کرتے بلکہ وہی باتیں کہتے ہیں جو عام طور پر سب کے دل پر گزرتی ہیں لیکن کہتے اس انداز سے ہیں کہ دل میں اُتر جاتی ہیں۔"[2]

نیاز کی تنقیدی آرا اتنی تُلی، اتنی متوازن، تحقیقی و پختہ ہیں کہ سند کی حیثیت رکھتی ہیں اور بمشکل ہی ان سے اختلاف ہو سکتا ہے۔

اقبال کو انہوں نے غیر فانی نقش قرار دیا ہے جسے تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ نیاز نے اقبال کو وہ پہلا شاعر قرار دیا ہے، جس نے شعر کی دُنیا میں عمل کی رُوح پیدا کی اور خود اعتمادی کا درس دیا۔ شاعر کے دورِ خمار اور دورِ خمار شکنی کے بعد اقبال نے زندگی کے عقلی پہلو اور فلسفہ طرازی کی طرف توجہ کی۔ قُدرت نے اُنہیں متفکرانہ دماغ عطا کیا تھا انہوں نے عملی حیثیت سے جنگ و سیاست میں حصہ لے کر صحیح سیاسی احساس پیدا کرتے ہوئے فرنگی استعماریت کے خلاف جذبۂ احتجاج کی نشوونما میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن اس منزل تک بتدریج ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد پہنچے۔ بقول نیاز:۔

"کلام اقبال کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان کی متفکرانہ سطح ہمیشہ یکساں نہیں رہی۔ بلکہ مطالعہ و موثرات خارجی کے لحاظ سے بدلتی رہی ہے۔ اوّل اوّل انہوں نے جو کچھ کہا عقل کی رہبری میں کہا۔ بعد کو جب وہ آخری عمر میں عشق کی منزل تک پہنچے تو محبت کے پختہ تاثرات جو رنگ و نسل کے امتیاز سے بلند ہو کر جملہ نوع انسانی کو "انسان کل" میں تبدیل کر دیتے ہیں، اُن کو تصوف کی طرف لے گئے۔"[1]

[1]: "نگار" اقبال نمبر سالنامہ ۱۹۶۲ء (اقبال کا رنگ تغزل) ص ۶۴

[2]: سالنامہ نگار ۱۹۵۲ء حسرت نمبر جلد ۲۱ شمارہ ۱-۲، ص ۸۲، ۸۳

حقیقت یہی ہے اور اقبال کے ناقدین یقیناً اس بات پر متفق ہیں کہ اُن کی مفکرانہ سطح میں تدریجاً تبدیلیاں آتی رہیں۔ داغ کے رنگ میں خالص عشقیہ غزل لکھنے والے اقبال اور مسجد قرطبہ، ذوق و شوق اور "ساقی نامہ" کے اقبال میں فرق ہے۔ نیاز نے اپنی ذہانت اور تنقیدی نقطۂ نظر سے پہچان و شناخت کا مرحلہ بہت پہلے طے کر لیا۔

نیاز کی ذہانت کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے اُن شعراء کی چھپی ہوئی عظمت کو اُسی زمانے میں دریافت کر لیا، جن سے وقت اور زمانہ نے سخت قسم کی ناانصافی کی۔ نظیر جنہیں بازاری پست شاعر سمجھ کے نظر انداز کیا گیا۔ نیاز نے اُنہیں تنقیدی نگاہ سے جانچ کر صحیح مقام دلانے کی سعی کی۔ نیاز نے اُنہیں "چنکھر باز" شاعر قرار دیا ہے۔ جو بچوں سے لے کر بوڑھوں تک غریبوں سے لے کر امیروں تک ہر عمر و طبقہ کی محفل میں اپنی جگہ پیدا کر لیتا ہے وہ دُنیا کو شیطان کا انتقام نہیں سمجھتا بلکہ انسان پر احسان سمجھ کر اُس سے لُطف حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رجائیت پسند تکلف و تصنع سے پاک یہ شاعر محفل کا جو رنگ ہو اُس میں ڈوب جاتا ہے۔ الفاظ کے گھڑنے میں جو یدِ طولیٰ ہے اُس میں نظیر آپ اپنی نظیر ہے۔ یہ عجیب و غریب شاعر اخلاق و ذہانت میں بے مثال مگر افسوس کہ وقت سے پہلے پیدا ہو گیا۔ اِس لئے حُسنِ سلوک کا مستحق نہ ٹھہرا۔ نیاز کے مطابق:۔

> "نظیر اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کا عجیب و غریب شاعر تھا ــــــ اُردو شاعری میں تغزل سے ہٹ کر سب سے پہلے اُس نے نظمیں لکھنے کی ابتدا کی اور سچ پوچھیے تو انتہا بھی کر دی۔ لیکن افسوس کہ وہ بہت قبل از وقت پیدا ہُوا۔ وہ اِس زمانہ کا شاعر تھا اور اِسی زمانہ میں اُسے ہونا چاہیئے تھا۔"[1]

لہ: "نگار" نظیر نمبر ۱۹۴۰ء جلد ۲۳ شمارہ ۱ ص ۱۷ "انتقادیات"، "نظیر میری نظر میں" حصہ اوّل ص ۲۰۸ مکتبہ معین الادب لاہور

حقیقت یہی ہے کہ نظیر کا رنگ شاعری اور دیسی نظمیں صرف اُسی نے لکھیں لیکن ایسے دور میں جب شاعری ایک مخصوص طبقہ کی زندگی کا نام تھا خالص عوام کے لہجے اور رویے میں بات کرنا یقیناً ایک نیا رنگ و آہنگ تھا جسے اتنی جلدی قبول کر لینا شاید لوگوں کے بس کی بات نہ تھی۔

نیاز کی مومن پرستی بہت شہرت پا چکی ہے۔ وہ واقعی مومن سے حد درجہ متاثر ہیں۔ اس کا جواز بھی شاید یہ رہا ہو کہ مومن کو بھی اُس کا اصل مقام و مرتبہ بہت دیر بعد ملا۔ آزاد نے "آبِ حیات" میں اُسے بالکل نظر انداز کیا۔ انتہا یہ ہے کہ پہلے ایڈیشن میں جو ۱۲۹۰ھ؍ ۱۸۸۰ء کو منظرِ عام پر آیا۔ مومن کا تذکرہ تک گوارا نہ کیا۔ نیاز کو مومن سے دلی لگاؤ ہے۔ مومن کے سلسلے میں وہ خاصے جذباتی ہیں، کہ متقدمین و متاخرین میں صرف کلیاتِ مومن کو اُٹھا لینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے مومن کو قدرتِ بیان اور اُسلوبِ ادا کا بادشاہ قرار دیا ہے وہ حقیقی معنوں میں غزل و تغزل کا شاعر ہے۔ اور نفسیاتی رموز کو سمجھ کر معنوی نزاکتیں پیدا کرتا ہے وہ ان ہونی کو "ہونی" اور "ہونی" کو "اَن ہونی" ثابت کرتا ہے۔ نیاز نے جس طرح سے مومن کے کلام کا تجزیہ کیا ہے اُس کی مثال اُردو تنقید میں کہیں نہیں ملتی۔ اپنی عقیدت اور جذباتی لگاؤ کے باوجود حقیقت اور توازن کی میزان کے دونوں پلڑے نیاز نے برابر رکھنے کی سعی کی ہے وہ مومن سے متاثر ہیں کہ اُس نے اُردو کے دوسرے شعراء کی طرح عشقِ حقیقی و ماورائیت کی طرف توجہ نہیں کی۔ بلکہ انسان ہوتے ہوئے خالص انسانی جذباتِ عشق کی ترجمانی و عکاسی کی ہے۔ اِس سلسلے میں نیاز کا کہنا ہے:۔

> "مومن نے اِس دُنیا کا عشق کیا، اور اِس میں جتنے تجربات تلخ و شیریں ہو سکتے ہیں وہ سب اُنہوں نے کیے وہی ہجر و وصال کی مادی کیفیات وہی شکوہ و شکایت وہی رقیب کا کھٹکا، وہی التجائیں، وہی تدبیریں وہ تمام جذبات جو عناصرِ محبت سے تعلق رکھتے ہیں سب مومن کے

ہاں پائے جاتے ہیں۔ مومن کے معشوق کا کیریکٹر کلام سے متعین کیا جائے تو وہ بازاری جنس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔[1]

نیاز کا یہی انداز کہ انہوں نے ہر شاعر کو ذاتی زاویوں سے جانچنے اور پرکھنے کی کاوش کی، اور اپنے تاثر کی بنیاد اُن خوبیوں اور اوصاف پر رکھی جن کے سوتے شاعر کے فن سے پھوٹتے ہیں۔ نیاز کے تنقیدی فیصلے اپنی جگہ اہم و مسلّم، لیکن زیادہ تر اُن کی اساس۔ ان کے اپنے ذوق، ذاتی تاثرات و جذبات پر ہے۔ انہوں نے اکثر زبان و بیان کی خوبیوں کو جانچا اور پرکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنویر صدیقی کے بقول نیاز تذکروں کی طرف لوٹ گئے ہیں۔ اسی لئے کسی شاعر کے انداز بیان، اعجاز بیان، عروض و قواعد کی غلطیاں پکڑتے ہیں۔ اُردو تنقید نے نیاز کی رہنمائی میں آگے سفر کرنے کی بجائے پیچھے سفر کیا ہے۔[2]

اس سلسلے کی اہم ترین کڑی مالہ وماعلیہ ہے۔ مگر "انتقادیات" حصہ اوّل میں سیماب اکبرآبادی، اصغر، جوش، فراق کا تجزیہ اسی انداز میں کیا گیا ہے۔ نیاز نے جو اصلاحیں دی ہیں وہ لفظی، علم بیان و بدیع، عروض و قواعد سے متعلق ہیں۔ مگر ان کا بیشتر سے متفق ہونا مشکل ہے۔ جوش کی عظمت سے انہیں انکار نہیں مگر نیاز شاعری میں نازک نقائص کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ وہ نئے اور نوجوان شعراء سے تو رعایت برت لیتے ہیں۔ مگر جوش جیسے بڑے اور کہنہ مشق شاعروں کی معمولی غلطیاں نظر انداز کرنے کو قطعی تیار نہیں۔ انھوں نے بڑے منطقی اور سائنٹیفک انداز میں جوش کے ہاں ان خامیوں کی نشاندہی کی ہے کہ نیاز کی زبان دانی و ستائش معاصر کی گہرائیوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ایک مثال دیکھئے کہ انداز محققانہ ہو۔ جوش کی نظم "خاتون ہندی" کا پہلا شعر۔

اے خاتونِ ہند! انجمن سے کیا تجھے نسبت
زیبا ہے تجھے تو خلوتِ اخلاق کی مسند

---

[1] کلام مومن پر ایک نظر "انتقادیات" حصہ اوّل ص ۹۴ مکتبہ معین الادب لاہور

[2] کچھ نیاز کے بارے میں "نیاز نمبر" حصہ اوّل ص ۳۰

پہلے مصرعہ میں لفظ "انجمن" استعمال کیا گیا ہے۔ جو مادی منظر سے تعلق رکھتی ہے۔ اور مصرعہ ثانی میں مقابلتاً خلوت اخلاق کہا گیا ہے جو بالکل غیر مادی شے ہے۔ انجمن کے مقابلے میں صرف "خلوت" کہا جا سکتا تھا۔ مگر محض مصرعہ پورا کرنے کے لئے "اخلاق" لایا گیا۔ "خلوت اخلاق" یوں بھی مہمل ہے اگر "اخلاق خلوت" ہوتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔[1]

نیاز کے اسی انداز سے پتا چلتا ہے کہ اُن کی لفظوں کی نزاکتوں اور لطافتوں پر کتنی گہری نظر تھی۔ وہ ان کے استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ وہ شعراء کے زبان و لسانیات کے مطالعے کو بہت ضروری قرار دیتے ہیں۔ عام طور پر ہم الفاظ کی نزاکتوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ مگر نیاز کا کہنا ہے کہ جب تک فن کار لفظوں کے معنی و مفاہیم اور اُن کے صحیح و حقیقی استعمال سے واقف نہ ہو، وہ کامیاب شاعر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی اُس کی شاعری میں وہ فکری حسن و خوبی پیدا ہو گی جو شاعری کی جان ہے۔ یوں نیاز کی تنقید نکتہ شناس کی تنقید ہے۔ جو چونکا دینے والے انداز میں تہہ بند گتھیوں کو یوں کھولتی ہے کہ اُن کی روشنی میں سننے والے وہ معنی ڈھونڈ لیتے ہیں جو پہلے کبھی کسی پر منکشف ہوتی ہیں۔ نیاز محض مصرعے پورے کرنے کے لئے حروف کے استعمال کے قائل نہیں۔ گہرائی میں جا کے غور بھی سوچتے ہیں اور شعر کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ شعر کہاں سے وہ الفاظ کا شرمندہ "معنی" ہونا بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔ مثلاً جوش کا یہ اور شعر دیکھئے

پھر اُٹھوں گا ابر کی مانند نغمہ ہو
گھومتا، پھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا

یہاں چار صفتیں "ابر" کے لئے ٹھیک ہیں لیکن گونجنا اور گانا ابر سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ مکان گونجتا ہے۔ وادی گونجتی ہے۔ لیکن ابر نہیں گونج سکتا

---

[1] جوش ملیح آبادی کی بعض تخلیق "انتقادیات" حصہ اوّل ص ۱۰۰ مکتبہ معین الادب لاہور

اسی طرح اَبر کو گرجتا ہُوا کہہ دیا تو پھر اس کا گانا کیا معنی ؟" [۱]

نیاز کی یہ عملی تنقید گرچہ قدیم تذکروں کے انداز کی ہے۔ مگر آج کے دَور میں اس کی اہمیت اس اعتبار سے بڑھ جاتی ہے کہ لفظوں کی نزاکت، فنّی نقائص، اور عروض و قواعد کی طرف ہمارے شعرا کی توجہ دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ تجرید، علامت اور شاعری کی آزادی کے اس دور میں جہاں لفظوں کو میلی اور ستراط تو سمجھا جاتا ہے مگر اُن کے حقیقی مقام کا تعیّن فراموش کیا جا رہا ہے، شعرا آشوبِ ذات میں، سلگتی رُوح کے گھاؤ اور انفرادی کیتھارسس کی طرف یوں سفر کر رہے ہیں کہ شاعری کے جملہ اوصاف اور بنیادی لوازمات کو نظرانداز کئے جا رہے ہیں حالانکہ لفظ کو برتنے کا یہ جاندار کلاسیکل رویّہ نظرانداز کرنے کے قابل ہرگز نہیں ہے۔

نیاز نے جہاں لفظوں کے اس مستند رویّہ کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ وہاں وہ نئے ذہنوں اور نوجوانوں کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہے ہیں۔ اُن کی صلاحیتوں اور ذہانت کے بارے میں اُن پہ تنقیدی مضامین لکھ کر نیاز نے اُن کے درخشاں و روشن مستقبل کی پیش گوئی کر دی۔ ان میں یو۔پی کے نوجوان ہندو شاعر کو بہت اہمیت حاصل ہے جو آگے چل کر فراق گورکھپوری کے نام سے اُردو شاعری میں روشنی کا ایک بلند مینار ثابت ہُوا۔ نیاز نے فراق کو معنوی دنیا سے متاثر بتایا ہے۔ تاثراتی مگر نہایت خوبصورت مختصر مضمون میں اُن کی شاعری کی خوبیوں کا جائزہ کیا ہے۔ اشعار کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فراق کو آگے بڑھانے اور فراق کو فراق بنانے میں نیاز سرفہرست ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اُن کے تنقیدی فیصلے اتنے برحق ہیں کہ نظرانداز نہیں کئے جا سکتے مثلاً:۔

"فراق کی شاعری میں احساس "وُقوفِ احساس" دونوں پائے جاتے ہیں
اس لئے اُن کے یہاں معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ کیفیت و حلاوت کی

۱؎۔ "جوش ملیح آبادی کی بعض نظمیں" انتقادیات حصّہ اوّل ص ۳۲۶، مکتبہ معین الادب لاہور

بھی کمی نہیں اور وہ فتادگی و والہانہ ادا بھی ہر جگہ موجود ہے جو محبت کا
لازمی نتیجہ اور غزل کی جان ہے۔" [۱]

نیاز کے اس تنقیدی فیصلہ میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ فراق اسی وقوفِ احساس، معنی آفرینی، تغزّل اور حلاوت کی وجہ سے اُردو شاعری میں اپنی ایک الگ پہچان و شناخت رکھتے ہیں۔

نیاز کی عملی تنقید میں نگار کا "انتقاد نمبر" جو جنوری فروری ۱۹۴۰ء میں شائع ہُوا، خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں ایک سال قبل شائع ہونے والے "تذکرہ نمبر" پہ کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، ڈاکٹر تاثیر، اور مجنوں گورکھپوری کی "تنقیدی آرا" پہ اپنی اتفاقی یا اختلافی رائے دی ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ احسان دانش، اختر شیرانی، جوش، جگر، حفیظ جالندھری، ساحر، فانی، فراق، حسرت، یگانہ، اور افسر میرٹھی وغیرہ پر ان بڑے نقادوں کی رائے کے بعد، اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نیاز کو اپنی رائے اور اپنے تفکّر پہ بے پناہ اعتماد تھا۔ اُن کی باتیں گرچہ خوب صورت تاثرات کی صورت میں سامنے آتی ہیں لیکن یہ تاثرات ایسے جاندار کہ ان سے نفی و انحراف دشوار ہے۔ مثلاً حسرت کو کلیم الدین احمد، سرور، مجنوں اور ڈاکٹر تاثیر نے غزل کا جاندار کلاسیکل شاعر قرار دیا ہے لیکن نیاز نے جب ان کے بارے میں رائے دی تو ان سب بڑے نقادوں پہ بازی لے گئے۔

"حسرت کی غزل کا ترنم، نرم و لطیف اندازِ بیان، الفاظ کی شیرینی، فارسی
ترکیبوں کی حلاوت اور متوازن خیالات سے پیدا ہونے والی ہم آہنگی
یہ سب مل کر کچھ ایسی چیز بن جاتی ہے جو ہمیں اس وقت کسی اور کے کلام میں

۱؎۔ "یو۔پی کا ایک نوجوان ہندو شاعر" انتقادیات حصّہ اوّل ص ۳۴۲، ۳۴۳، مکتبہ معین الادب اُردو بازار لاہور۔

زمیں طبق سے حسرت کی نغمہ سنجیوں کو سن کر لوگ چونک پڑے، اردو میں وجد
کرنے لگیں اور شعر و سخن کی فضا چمک اٹھی۔"

کلیم الدین احمد کی آرا نیاز سے مختلف نہیں۔ زیادہ تر وہ اُن سے متفق نظر آتے ہیں۔ پھر بھی حیرت ہے کہ انہوں نے "اُردو تنقید پر ایک نظر" میں نیاز کے تنقیدی خیالات کو جگہ کیوں نہیں دی۔ خاص طور پر نیاز کی عملی تنقید کو نظر انداز کرنا یقیناً زیادتی ہے۔ اس سلسلے میں "مالہ وما علیہ" ایک مستقل تصنیف ہے جو مختلف شعرا کے مختلف ادبی رسائل میں چھپنے والے کلام پر تجزیہ و تبصرہ و تنقید ہے۔

"مالہ وما علیہ" کا تنقیدی سلسلہ اپریل ۱۹۲۲ء سے نگار میں شروع کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۲۵ء کے بعد کچھ عرصے کے لئے بند کر دیا گیا۔ پھر مارچ ۱۹۲۶ء سے لے کر ستمبر ۱۹۲۶ء تک جاری رہا۔ [illegible] ۱۹۲۵ء [illegible] ہے۔ کتابی شکل میں ۱۹۲۶ء میں منظر عام پر آیا۔ [illegible] جوش، [illegible] فراق [illegible] کا کلام [illegible] رسائل میں [illegible] گئی۔ گو یہ تنقید عملی اور تجزیاتی [illegible] ہے [illegible] شاعری کے سلسلے میں نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ نیاز کو [illegible] کی شاعری تھا۔ انداز کچھ [illegible] تھا۔ [illegible] مشہور غزل جو فروری ۱۹۲۲ء میں رسالہ "ادیب" دہلی میں شائع ہوئی [illegible] ملاحظہ ہو:

ے آتے ہیں پھر وہ غمزۂ دل دہاں کیے ہوئے
پلکوں کی اوٹ محشر کا ساماں کیے ہوئے

نیاز نے بتایا کہ یہ غزل غالب کی زمین میں لکھی گئی ہے اور فوراً ذہن

لے "نگار" جنوری فروری ۱۹۲۲ء شمارہ ۲-۱، ص ۶۷

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس کے بعد غزل کے مختلف اشعار کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مثلاً

ے پھر اُٹھ رہی ہے جانب دل چشم شرگیں
اک اک نظر میں پرسش پنہاں کیے ہوئے

مفہوم کے لحاظ سے اچھا شعر ہے لیکن حیرت ہے کہ مجوزے ردیف پر غور نہیں کیا۔ انداز بیان کے لحاظ سے لئے ہوئے ہونا چاہئے نہ کئے ہوئے۔ اگر پرسش کی صفات پنہاں کے ساتھ ہوتی تو کئے ہوئے کہہ سکتے تھے۔ یوں بالکل غلط ہے۔[1]

نیاز کی عملی تنقید کا تعلق نفسِ زبان کا ابتدائی و بیان حسنِ کلام کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ [illegible] ہے جو صحیح لفظوں میں مناسب مفہوم ادا کر سکے۔ لفظوں کا صحیح مقام ایک رشتے [illegible] لفظوں کا انتخاب اُسی طرح کرنا چاہیے جس طرح [illegible] کرتے ہیں [illegible] کی اتنی بات ہی کافی ہے کہ وہ لفظوں کا صحیح تجزیہ کر سکا۔ [illegible] لفظوں کے [illegible] مفہوم کی بلاغت دیکھتے ہوئے بعض اوقات [illegible] شاعر [illegible] کی ایک نظم برسات کی ایک رات ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء کے [illegible] شائع ہوئی۔ اس پر یوں اصلاح دی ہے۔

ے برسات کا موسم، وہ ہوائیں، وہ ترشح
وہ دُور تک سلسلۂ ابرِ بہاراں

پہلے مصرعے میں تین چیزوں کا ذکر ہے۔ برسات کا موسم، ہوائیں اور ترشح۔ اس لئے وہ کا استعمال ہر جگہ ہونا چاہیے۔ یعنی اگر وہ ہوائیں، وہ

لہ "مالہ وما علیہ" نگار اپریل ۱۹۲۲ء، ص ۳۸

"ترشح" کہا گیا تھا تو وہ برسات کا موسم ہی کہنا چاہیے تھا۔ اس لئے
پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا "برسات کی وہ تند ہوائیں وہ ترشح" دوسرے
مصرعہ میں "تک" کا استعمال کیا گیا ہے جو بعض کے نزدیک متروک ہے
لیکن میں اس کو درست سمجھتا ہوں۔"[1]

فنی و لغوی اعتبار سے یہ تجزیاتی انداز اہم اور قابلِ توجہ ہے بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے جوش و فراق کے کلام پر بھی خاصی سخت تنقید کی اور زبان و بیان کے نقائص پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ وہ جن شعراء سے متاثر ہیں اُن کے ہاں بھی فنی خامیوں اور زبان و بیان کے غلط استعمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یوں وہ متوازن تنقید کے قائل ہیں۔ انہوں نے نقاد کو "حاکم عدالت" سے تشبیہ دی ہے پھر بھی کہیں کہیں شخصی تعصبات اُبھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اور کہیں اُن کی خاطر شعروں کی اصلاح کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر امیر عارفی کے مطابق:-

"نیاز کے یہاں قوتِ فیصلہ کی کمی نہیں، لیکن ان کے تعصبات اور تاثرات
ادبی فیصلوں پر غالب آجاتے ہیں، اس سے ان کی تنقید میں یک رُخا
پن محسوس ہوتا ہے۔"[2]

نیاز کا یہ رویہ ایک عام اور نارمل انسان کا رویہ ہے۔ چونکہ وہ "فوق الانسان" نہ تھے لہذا کبھی کبھار قلم میں لرزش آہی جاتی۔ پھر بھی رومان و جمال کے پرستار کے ناقدانہ، سائنسی و منطقی فیصلے اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔

نیاز نے اپنی تنقیدوں میں بھی رومانی و جمالی انداز سے کام لیا ہے۔ اس لئے کہ اُن

[1] "مالہٗ و ماعلیہ" نگار دسمبر ۱۹۴۲ء، ص ۴۸

[2] "نیاز فتح پوری" ص ۲۴۱، بار اوّل اپریل ۱۹۶۷ء، انجمن ترقی اُردو ہند نئی دہلی

ہاتھ میں گرچہ میزانِ عدل اور اُن کی اُنگلیوں میں ناقد کا تجزیاتی قلم ہے مگر سینہ میں فنکار کا نازک و حساس دل دھڑکتا ہے۔ تنقید کی زبان سادہ، منطقی اور سائنٹیفک ہوتی ہے۔ نیاز اس حقیقت سے آشنا تھے۔ اُن کے اندر کا رومانی و جمال پرست شاعر و ادیب بعض اوقات تنقید پر چھا جاتا اور یوں خوب صورت، شاہکار نثر منظرِ عام پر آتی۔ جس میں لفظوں کا حُسن بھی ہوتا ہے۔ انشاپردازی کی حرارت و گرمی بھی، ساتھ ہی معنی و مفہوم لپٹے چلے آتے ہیں:-

"مغلیہ بزم کی آخری شمع گل ہو چکی تھی۔ اور اس کے پروانے اِدھر اُدھر منتشر
ہو چکے تھے کہ اُفقِ مصطفےٰ آباد میں روشنی کی جھلک نظر آئی اور اِن سب کا
رُخ اُس طرف ہو گیا۔ ہر چند یہ ہمہ "رنگِ محفل" کی داستان سے ابھی تک
قلب مجروح اور لب خونچکاں تھے لیکن دربار رامپور کی قدر شناسیاں و نکتہ نوازیاں
گویا مرہم کافور تھیں کہ چند دن میں تمام زخم بھر گئے اور بھولی ہوئی نغمہ سنجیاں
پھر یاد آگئیں۔"[1]

یہ انداز تجزیاتی بھی ہے اور محفوظ کرنے والا بھی۔

نیاز فتح پوری یقیناً ایک بڑے نقاد ہیں۔ جن کے فیصلے برحق۔ اُن کی تنقیدیں مختلف سماجی علوم، فنونِ لطیفہ، مذہبی اقدار، سماج و عمرانیات سے سفر کرتی ہوئیں، لفظ و معنی، زبان و لسانیات، اُسلوبِ بیان اور جدّتِ ادا کے مباحث تک پہنچتی ہیں، اُردو انتقاد کی تاریخ میں اُن کا مقام منفرد و امتیازی ہے۔ اُن کی باتیں تحقیقی اور تنقیدی دونوں اعتبار سے وسیع و عمیق اور ہمہ گیر ہیں۔ اُن کا انداز مفکرانہ اور عالمانہ ہے۔ زبان کی تاریخ، لفظ و معنی کے گہرے ربط کی تمام تر باریکیوں اور نزاکتوں سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ وہ تاثراتی و جمالیاتی سہی مگر فنِ تنقید کی تمام تر ذمہ داریوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اور اس ضمن میں بڑی بصیرت افروز باتیں کی ہیں، جن میں عالمانہ شکوہ

[1] میاں نظام شاہ پوری "انتقادیات" حصہ اوّل ص ۵، مکتبہ معین الادب اُردو بازار لاہور

اور اعلیٰ ذوق پایا جاتا ہے۔ بقول سجاد باقر رضوی:۔

"نیاز فتح پوری کی تنقید عالمانہ شکوہ اور اُس اعلیٰ ذوق شعر کی مظہر ہے جو کبھی منظومات کی صورت میں اظہار پاتا تھا۔ مگر بالآخر اُن کے علم کے ساتھ ضم ہو کر تنقید کی صورت میں ظاہر ہُوا۔ عربی، فارسی، ہندی اور اُردو زبان میں مہارت اور انگریزی زبان سے مناسب واقفیت نے ان کے علم میں وسعت اور ذوق میں گہرائی پیدا کی تھی۔ اُن کے تنقیدی مضامین کی نثر اعلیٰ سنجیدگی، متانت اور ذوقِ تجزیہ کے باعث وقعت کی حامل ہے۔[۱]"

نیاز کی یہ وقعت و اہمیت یونہی نہیں۔ اِس میں اُن کے نظریات، عملی تنقید، مطالعہ کی وسعت و گہرائی، تحقیقی کاوش و جستجو کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اُن کے چونکا دینے والے قلم نے زنگ آلود ذہنوں کو مجلیٰ و مصفّیٰ کرنے کا کام بڑی بے باکی سے کیا ہے۔ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ رائے کی صحت مند اور جرأت مندانہ روایت کے تحت ناقدانہ تجزیہ انہی کے قلم سے پروان چڑھا۔ نئی سمتوں اور نئی راہوں کی نشاندہی کی۔ تنقید میں ایک خاص تیکھا پن اُنہی کی وجہ سے پیدا ہُوا۔ اُن کی تنقید خشک مباحث کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ اُس میں ایک رنگینی اور کشش ہے۔ معاصر شعراء کے ہاں لفظی و معنوی غلطیوں کی گرفت شاید نیاز کے علاوہ اور کوئی کر ہی نہ سکتا تھا۔ اُن کا مقصد آبگینوں کو ٹھیس پہنچانا نہیں بلکہ شاعری کی صحت مند روایات کو مستند کرنا ہے تاکہ زبان و اُسلوب کی طرف خاص توجہ دی جائے۔ انگریزی تنقید سے استفادہ کے باوجود مشرقی احساس اور طرزیہ اُنہوں نے فخر کیا ہے اور منطقی انداز میں ثابت کیا ہے کہ شاعری محض لفظوں کا کھیل و طلسم نہیں بلکہ اِس کے لئے خاص ذوق اور کاوش و مشق کی ضرورت ہے۔ نئی آوازوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُنہیں بڑی اہمیت دی ہے لیکن ادب کی نئی آوازوں اور نئے آہنگ کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے

۱۔ "نیاز فتح پوری کی تنقید" رسالہ صحیفہ اپریل جون ۱۹۸۲ء، ص ۱۹، مجلس ترقی ادب لاہور

پرانے و کلاسیکل ادب کو بھی نئی زندگی عطا کی۔ آل احمد سرور نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

"حالیؔ، سلیمؔ اور عبدالحقؔ کے بعد نیازؔ ہمارے بڑے نقادوں میں سے ہیں بلکہ ادبی شعور کی گہرائی کے لحاظ سے وہ سلیمؔ اور عبدالحقؔ سے بھی بلند ہیں۔ انتقادیات ہماری تنقید میں ایک مفید اضافہ ہے۔ عبدالحقؔ نے ہمارے کلاسیکی ادب کو جسے ہم مُردہ سمجھ بیٹھے تھے ہمارے لئے زندہ کیا، مگر نیازؔ نے اِسے آب و رنگ اور شگفتگی عطا کی۔

باب ۴

مکتوب نگاری

"خط" عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں "رسم تحریر" یا "تحریر" ہی کو خط کہتے ہیں۔ اصطلاحاً "مراسلت" و "مکاتبت" کے الفاظ مستعمل ہیں۔ یہ تہذیبِ انسانی کے اُن عجائبات میں سے ہے جس کی انسان کے جذبے کو ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے۔ انسان نے جب ربط و ضبط، خلوص و مروّت، دوستی و محبت کا آغاز کیا تو اُسے یہ محسوس ہُوا کہ بالمشافہ گفتگو ابلاغ کا مکمل، بھرپور اور خوب صورت عمل ہے، اور اس کے اظہار میں کوئی دِقت نہیں، مگر جو لوگ ہم سے دُور ہیں، ہماری حدِ سماعت کے اندر نہیں، جن کے فاصلے بعید ہیں، جن کی دُوری سماعت کے لئے ناقابلِ عبور ہے، اُن کے ساتھ گفتگو و سلسلۂ اظہار کس طرح رکھا جائے! چنانچہ فطری و خداداد صلاحیتوں سے "خط" ایجاد کیا گیا، اور ایک نیا وسیلۂ گفتگو پیدا کر لیا۔

"خط" سہانے خواب ہیں اور ان خوابوں کا تجزیہ بھی جن کی نیم مدہوشیاں جاگتی کا نشہ لئے ہوتی ہیں۔ یہ صداقت و سچائی بھی ہیں اور سراب و فریبِ خیال بھی، جن کی رَو میں ہم بہتے ہیں تو سمجھنے لگتے ہیں کہ دُنیا کی ہر قیمتی و حسین شئے ہمارے لئے بنی ہے اور بس ہماری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہمارے دُکھوں کا مقدّس صحیفہ اور اسرارِ حیات کا پاکیزہ روزنامچہ ہیں۔ جہاں ضابطے اور رسم کی ہر قید سے ہم آزاد ہیں ـــ بالکل آزاد، خطوط آپ بیتی ہیں اور جگ بیتی بھی بقول

بابائے اُردو مولوی عبدالحق ۱؎:

"پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کو سُننے کا مشتاق نہ ہوگا۔ یہ ہماری فطرت میں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں، آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس میں وہ صداقت اور خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا"

یہی صداقت، خلوص اور محبت، خطوط کی رگوں کو وہ تازہ خُون مہیا کرتے ہیں جو ہماری ذہنی چھپاتی صحت مندی کے لئے بہت ضروری ہے۔ ابتدا میں یہ مادی ضروریات پورا کرنے تک محدود رہے مگر رفتہ رفتہ فنِ لطیف کا ایک اہم حصّہ بن گئے۔ کاغذ و قلم کے ساتھ ساتھ "معجزہ فن"، کو خُونِ جگر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، یہی خُونِ جگر لغزشوں کا حُسن ہے۔ گونگے جذبوں کو زبان عطا کرتا ہے۔ خطوط سچّے جذبوں اور عشق و محبت کے نشیب و فراز کی وہ لافانی داستان ہیں جو ہمارے تھکے ہارے ذہنوں، اور ہر لحظہ ٹوٹتے، بکھرتے احساس کو سکون و آسودگی بخشتے ہیں۔ جس طرح محبوب سے یہ توقع رکھنا کہ اُسے بھی جواب میں محبت کرنی چاہیئے صحیح نہیں، کیونکہ محبت قرض نہیں عطیہ ہے۔ بالکل اُسی طرح محبت کے دیوتا کی مانند خط کا دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔ خط، بھولی بسری یادیں بھی ہیں اور شعور و لاشعور کی بھول بھلّیاں بھی۔ یہ ہمارے سُنہرے خواب و سُندر آشائیں بھی ہیں اور تلخ حقیقتوں و حسرتوں کے خستہ مزار بھی۔ یہ ذاتی، شخصی و انفرادی رُوح کو بے نقاب بھی کرتے ہیں اور تاریخ تہذیب اور عہد کی سچّی داستان بھی ہیں۔ یہ خالصتاً جذبے کی پیداوار ہے مگر اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ سیاسی و دفتری، تجارتی و کاروباری، علمی و معلوماتی، شخصی و نجی، جذباتی و خیالی۔ بُنیادی طور پر

۱؎ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا خط بطور مقدمہ "خطوطِ شبلی" ص۔ ۲ "شبلی مکاتیب کی روشنی میں" مرتبہ معین الدین احمد انصاری مطبوعہ۔ بار اوّل ۱۹۶۷ء۔ اُردو اکیڈمی۔ سندھ کراچی۔

آسانی کے لئے ہم انہیں دو خانوں میں رکھ سکتے ہیں:۔

۱۔ نجی خطوط جن کا تعلق خالصتاً ہماری شخصیت و ذات سے ہے۔

۲۔ وہ خطوط، جو عوام یا دوسروں کے لئے لکھے جاتے ہیں۔

خطوط نجی و شخصی ہوں یا دوسروں کے لئے لکھے جائیں، یہ دل کی وہ خاموش مگر سچی آوازیں کہ انسان اپنائیت کا احساس لئے، بچپن کی سی معصومیت اور سادگی کے ساتھ، دماغ میں بسی سوچ، تخیل و تفکر کی ہر لکیر اور دل کی ہر دھڑکن کو صفحۂ قرطاس پہ یُوں بکھیر دیتا ہے کہ ہر حرکت، ہر خیال، ہر تمنا، ہر احساس، جیتا جاگتا اور گھٹتا بڑھتا نظر آتا ہے۔ اس طرح ہمارے دل و دماغ سے گزرنے والی ہر بات خواہ وہ پنکھڑی کی طرح لطیف و نازک ہو یا چٹان کی طرح سخت و پتھر، خط و کتابت کا موضوع بن سکتی ہے۔ یُوں خط ہی وہ واحد صنف ہے جو اُصول، خیال اور موضوع سے بے نیاز ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر خورشید الاسلام رقمطراز ہیں:۔

"خط میں نہ اُصول کی ضرورت، نہ خیال کی ضرورت نہ موضوع کی ضرورت
زندگی اپنی راہیں خود بنا لیتی ہے۔ خط اپنی باتیں خود پیدا کر لیتا ہے
زندگی کے آغاز کا پتا نہ انجام کی خبر۔ ایک بہاؤ ہے۔ ایک روانی ہے
ایک اُپج ہے۔ خط میں نہ ابتدا نہ انتہا۔ وسط نہ تمہید، تشبیب نہ دُعا
بس گریز ہی گریز ہے۔ اور ہزاروں سال کے تجربے نے جو کچھ بتایا ہے
یہ ہے کہ گریز ہی میں زندگی کا حُسن ہے کیونکہ زندگی خود ایک گریز ہے۔"[1]

گریز کا یہ عمل جُدائی کے نہ کٹتے ہوئے زمانوں کی کہانی بھی ہے اور تجدیدِ رسم و فا بھی۔ یہ تاریخ کی مجرّد سچائی بھی ہے اور تمثیل کا حُسن بھی۔ مکتوب نگار وہ سپیرا ہے جس کی پٹاری میں سانپوں کی بجائے دِل بند ہوتے ہیں۔ پھر کون ہے جو خط و کتابت کی اہمیت کا منکر ہو

[1] نگار پاکستان کراچی، اصنافِ ادب نمبر ص ۲۴۴، سالنامہ ۱۹۶۶ء، مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

سکتا ہے۔ خط چاہے چار لاکھ الفاظ پر مشتمل تاریخی حیثیت سے برٹش میوزیم کا حصہ ہو، یا کورا، خالی، ویران کاغذ، ایک بات طے شدہ ہے کہ اس کی تحریک جذباتی ہوتی ہے اسی وجہ سے یہ فنِ لطیف کا اہم حصہ ہیں خط حُسنِ اتفاق کا نام ہے اور حُسنِ اتفاق ہی سے یہ ادب کی ایک صنف ہے۔

جذبہ کے ساتھ ساتھ خط نویسی کا فن اس بات کا تقاضا سب سے پہلے کرتا ہے کہ ہر اچھے خط کو وہ مقصد پورا کرنا چاہیئے، جس کے لئے وہ لکھا جا رہا ہے۔ یعنی پیغام کا قطعی ابلاغ۔ اس میں خلوص و محبت کی مسحور کُن لازوال مہک بھی ہو اور عام بول چال کی سادگی و بے تکلفی بھی۔ اچھا خط، بقول آل احمد سرور:۔

"اچھا خط وہ کہا جا سکتا ہے، جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے
باتیں کرتا ہُوا نظر آئے جس میں بے تکلفی بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ
انفرادیت، ذاتی تاثرات کی جھلک ہو۔ چنانچہ وہ خط جن میں جان بُوجھ کر
علمیت کی نمائش، انشا پردازی کی شان، تکلف کا اظہار، خطابت کا جوش
دکھایا جائے۔ خط نہیں مضمون ہیں[2]۔"

اس آمد، سچے اور بے خوف اظہار میں مکتوب نویسی کا حُسن مضمر ہے۔ کوئی محفل نہیں، انسانی چہروں کا ہجوم نہیں، ایک باتیں سنا رہا ہے اور دوسرا توجہ سے سُن رہا ہے ساری دُنیا غنودگی میں ہے۔ صرف دو انسان زندہ ہیں۔ دونوں کے دل کی دھڑکن تیز ہے۔ جذبوں کی تپش سے چہرے تمتا رہے ہیں۔ وہ سُبک، نازک، مثبت و منفی پہلو جو عظیم ادبی تصانیف میں نمایاں نہیں ہو رہے۔ خطوں کی سکرین پہ متحرک فلم کی طرح چل رہے ہیں۔ شخصیت کے کمزور و مضبوط، سیاہ و سفید، انسانی و حیوانی، ہر دو پہلو سامنے ہیں، بڑی آزادی و بے تکلفی کے ساتھ جیسا

[2] تنقیدی اشارے ص ۶۲، اُردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۳ء

جلیل قدوائی نے کہا ہے۔

"خطوط عام طور پر لکھنے والے خیالات اور معتقدات کا آئینہ اور اُس کی شخصیت کے کمزور اور مضبوط اور ہر دو پہلوؤں کا عکس ہوتے ہیں۔ خطوط میں انسان اپنے دوستوں کو اپنی دل چسپیاں، خوشیاں، مصیبتیں، اپنے دل کے ذرا سے ذرا بھید اور ہر قسم کی تمنائیں اور آرزوئیں لکھ دیتا ہے اور چونکہ لکھتے وقت خطوط کے شائع ہونے یا کسی غیر متعلق شخص کے دیکھنے کا دُور دُور گمان نہیں ہوتا۔ اِس لیے لکھنے والا اُن کے بیان میں پوری آزادی اور بے تکلفی سے کام لیتا ہے"[1]

اس طرح خطوط شخصیتوں اور سیرتوں کو بے نقاب کرتے ہیں، کہ لکھنے والا جو سوچتا ہے جو محسوس کرتا ہے؛ زندگی و کائنات کے بارے میں جو رویّہ رکھتا ہے۔ اُس کا بلا تکلف انکشاف کرتا ہے۔ رفاقت کا جذبہ اُسے وہ کچھ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے جو عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اپنے دوستوں سے براہِ راست مخاطب ہے اس لئے ہر راز سے پردہ اُٹھا دیتا ہے، اور کسی قسم کی کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ بقول رشید احمد صدیقی:

"خط لکھنے والا سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ وہ دوستوں کی صحبت میں ہے، اُس کو کسی قسم کی بدگمانی یا خطرہ نہیں ہوتا۔ وہ وہی چیز لکھتا ہے جو اُس کے دل سے نکلتی ہے اور براہِ راست نوکِ قلم سے برآمد ہوتی ہے"[2]

یہی وجہ ہے کہ خطوط میں ہمارے لئے وہی کشش ہوتی ہے جو ہمارے لئے دوستوں میں ہوتی ہے۔ مکتوب کسی نوعیت کے ہوں اور کسی مقصد سے لکھے جائیں، اِن کی اہمیت

۱۔ مکاتیبِ عبدالحق، مرتبہ جلیل قدوائی ص ۱۲، اُردو اکیڈمی سندھ ۱۹۷۰ء

۲۔ مکتوبات نیاز پر اظہار خیال "نگار" جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۱۹ جلد ۳۷، شمارہ ۱

افادیت مسلّم ہے۔ اِن کا اِنتساب ہمارے وہ دوست ہیں جو ہم سے محبت کرتے ہیں یا جن سے ہمیں محبت ہے۔ خطوط ہمارے رازدار بھی ہیں اور ہمارا اعتماد بھی۔ یہ ہمیں دوسروں پر بھروسہ کرنا سکھاتے ہیں۔ راز و اعتماد کے اِس مضبوط قلعہ میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے ستر اطہ ہاتھوں میں وہ آئینہ اسکندری نظر آتا ہے جو اُن کی روح کے اصلی و حقیقی خدوخال کو منعکس کرتا ہے۔ ہر طرح کے خطوط ادبی نقطۂ نظر سے معتبر یا قابلِ لحاظ نہیں ہوتے خواہ اُنہیں بڑے ادیبوں یا شاعروں نے ہی لکھا ہو۔ ضروری نہیں کہ کوئی بڑا ادیب، اچھا خط نگار بھی ہو۔ کیونکہ خطوط کی کشش و خوب صورتی تصنع، بناوٹ اور سوچے سمجھے منصوبہ میں نہیں بلکہ سادگی، بے تکلفی اور بے ریائی میں ہے اور ان کے مطالعہ کا لُطف، شان الحق حقی کے مطابق:-

"خطوط کے مطالعے کا لُطف جب ہے کہ نجی ہوں بے ساختہ و بے تکلفانہ ہوں۔ اور بہر صورت دلچسپ اور لائقِ مطالعہ اِنشا پردازی سے الگ رہتے ہوئے بھی ادبیت سے معرّا نہ ہوں"[3]

یہی بے ساختگی و بے تکلفی اور ادبیت خطوط نگاری کا حُسن ہے۔ صداقت و سچائی مرکزی کردار ہیں۔ اِس لئے کہ یہ ہمارے اندر بستی ہوئی کائنات کے موسموں کی کہانیاں ہیں تصنع و بناوٹ کے ساتویں دَر کی خوفناک آوازیں اُسے حقیقی منزل سے بھٹکا دیتی ہیں۔ یہی حقیقت پسندی اور اصلیت خطوط کو آفاقی رنگ بخشتی ہے۔ اِس لئے کہ یہ بہت سے لوگوں کے عہد کی حقیقی داستان بھی ہیں اور ایک شخص کے اندر چُھپے بے شمار عہد بھی، کیونکہ انسان تہہ در تہہ اپنے اندر کئی صدیوں کو سمیٹے ہوتا ہے۔ خطوط انہی دبیز تہوں کو کھول کر اصلی جیتے جاگتے، خیر و شر کے مجسمہ کو ہمارے سامنے سچّے اور سُچے رنگوں کے ساتھ منظرِ عام پر لے آتے ہیں

۳۔ تعارف "گویا دبستان کھل گیا" چوہدری محمد علی ردولوی ص ۱۴، اُردو اکیڈمی سندھ ۱۹۷۰ء

ٹُوٹتی ہوئی تہذیب کا یہ اُجڑتا ہُوا ورثہ ابھی بھی عظمت و ادبیت کی دلیل تھا۔ غلام امام شہیدؔ، غلام غوث بے خبرؔ، قتیلؔ، اور جن ادیبوں کے خطوط کتابی صورت میں موجود ہیں، وہ خطوط نہیں اُلجھا ہوا خارزار بنتا جنگل ہیں۔ یہ خطوط پُراسرار مُبہمات ہیں جنہیں سَر کرنا خاصا کٹھن و دشوار ہے یہ نہ تو ہمارے ذوق و احساس کی تسکین کرتے ہیں، نہ دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی ہیں نہ ہی سانسوں میں گرمی پیدا ہوتی ہے، بلکہ ثقالت و تھکاوٹ کا احساس رہتا ہے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا اُردو زبان کی طرف آتا بھی تو پُر تکلّف، بوجھل انداز، لمبے لمبے القاب و آداب، بہت سی تمہیدی باتیں محض زبان کے چٹخارے کے لیے لکھی جاتیں۔ مقفیٰ، مسجع، اور شاعرانہ زبان استعمال ہوتی چنانچہ اُردو مکتوب نویسی غالبؔ سے پہلے تک ویران و بے آباد رہی۔

اس دُنیا کو آباد کرنے اور اس پُرسکون ساکن جھیل میں پہلا کنکر غالبؔ نے پھینکا۔ مصنوعی چمکتی ہوئی روشنیوں سے ہٹ کر اُس نے زندگی کو تنہائی کے اندھیارے، اُجاڑ سنّاٹوں میں محسوس کیا، اور پہلی بار زندگی کو برت کے دیکھا۔ اُس نے اپنے خطوط میں اپنی "فگار انگلیوں سے خامۂ خونچکاں" کی وہ سچی حکایت بیان کی ہے کہ گردشِ مدام میں وہ پتھر، پیالہ و ساغر نہیں بلکہ کانٹوں بھرے، پتھریلے، ناہموار راستوں پہ ایک جیتا جاگتا، سانس لیتا، چلتا پھرتا انسان دکھائی دیتا ہے۔ ایک ایسا سچّا انسان جو ایک طرف ہجرتوں کے ورثے کی وہ داستان سُناتا ہے کہ آنکھوں سے "جُوئے خون" بہنے لگتی ہے۔ تو دوسری طرف سینے پہ ڈھیروں زخم کھانے کے باوجود یہ جیالا فن کا جھوٹی ہنسی یوں ہنستا ہے کہ اُس کی مسکراہٹوں کے رنگ رنگ ہمارے اندر بھی رنگ برنگی پھل جھڑیاں سی چلنے لگی ہیں۔ اُس کی طبیعت میں ظرافت کے یہ سُر جہاں اُس کی ذاتی و شخصی زندگی کو بے نقاب کرتے ہیں۔ وہاں اُس کے خطوط دلی اُجڑنے کا وہ مرثیہ ہیں کہ نم پلکیں، ساکت حسرت بھری نظریں، چُپ چاپ اپنے گھر پہ غیر کے اقتدار کا عَلم لہراتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔ غالبؔ نے نہ صرف اپنی ذات کو نشانۂ تمسخر بنایا ہے بلکہ اپنے خالق، اُس کی تخلیقات، زندگی، کائنات، جنّت، دوزخ

سب کا مذاق اُڑایا ہے۔ فطری و نیچرل رویّہ ہونے کی وجہ سے واعظ، زاہد اور ناصح سے ہٹ کر رند، ساقی، مے کشی میں کشش محسوس کی ہے۔ وہ تنہائی میں خطوں کے بھروسے بیٹھا ہے۔ دوست و احباب کی ہنستی، مسکراتی محفلیں جو اُجڑ کر مُردہ ہو چکی ہیں اُنہیں محبت کے خوب صورت لفظوں سے دوبارہ زندہ کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے خطوط میں بے تکلّفی، بے ریائی محبت و مروّت ہے۔ تصنّع و بناوٹ کا شائبہ تک نہیں۔ اُس کے لفظ لفظ میں خلوص اور فقرے فقرے میں محبت کی طویل داستان پنہاں ہے۔ یہ مکاتیب سراسر آمد" ہیں جن کا "آورد" سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ غالبؔ نے اپنی زندگی کے تمام رازوں اور حقیقتوں میں ہمیں اپنا دوست سمجھ کر شریک کیا ہے۔ تعزیت ہو یا وقتِ نشاط و شادمانی، غربت و افلاس کی تنگی ہو یا ازدواجی اُلجھن، شراب کی مستی و جُوا خانہ ہو یا کلام و تصانیف پہ سنجیدہ اِصلاحیں غالبؔ نے سب کچھ بلا تکلّف، برملا اور صاف صاف لکھا ہے۔ اور اُس پُرانی پُراسرار، کٹھن مُبہم کو ترک کر کے مکتوب نویسی میں عام گفتگو کا خلوص، محبت، شیرینی اور بے تکلّفی کو پیدا کیا ہے۔ روایت سے اِس بغاوت نے نہ صرف خطوط کو ایک نیا، مُنفرد انداز دیا بلکہ ہر شخص کے لیے دل کشی و توجہ کا سامان بہم پہنچایا۔ خلوص و محبت کے اِس عظیم معبد میں، ہر حساس فرد یہ خواہش دل کے کعبہ میں سجدہ ریز پاتا ہے کہ کاش وہ غالبؔ کا دوست ہوتا اور وہ اُسے بھی خط لکھتا۔ یہ عظمت، یہ آفاقیت شاید ہی کسی مکتوب نگار کا مقدّر ہو۔

غالبؔ کے بعد خطوط نویسی کی یہ عظیم الشّان روایت دھیرے دھیرے نثر کے عہدِ زرّیں تک اپنا سفر طے کرتی رہی۔ مکاتیب کی دُنیا کو جگمگانے والے، جھلملاتے ہوئے یہ درخشاں ستارے سرسیّد، حالیؔ، شبلیؔ، اور مہدی افادی ہیں۔ نذیر احمد نے بھی خطوط لکھے لیکن یہ صرف باپ کے ناطے بیٹے کے نام لکھے گئے ہیں جن کے ذریعے اُس کی تربیت و اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔

سرسیّد ادیب و فن کار سے زیادہ مُصلح اور معلّم اخلاق بننا زیادہ پسند کرتے ہیں اُن کی

طبیعت میں قومی ہمدردی اور قوم کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہُوا ہے۔ اُن کے دل میں دردمندی اور خلوص ہے۔ چنانچہ خطوط میں ایک ہی رنگ، ایک ہی احساس اور ایک ہی جذبہ ہے۔ نہ ذاتی آشائیں اور تمنائیں ہیں کہ ہم آس نراس کے پُل صراط سے گذرتے ہوئے دل کی دھک دھک کو محسوس کر سکیں۔ اور نہ ہی شخصی جذبہ، تلخ زندگی سے فرار، اور رومانیت کی فطری ادا کہ ہم شعور اور لاشعور سے اُٹھنے والے طوفانوں کی جنگ کا نظارہ کر سکیں۔ مکاتیبِ سرسیّد کی اہم خصوصیت سادگی و بے تکلّفانہ اندازِ تحریر ہے جو بات سرسیّد کے دل میں ہوتی ہے وہی نوکِ قلم پر بھی آجاتی ہے۔

حالؔی کے خطوط، سرسیّد سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ حالؔی انسانی ہمدردی اور پریم کے رس سے سینچا گیا، حسّاس فن کار، جس کا شریف، مہذب، پاکیزہ و متین دل اُس کے خطوں میں لپٹا ہُوا ہے۔ مگر شخصی زندگی، جذبوں اور حسرتوں کے عام برزخ سے ان کے مکاتیب خاصے دور ہیں۔ خطوط میں سادگی و بے تکلّفی کے ساتھ ساتھ بے پناہ خلوص و ہمدردی ہے عاجزی و انکساری جو حالؔی کی طبیعت کا خاصہ تھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

شبلؔی کے خطوط، سرسیّد اور حالؔی کے مقابلہ میں بہتر اور دلچسپ ہیں۔ اس لیے کہ ان میں ایک فطری رویہ موجود ہے۔ جو اُن کی شخصیت، جذباتی رو اور ذہن میں ہر لحظہ ڈیرا جمائے خواہشات پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان مکاتیب میں جہاں قوم اور مذہب سے محبت کا شدید جذبہ ہے وہاں ذہن و دل کا ایک الگ نگار خانہ بھی ملتا ہے جو متحرک و سرشار ہے تو عطیہ فیضی کے نام اور زہرا بانو سے۔ یہاں محبت کے ولولے اور راز و نیاز کی سرگوشیوں کا لطف ملتا ہے۔ یوں شبلؔی عام انسانوں کی طرح جذبات کی شدید رو میں بہتے چلے جاتے ہیں مکاتیبِ شبلؔی میں غالبؔ کے خطوط کی سی شگفتگی ہے۔ شبلؔی کے خطوط میں اختصار، جامعیت اور سادگی ہے۔ بے تکلّف، پُرخلوص، سچّا اور دلچسپ انداز ملتا ہے۔ کہیں کہیں چوٹ اور طنزیہ رویّہ بھی موجود ہے۔

صاحبِ طرز انشاپرداز مہدؔی افادی کے خطوط میں رنگینی، رعنائی خیال، نفاست و لطافت ملتی ہے۔ ان خطوط میں خلوص کی خوشبو بھی ہے اور جذبہ کی خوشنمائی بھی۔ جدت و ندرت بھی ہے اور شوخی و شگفتگی بھی۔ یہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ زندہ دلی ان خطوط کی روح ہے۔ ان مکاتیب میں سادگی بھی ہے اور انشاپردازی کا بانکپن بھی۔ اپنی شگفتگی، رنگینی و ادبیت کی وجہ سے مکاتیبِ مہدی ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

اقبالؔ کے خطوط اُن کی فکر، سوچ، خیال و نظریات کا آئینہ ہیں۔ ان خطوط میں اُن کے مشاغل اور مصروفیات کا حال بھی ہے اور علمی و ادبی مباحث بھی۔ خطوط میں سادگی ہے جو اُن کی فطرت کی غماز ہے۔ زندگی کی معلومات اور شخصیت کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ لیکن خطوط میں شوخی و شگفتگی کم ہے۔ حالاں کہ اقبالؔ خاصے زندہ دل انسان تھے۔ سُلجھا اور سنبھلا ہُوا انداز ملتا ہے۔

مکاتیب کی دُنیا میں مولانا ابوالکلام آزاد کو کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی، سیّد سلیمان ندوی، اور رشید احمد صدیقی کے خطوط بھی بہت پُرکشش ہیں ان کے مکاتیب علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی، تاریخی، اور فلسفیانہ مباحث سے تعلق رکھتے ہیں خطوط کے آئینہ میں اُن کی شخصیت انفرادیت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ یہ ہمیں انفرادیت، انانیت ذوقِ طبع، عقائد و نظریات، اخلاق و عادات اور نفسیات کے بارے میں معلومات دیتے ہیں۔ یہ خطوط بذاتِ خود مقالہ بھی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ زندگی کی سچّی تصویروں کے ساتھ ساتھ زبان کی لطافتیں اور بیان کی شگفتگی بھی موجود ہے۔

یوں نیاز فتح پوری کو خطوط نویسی کی مسلّمہ و مضبوط فنّی روایت ملی۔ جس نے لمحوں کے سراوں میں ٹوٹے رابطوں کا سلسلہ یوں جوڑنا شروع کیا کہ غم گساری، خلوص اور مہر و وفا کے پھول اپنی لازوال خوشبو سے ادبِ اُردو کے چمن کو مزید خوشگواری اور طراوت بخشنے لگے۔ محبت کے عہد کو معتبر رکھنا، بھول جانے والوں سے شکوہ، وفا کی راہ میں لٹنے کی بجائے اعتبار کی دولت کو سنبھال کے رکھنا، دل کی سُونی بستی کی اُداسیاں، شکستِ دل کے ہنر کی داستانیں، تنہائی

میں دیواروں سے باتیں کرنا، مسرت کی ساعتوں میں لفظوں کی زنجیر ڈال کر، نیم وا دریچوں میں انتظار کا موسم ٹھہرا لینا، نیاز کا فن ٹھہرا۔ گویا خطوط نویسی انسان کے اندر بستی کائنات کے ہر موسم، ہر رُت اور ہر فضا کا سچا صادق صحیفہ بن چکی تھی کہ جس پہ بدلتی رُتوں کی اکثر تصانیف کو قربان کیا جا سکتا تھا۔ نیاز نے اپنی زندگی میں سینکڑوں لوگوں کو خطوط لکھے۔ یہ خطوط مکتوباتِ نیاز کے نام سے تین جلدوں میں چھپ چکے ہیں۔ پہلی جلد ۲۴۰ صفحات پر مشتمل جس میں ۲۱۹ خطوط ہیں ۱۹۲۹ء میں دوسری جلد ۳۲۷ صفحات پر مشتمل ۳۰۰ خطوط ۱۹۴۳ء میں اور تیسری جلد ۱۸۴ صفحات، خطوط کی تعداد ۱۴۵، ۱۹۴۰ء میں منظرِ عام پہ آئی۔ تینوں جلدیں نگار بک ایجنسی لکھنؤ کی جانب سے شائع ہوئیں یہ خطوط اوّل اوّل "نگار" میں بہ عنوان "حضرتِ نیاز کے چند خطوط" چھپنے شروع ہوئے[1] پھر عنوان "مکتوباتِ نیاز" ہو گیا[2]۔ یہ سلسلہ اگست ۱۹۴۷ء تک چلتا رہا۔ بعض پرچوں میں تنگیٔ داماں کی وجہ سے خطوط شائع نہیں ہو سکے۔

نیاز کے خطوط میں وہ تمام فنی خوبیاں و خصائص موجود ہیں جو اچھے، مستند اور دلچسپ خطوط میں ہونا چاہئیں۔ رشید احمد صدیقی نے اچھے مستند، اور دلچسپ خطوط کی بابت بڑی خوب صورت بات کہی ہے۔

"میرے نزدیک سب سے دلچسپ اور مستند خطوط وہ ہوتے ہیں جو تلف کر دیے جائیں۔ یا منظرِ عام پر نہ آئیں۔ اس لئے حقیقتاً میں ایسے خطوط کا قائل نہیں ہوں جو شائع کیے جائیں۔ چہ جائیکہ ان پر مقدمہ لکھا جائے اور ان کی تشریح و تحلیل کی جائے۔ اس اعتبار سے نیاز صاحب اور میں دونوں قصوروار ہیں۔ لیکن اکثر یہی چیز پبلک کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ گو میں

[1] نگار، مارچ ۱۹۳۳ء، جلد ۲۳ شمارہ ۳
[2] ۔ مئی ۱۹۳۳ء جلد ۲۳ شمارہ ۵

یہ سمجھتا ہوں کہ نیاز صاحب یا میں خودکشی کر لوں یا ان میں سے کوئی سنگسار کیا جائے تو پبلک کی دلچسپی کئی گونا بڑھ جائے گی[1]۔"

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نیاز کے خطوط اچھے، مستند اور دلچسپ ہیں کیونکہ نہ تو ان پر مقدمہ ملتا ہے، اور نہ ہی کسی قسم کی تشریح و تحلیل۔ نیاز کے ذہن کو اپنی "نئی باغی" آواز کی وجہ سے زندگی میں کئی بار مخالفین کے ہاتھوں سنگسار ہونا پڑا۔ اُن کے دل اور احساس نے مصائب و کرب میں کئی بار خودکشی کی۔ ذہن ٹوٹا، دل خون ہوا۔ تو فن کی نئی، مضبوط اور دل کش دُنیا نے جنم لیا۔ تشریح تحلیل کا تو یہ عالم کہ نہ مکتوب الیہ کا نام، نہ پتا، نہ تاریخ، نہ وقت، نہ مقام، شاید اسی وجہ سے بعض ناقدین نے یہ خطوط فرضی قرار دیے ہیں۔ حالانکہ حقیقت ایسی نہیں۔ اس حوالے سے آگے چل کر بحث ہو گی۔ یہاں ہم نیاز کے خطوط کا تجزیہ کرتے ہوئے فنی اوصاف و خصائص کا احاطہ کریں گے

مکتوب نویسی میں سب سے پہلی چیز "القاب و آداب" میں کیونکہ بے شمار لپکتی ہوئی آوازوں کے سائے میں، لفظوں کے خوب صورت گھر میں اُتر کر، ہم مکتوب نگار کے خلوص و محبت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ نیاز غالب کی طرح القاب و آداب سے بے نیاز ہیں۔ مکاتیب اُن کے خیال میں ذر ہیں، سقراط ہیں، منصور ہیں۔ چنانچہ سچائی و صداقت کی جگمگاتی شمع اُن کے ہاتھ میں ہے اوّل تو وہ القاب و آداب لکھتے ہی نہیں۔ لکھیں تو طرزِ تخاطب کے انداز میں۔ بڑی بے تکلفی سے کبھی "عزیزم"، کبھی "عزیز من"، "گرامی عزیز"، کبھی "جان نیاز" کبھی "مخلص نواز"، کبھی "محترم" یا "محترمہ" سے مخاطب کرتے ہیں۔ کبھی مکتوب الیہ کا نام لکھ کر فوراً ہی اظہارِ مدعا کرنے لگتے ہیں۔ رسمی، پُرتکلف اور لمبے چوڑے القاب و آداب سے اُنہیں سخت چڑ تھی۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"خدا جانے وہ کون تھا جس نے یہ رسم ڈالی کہ کسی کو خط لکھو تو ابتدا القاب و آداب سے کرو۔ تمہیں بتاؤ کہ تم کو کیا لکھوں؟ مجھ سے بڑے ہوتے تو

[1] مکتوباتِ نیاز پر اظہارِ خیال، نگار جولائی ۱۹۴۰ء، ص ۱۹ جلد ۳۷ شمارہ ۱

"معمولی آدمی" اپنی شخصیت پہ دبیز پردے ڈالے ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے ہم اُس کی ذاتی و اصلی شخصیت کو خطوط میں نہیں ڈھونڈھ سکتے حالانکہ انسان کے خطوط سے اُس کی رُوح عُریاں ہو جاتی ہے۔ اور یہ زندگی کی خالص آواز اور دل کی سچّی داستان ہیں۔ اور اسی شخصیت کی تصویر کشی میں اُن کا حُسن مضمر ہے، کہ لکھنے والا اپنی ذاتی و شخصی چیز سمجھتے ہوئے اپنی زندگی کا ہر ہر پہلو بے نقاب کر دیتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ یہ دوست میری ہی ذات کا حصّہ ہیں، اور محبت کے اُن جزیروں میں بستے ہیں جو بے نام نہیں بلکہ میرے ہی نام کی تختی سجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خطوط سب کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنتے ہیں۔ "مکتوباتِ نیاز" میں یہ انداز نہیں ملتا۔ ہم متلاشی اکھیّاں اور ذہن لئے نیاز کی تلاش میں نکلتے ہیں، مگر ہمارے ہاتھ خالی رہتے ہیں۔ ان خالی ہاتھوں میں فن کے ارض و سما تو آجاتے ہیں لیکن نیاز کا حقیقی و اصلی رُوپ سراب بن جاتا ہے۔ وہ جتنا اپنی ذات سے پردہ سرکاتے ہیں، ہم اتنا ہی جلوہ دیکھ پاتے ہیں۔ چاہیں بھی تو شخصیت کی پوری جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، سانس لیتی تصویر ہمارے سامنے نہیں آتی۔ بقول ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی :۔

> " وہ خضر کی طرح بہت سی شرطیں لگاتے ہیں۔ جو ہمیں قبول نہیں ہوتیں۔ وہ شوق تو پیدا کرتے ہیں لیکن رخصتِ نظر نہیں دیتے۔ وہ خود نمائی اور خود پرستی کے درمیان جھولتے رہتے ہیں۔ ہم اگر چاہیں کہ اُن کی شخصیت کو دیکھ لیں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ صرف اُن گوشوں کی نمائش روا رکھتے ہیں جن کی نمائش وہ چاہتے ہیں کہ ہو۔ اُن کی شخصیت پر اس قدر دبیز اور تہ بہ تہ نقاب پڑے ہوئے ہیں کہ محرومیاں سرٹپک ٹپک رہ جاتی ہیں لیکن ان کی بزمِ وصال میں ایک نگاہ سے زیادہ نظارہ میسّر نہیں آتا[۱]"

۱؎۔ نیاز فتح پوری، مکتوبات کے آئینے میں "نگار" نیاز نمبر جلد اوّل ص ۲۴۵، مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اِس خامی کا واقعی احساس ہوتا ہے۔ اور یہ اُس طبقہ کے اعتراض کو یقیناً مضبوط کرتا ہے جو مکتوباتِ نیاز" کو فرضی سمجھتے ہیں، کہ شعوری طور پر پہلے "نگار" میں شائع کیا گیا، پھر کتابی صورت میں سامنے آئے۔ اِس کے باوجود ان خطوط میں سچّے جذبات و احساسات کا اظہار ہوا ہے۔ محبت کے غلیظ اُلجھے اُلجھے تجربہ نے اِن میں جذبات کی شدت، اثر آفرینی اور نزاکتِ احساس کو یُوں شامل کیا ہے کہ مشترک دُکھ، جُدا حوصلوں کے ساتھ کہیں نیاز بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں، تو کہیں مُسکرا دیتے ہیں کہ مُسکراہٹ دُکھ کی خوب صورت نقاب ہے۔ نیاز نے خطوط کو جی سے لکھا ہے اور دل سے لکھا ہے۔ چنانچہ جذبہ کی شدت کا پیدا ہو جانا لاشعوری اور لازمی اَمر ہے۔ یہی جذبہ جو فطری و وہبی ہے اور سچّے و لافانی ادب کی اوّلین شرط بھی۔ نیاز کے ہاں جذبات مصنوعی نہیں۔ جذبوں کی یہ پاکیزہ شبنم رم جھم رم جھم ہمارے احساس پہ یُوں گرتی ہے کہ نیاز کے مخاطب، ہمارے دل پر اسی گرتی شبنم کی طرح قطرہ قطرہ رقم ہوتے جاتے ہیں کہ اُن کے نام اور نیاز کے لفظ مٹائے نہیں مٹتے۔ اُنہیں اِس بات کا بھی احساس ہے کہ تھوڑا خلوص خطرناک اور زیادہ جان لیوا ہوتا ہے۔ مگر وہ دوستوں پہ جان دیتے ہیں، اِس طرح کہ دل کی دیوار نہ گرنے پائے۔ پاسِ ناموسِ عشق کے باوجود کتنے ہی آنسو پلکوں پہ آجاتے ہیں :۔

> " میں سمجھتا ہوں تم نے مجھے آہستہ آہستہ ذبح کرنا چاہا اِس طرح کہ حلق پر چھُری بھی چل رہی ہے۔ تم مجھے مُسکرا مُسکرا کے تسلیاں بھی دیتی جاتی ہو۔ اور مَیں بے خبر ہوں۔ یہاں تک کہ تمہارا ہاتھ شہ رگ تک پہنچ جاتا ہے یعنی تمہارا خط ختم ہو جاتا ہے۔ اِس حکم کے ساتھ کہ آئندہ تمہیں کوئی خط نہ بھیجوں ــــ اور ــــ مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے کوئی نہایت بیش قیمت چینی کی قاب ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ تسکین کے الفاظ بھی تم تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیا کروں مجبور ہوں۔ اچھا تو اَب مَیں بھی اپنی تسکین کی

چیزیں اپنے سے جُدا کیئے دیتا ہوں۔ اور تمہاری تمام تحریریں جن کو مَیں نے اِس وقت حرزِ جاں بنا کر رکھا تھا، نذرِ آتش کیئے دیتا ہوں
اے عزت و شرافت کی دیوی – میری یہ قُربانی قبول کرے[۱]۔"

نیازؔ کا صرف یہی ایک خط اُن کی جذباتی و رُومانی زندگی کو سمجھنے کے لئے کافی ہے اُن کے اندر محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ محبت خدا بھی ہے اور اِن کا مذہب بھی۔ ہر فنکار کی طرح نیازؔ بھی اِنتہا پسند ہیں۔ دوست اُن کے دِل میں بستے ہیں مگر خانوں میں بٹے ہوئے ہر شخص کا مقام و مرتبہ الگ ہے۔ کچھ اُن کی رگوں میں دوڑنے والے خون اور دل کی دھڑکن ہیں۔ نیازؔ کی سانسیں اُنہی سے وابستہ ہیں کہ اپنے آپ کو تو بھول سکتے ہیں مگر اُنہیں بُھلانا ان کے بس میں نہیں:-

"مرزا جی[۲] ــــ آپ کا خط کا پڑھ کر سخت تکلیف ہوئی۔ خدا کو بھول سکتا ہوں۔ قرآن و حدیث کو بھول سکتا ہوں۔ بیوی بچوں کو بھول سکتا ہوں لیکن آپ کو بُھلا دینا میرے امکان میں نہیں۔ اگر میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں اور اِس کا ریشہ ریشہ علیٰحدہ کر دیا جائے تو بھی اِسی سے "یا غفارؔ بخشی" کی آواز نکلے گی[۳]۔"

نیازؔ کی چاہت محض رسمی نہیں۔ وہ جی سنبھالنے اور دم نکال دینے کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ ان پُر خلوص سچے جذبات کا اظہار اُن کے خطوط میں ہُوا ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق سے مقابلہ کرتے کرتے کبھی تھکاوٹ کا احساس ہو تو وہ سُستانے کی خاطر فرار کا راستہ اختیار

۱؎: انشائے لطیف نمبر ص ۲۰، ۲۱، مرتبہ عائشہ خان
۲؎: مکتوب الیہ کا نام مرزا عبدالغفار بیگ ہے۔
۳؎: مکتوباتِ نیازؔ ج اوّل ص ۶۲۔

کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں رُومانیت اور عورت کی گود اُن کا معبد ہے۔ عورت نیازؔ کے خیال میں محبت کی دیوی، فرشتوں اور حوروں سے زیادہ پاکیزہ، مکمل حُسن کا مجسّمہ نُور کی کرن ایک عظیم راز اور کائنات میں سب سے زیادہ قابلِ احترام ہستی ہے۔ اِس کا اظہار اُن کے افسانوں میں تو ہُوا ہی ہے مکتوبات میں جابجا اِس حقیقت کو پیش کرتے ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ عورت اِنتہائی گناہ گار ہونے کے باوجود رابعہ بصری سے زیادہ معصوم ہے۔ وہ اِس سلسلہ میں خالصے جذباتی ہیں۔ اور اُن کے ایسے خطوط، افسانہ و ناول سے زیادہ خوب صورت و دل کش ہیں:-

"آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کبھی کوئی روشن ستارہ ٹوٹ کر غائب ہو جاتا ہے۔ تو آنکھوں کے سامنے تھوڑی دیر کے لئے عجیب قسم کا اندھیرا چھا جاتا ہے بالکل یہی حالت آپ کی پُرستش گاہ کا قصے بھی ہوتی ہے۔ جس وقت آپ کا خط آتا ہے تو ساری دُنیا مجھے روشن نظر آنے لگتی ہے۔ اور جب آپ سکوت اختیار کر لیتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام تابناکیاں آپ نے کھینچ کر اپنی مُٹھی میں بند کر لی ہیں ــــ اب سے چھ مہینے قبل آپ نے مسلسل کئی خطوں سے مجھ پر "بارشِ لطف و کرم" شروع کی تو مَیں اُس کی لذت میں اِتنا کھو گیا کہ "خشک سالی" کا خیال تک ذہن میں نہ آیا[۴]۔"

اِسی شعریت، اِحساس کی شدت، نزاکتِ خیال کی وجہ سے نیازؔ کے مکتوبات ادبِ لطیف کا شاہکار کہے جاتے ہیں۔ تخئیل کی بلندی اور خلوص کی گرمی نے اِن خطوں کو شعر و نغمہ سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ نیازؔ نے اپنی زندگی کے ہر راز میں اپنے

۴؎: مکتوباتِ نیازؔ، جلد سوم ص ۸۱، بار اوّل ۱۹۴۸ء، نگار بک ایجنسی لکھنؤ

دوستوں کو شامل کیا ہے لیکن اِس کے باوجود وہ دِل کی بہت سی باتیں سُن لیتے ہیں انہیں پردہ داری منظور ہے اور اِس کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں یہی حُسن ہے اور یہی فن، بقول ڈاکٹر سیّد عابد حسین:-

جسے پردہ داری منظور ہے اور اِس کا سلیقہ بھی رکھتا ہے۔ وہ خطوں کو بھی اپنی تحریروں کی طرح اخفائے حقیقت کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ بلکہ اکثر یہ ذریعہ اور ذرائع سے زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے اِس لئے کہ لکھنے والا پُرتکلّف سادگی اور ساختہ، بے ساختہ پن کے پردے میں بات کو اِس طرح چھپاتا ہے کہ پڑھنے والے کو شُبہ بھی نہیں ہوتا کہ اِس سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔[۱]"

"صاف چھُپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کا یہ دِل فریب انداز نیازؔ کے خطوط کا فطری حُسن ہے۔ وہ تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے نہیں جیتے بلکہ اُن کے اور بھی شاغل ہیں۔ اِس کے باوجود دوست، احباب کو اپنی ذات کا ایک اہم حصّہ ضرور جانتے ہیں اِسی اہمیت اور ضرورت کے تحت اُنہوں نے مختلف لوگوں کو وقتاً فوقتاً خطوط لکھے ہیں۔ وہ خط لکھنے کے معاملے میں بڑے احتیاط پسند ہیں۔ شکوہ و شکایت کا موقع نہیں دیتے۔ لیکن اگر زیادتی دوسری طرف سے ہو تو معاف کرنے کے ساتھ ساتھ بچّوں کی معصومیت سے روٹھتے اور مَنتے بھی نظر آتے ہیں۔ اِن کی ناراضگی میں محبوب کا سا ناز و انداز ہے۔ روٹھنے کی یہ خوب صورت ادا دہیں دکھائی جاتی ہے جہاں محبت و خلوص کی انتہا، بے تکلّفی اور دوسرے پہ اندھا اعتماد ہو۔ اِن کی ناراضگی میں بھی شوخی و دلبری ہے۔ یہ شوخی و دِل بری یونہی پیدا نہیں ہو جاتی بلکہ ایک دوسرے کے ذہن کو اچھّی طرح سمجھنے و سمجھانے سے پیدا ہوگی۔ نیازؔ مکتوب الیہم کے ذہن کو سمجھتے ہیں اور خوب سمجھتے

[۱] اُردو خطوط۔ تعارف ص ۲ کتابی دُنیا لمیٹڈ دہلی۔

ہیں۔ ذہن انسانی اور نفسیات کا گہرا مشاہدہ دوستی میں پُختگی پیدا کرتا ہے۔ یہ رشتہ کچّا دھاگہ نہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ٹوٹ جائے۔ نیازؔ کو اِس بات کا شدید احساس ہے اِس لئے ناراضگی میں بھی ایک اعتماد و شوخی ہے:-

"سنو جی تم کو معلوم ہونا چاہئیے کہ تم سے خفا ہوں اور جب کوئی کسی سے خفا ہو تو بات نہیں کیا کرتا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ تم بے تاب ہو گئے لیکن ہُوا کرو، میری بلا سے نہ میرے پاس اِتنا وقت کہ وہاں جا کر تمہارا پیام کہوں اور نہ شاید اُنہیں اِتنی فرصت کہ اطمینان سے سُنیں — مَیں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ مَیں خفا کیوں ہوں اور تم سے باتیں بھی کرنے لگا۔ لاحول ولاقوۃ۔[۱]"

دوست، نیازؔ کا عظیم سہارا اور قیمتی سرمایہ ہیں، جو دِل کی بستی میں بستے ہیں، اُن کا خلوص نیازؔ کی جان و رُوح ہے۔ اُن کی زندگی دوستوں سے ملاقاتوں پہ اساس رکھتی ہے۔ جو ملاقاتیں بالمشافہ ہوں یا خطوط میں کوئی بے نیازی و بے اعتنائی برتتے تو بڑے خلوص، وقار اور اعتماد سے شکوہ و شکایت بھی کرتے ہیں۔ جو شکوہ و شکایت کم اور محبت کا اظہار زیادہ ہے۔

"ظالم، خدا سمجھے!
جی چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر کسی طرف کو نکل جاؤں اور جتنی گالیاں دُنیا میں وضع ہوئی ہیں۔ وہ سب تم پر صَرف کر دوں۔ غضب خدا کا تم یہاں آؤ، دو دن تک قیام کرو اور مجھے خبر تک نہ ہو۔ تمہارے پاؤں میں مہندی لگی تھی تو آدمی کو بھیج دیا ہوتا۔ کارڈ لکھ دیا ہوتا۔ اور کچھ نہیں تو اپنے میزبان سے کہہ دیا ہوتا وہ مجھے بُلا لیتے۔ یہ آخر کیا انداز تھا؟ کس نوع کی سفّاکی تھی؟ بیرحمی کی کون سی قسم تھی؟ ناآشنائی و بے مروّتی کی کون

[۱]، [۲] مکتوباتِ نیاز جلد دوم ص ۴۔ "نگار" مارچ ۱۹۳۶ء، ص ۴۷، جلد ۲۹ شمارہ ۲

سی اداتھی ! مَیں بھی تو سُنوں ۔"[1]

یہ محبت، یہ خلوص، خوشبو کے سفر میں مہکتے ہوئے زخموں کے یہ پھول کتنے عزیز ہیں کہ کسی دست کو خواب ہوتا دیکھنا نہیں چاہتے۔ شکایت اور چاہ کا یہ دلکش انداز کہ مخاطب احساسِ برتری سے خدا ہو جائے۔ کسی خوش نصیب کا مقدّر ہی ہو سکتا ہے۔ یہ انداز اُسی وقت پیدا ہوگا جب چاہت کی تمام تر منزلوں سے گزر کر جسم و جاں ایک اور اَمر ہو جاتے ہیں۔ ہمزاد کی خوشیاں اور غم سب اپنے محسوس ہوتے ہیں۔ یُوں نیاز گرفتہ دِل بزم سجاتے ہیں اور اُن کی کوئی شام یادِ جاناں سے خالی نہیں جاتی۔ نیاز جانِ انجمن ہیں۔ دِل دُکھاتے بھی ہیں اور دُکھے دلوں پہ مرہم رکھتے ہیں۔ لیکن جب کوئی بات مزاج و شائستگی کے خلاف دیکھیں تو سنجیدگی سے ناراضگی کا انداز عیاں ہے نازو ادا اپنی جگہ اور برہمی و غصّہ الگ۔ عورت جو اُن کے خیال میں شبنم سے زیادہ پاکیزہ، پھول سے زیادہ نازک ہے۔ جب ایک دوست نے قابلِ احترام رشتہ، بیوی پر ہاتھ اُٹھایا تو سخت ناراض ہوئے۔ برہمی اور طنز کی تلخی ملاحظہ ہو:۔

"ادھر آؤ ویلوں بلائیں تمہاری
خدا کی قسم کیا کام کیا ہے۔ رُستم و اسفندیار کی رُوحیں کانپ اُٹھی ہوں گی سکندر و نپولین کی قبروں پر لرزہ طاری ہو گیا ہو گا ——— بُزدل ہیں جو اپنے سے قوی کو ٹوکتے ہیں۔ نامرد ہیں جو زبردست دشمن کے ساتھ معرکہ آرا ہوتے ہیں۔ بہادری نام ہے صرف کمزور کو ستانے کا، ضعیف کو پامال کر دینے کا۔ پھر ظاہر ہے بیوی سے زیادہ کمزور ہستی تمہیں اپنی شجاعت دِکھانے کے لئے کہاں مل سکتی ہے۔ مجھے تم سے نفرت نہیں بلکہ عداوت پیدا ہو گئی ہے۔ اور مَیں نے عہد کر لیا ہے کہ جس طرح ممکن ہوگا تم سے

۱؎ ۔ مکتوبات نیاز ج اوّل ص ۶۶

اِس غریب آزاری کا اِنتقام لئے بغیر نہ رہوں گا تبت یدا ابی لہب"[1]

طنز کا یہ تیکھا پن، زہرناکی، اور برہمی جو معاشرتی اصلاح کا رویّہ رکھے ہے یقیناً لائقِ صد افتخار ہے۔ عورت کا احترام اور اُس سے محبت کا یہ انداز قابلِ داد ہے۔ یہ انداز ہمیں اُردو مکتوبات میں شاید ہی کہیں ملے۔ نیاز ایک خاص تہذیبی رویّہ کے قائل تھے اور معاشرہ کو اُسی سمت موڑ کر اُسے صحت مند بنانا چاہتے تھے۔ وہ زہر کا تریاق زہر سے نہیں محبت سے کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے خیال میں محبت اور سچائی ہر طرح کے زہر اور زخم کا شافی علاج ہے، کہ گھور اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔ رِستے ناسور تھم جاتے ہیں۔ اور بنجری پُرنور کر زمیں معاشرہ کو جگمگا دیتی ہیں۔ مگر بقول نیاز ضروری ہے ہر شئے کے آداب مقرر کئے جائیں۔ خواہ دشمنی ہو یا دوستی، دوست تو خیر ایک طرف، دشمن سے بھی اِنتقام لینا ہو تو ایک خاص مہذب انداز میں۔[2]

نیاز محبت و عداوت دونوں میں دیوانہ ہیں۔ نہ دوست کی شکایت سُننا پسند کرتے ہیں اور نہ عدو کی تعریف۔ بہت انتہا پسند ہیں۔ محبت کرتے ہیں تو ٹوٹ کے، نفرت کرتے ہیں تو کُھل کے۔ کیونکہ اعتدال کے رویّے منافقت کے رویّے ہیں، جس سے اُنہیں سخت چڑ تھی۔ جو کہتے صاف اور برملا کہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ملحد، کافر اور دہریہ جیسے خطاب اُن کے حصّے میں آئے۔ مگر مخالف سمت چلتی ہوئی یہ طوفانی آندھیاں اُنہیں اُن کے نصب العین اور منزل سے نہ بھٹکا سکیں۔ "مشکلاتِ غالب" لکھنے کے باوجود غالب کی شاعرانہ عظمت سے بہت متاثر ہیں۔ ویسے تو ہر صحت مند، ذہین اِنسان کی طرح اُن کی اپنی طبیعت میں خود سے شوخی تھی مگر وہ غالب کی ظرافت سے خاصے متاثر ہیں۔ عُمر بھر بہت سے مصائب و مشکلات کا شکار رہے۔ اُن کے بدن پہ شکستوں کا جال ہے۔ بے شمار سانحوں نے اُن کے دِل میں اُداسیاں اور آنکھوں میں ویرانیاں

۱؎ ۔ مکتوبات نیاز جلد اوّل ص ۱۳۳، ۱۳۴
۲؎ ۔ ایضاً ج دوم ص ۶۳

بھر دی تھیں، مگر ٹوٹنے کے باوجود اُنہوں نے اپنے آپ کو بکھرنے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے چہرے پہ مسکراہٹوں کی ماسک سجائے وہ رَواں دواں زندگی کے ہر شغل میں حصّہ لیتے ہیں۔ یہ شوخی و ظرافت اُن کی شخصیت کا اہم جُز ہے۔ کہیں بھی اس میں پستی و ابتذال نہیں ہے ظرافت پاکیزہ ہے۔ ہنسی و شوخی میں سنجیدہ تفکّر ہے۔ اعلیٰ و ارفع ظرافت اسی سنجیدہ تفکّر سے پیدا ہوتی ہے۔ اُن کی خوش دِلی اور دِل لگی کی باتوں میں بھی ایک سوچتا ہُوا احساس ذہن اور ایک دھڑکتا ہُوا دِل مِلتا ہے :۔

"حقیقت یہ ہے کہ تم سا لغو انسان مَیں نے تو آج تک نہ دیکھا نہ سُنا۔ بلکہ مَیں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تخلیقِ نوعِ انسان کے وقت ذہنِ فطرت میں بھی نہ ہوگا گردن اُٹھاؤ ذرا آنکھ سے آنکھ مِلا کر جواب دو۔ خاکم بدھن مَیں نے کب اور کِس سے کہا تھا کہ مولانا کو مالیخولیا ہو گیا ہے ـــــ اُنہوں نے جِس انداز میں شکوہ کیا ہے اُس کا جواب صِرف یہی ہو سکتا ہے کہ اپنا سَر پھوڑ ڈالوں یا تمہارا تم پہ اختیار نہیں اس لیئے اپنا ہی سَر پھوڑنا پڑے گا ـــــ اگر اس مرتبہ تم نے پھر غلط بیانی سے کام لیا تو سچ کہتا ہوں آ کر ذبح کر دوں گا۔ اور سُولی پہ چڑھ جاؤں گا۔ مردِ خدا کبھی وقت تو اِنسان بن جایا کرو۔ سنجیدگی میں مذاق ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن مذاق میں سنجیدگی حد درجہ خطرناک چیز ہے[1]۔۔۔"

نیاز کی سنجیدگی میں مزاح اور مزاح میں وہ سنجیدگی ہے کہ سوچ کی بہتی لہروں سے ٹکراتے، سفر کرتے ہوئے ہم زیرِ لب مُسکرا دیتے ہیں۔ یہ مُسکراہٹ جس میں وقار، دھیما پن ہے مگر شگفتگی ایسی کہ رُوح تک تازہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً

لہ۔ مکتوباتِ نیاز ج دوم ص ۶

"آرام جان ؟

تمہیں شرم آنی چاہیئے کہ تمہاری طرف سے اتنی تکلیفیں برداشت کرنے کے باوجود میں تمہیں "آرام جان" کہتا ہوں[1]۔"

مزاح، ظرافت اور طنز محض دِل لگی، مُسکراہٹ اور قہقہے ہی نہیں۔ یہ ساکن ساحل پہ کھڑے مضطرب سمندر کا تماشا دیکھنے کا نام ہی نہیں بلکہ زندگی کی بے اعتدالیوں ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے خلاف سُلجھا ہُوا احتجاج بھی ہے۔ مسکراہٹوں کی نقاب سرکا دیں تو دِل پہ گِرتے والے آنسو بھی صاف نظر آتے ہیں۔ مگر ہر جگہ فنکارانہ حُسن اور نفاست موجود ہے۔ جس میں سلیقہ بھی ہے، رکھ رکھاؤ اور ہوش مندی بھی۔ یہ ظرافت معمولی درجہ کی نہیں اس میں زندگی کی تلخ حقیقتیں اور اس کے تضادات سے پیدا ہونے والی بصیرتیں شامل ہیں۔ جو نفرت انگیز نہیں بلکہ ہمیں سوچنے سمجھنے کی طرف مائل کرتی ہیں :۔

"صدیقی، قربانی کے باب میں میرا بھی وہی مسلک ہے جو آپ کا۔ کیونکہ آج تک میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ وہی ذبح بھی کرے وہی ثواب اُٹھائے لیکن ۱۰ ذی الحجہ کو ایک جان ضرور لیتا ہوں۔ اِس کو قربانی اِس لیئے نہیں کہتا کہ نماز سے پہلے ہی ذبح کر لیتا ہوں۔ اور جس وقت لوگ عیدگاہ سے واپس آتے ہوں یہاں ہضم رابع بھی ختم ہو چکا ہوتا ہے لوگ پوچھتے ہیں تو کہہ دیتا ہوں کہ قیامت میں مجھے تماشا بننا منظور نہیں کہ پُل صراط سے بکرے کے پیٹھ پر سوار گزر رہا ہوں اور لڑکے پیچھے تالیاں پیٹ رہے ہیں[2]۔"

لہ۔ مکتوباتِ نیاز ص ۱۱۔ "نگار" مئی ۱۹۳۶ء، ص ۴۸، جلد ۲۹، شمارہ ۵

ٹہ۔ مکتوباتِ نیاز جلد اوّل ص ۳۸

یہ شوخی، یہ بذلہ سنجی محض تفریحی نہیں بلکہ ایک سوچتا ہُوا ذہن پنہاں ملتا ہے۔ جو لاشعوری طور پر اپنی سوچ قارئین کے ذہن تک یُوں منتقل کرتا ہے کہ وہ پہلے ظاہری سطح کے خوشگوار تاثر سے محظوظ ہوتے ہیں اور پھر سوچنے کے بعد اصلاح کی طرف مائل یہی اصلّی و تعمیری ظرافت کی شان و پہچان ہے۔ ایسا مزاح تخلیق کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ وہی شخص یہ انداز دِل فریب پیش کر سکتا ہے جس نے زندگی اور اُس کی ناہمواریوں کا بہت قریب و گہرائی سے مشاہدہ و مطالعہ کیا ہو۔ نیازؔ اِس سلسلے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ایسا تاثر پیدا کرتے ہیں کہ جسے وہ پائیداری حاصل ہے کہ بُھلانا ناممکن۔ بقول پروفیسر یوسف سرمست :۔

"نیازؔ کا مزاح ایک ایسے تاثر کی تخلیق کرتا ہے جسے کبھی بھی بُھلایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اِس میں "تیرِ نیم کش" کا انداز اپنی ساری کسک کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ اور جس کی خلش لذت زخمِ جگر بن جاتی ہے۔ نیازؔ کی شوخیٔ تحریر ایک حسین یاد بن کر دِل و دماغ میں محفوظ رہ جاتی ہے۔"[1]

مزاح کی حسین یادوں میں دِل رُبائی ہے، دِل نشینی ہے، شوخی ہے، انبساط ہے، نیازؔ دھیرے دھیرے مُسکراتے بھی جاتے ہیں، اور نصیحت و تلقین بھی کرتے چلے جاتے ہیں یُوں کہ پڑھنے والے کو ناگواری کا احساس نہ ہونے پائے، وہ محظوظ بھی ہو اور مسکراہٹ میں چُھپی سنجیدگی سے راہِ عمل بھی متعیّن کرے مثلاً

"آپ کو ایک ایسی عورت چاہیئے جو حُسن میں کوہ قاف کی پَری ہو۔ اور دولت میں راکفلر یا فورڈ کی بیٹی ــــ خیال اچھا ہے کہ تم بھی اپنی بدصورتی یا مفلسی میں جواب نہیں رکھتے۔ ہوش میں آؤ کیوں دماغ خراب ہُوا ہے۔ اوّل تو ایسی عورت کا مِلنا محال ہے اور اگر مل بھی گئی تو وہ مجھے چھوڑ کر تمہارے

[1] "نیازؔ کی مزاح نگاری" مطبوعہ نگار پاکستان نیازؔ نمبر حصّہ اوّل ص ۱۰۸

پاس کیوں جانے لگی"[1]

ذاتی و انفرادی مزاح سے ہٹ کر انہوں نے غالبؔ کی طرح خدا کی وسیع و عریض کائنات، اِس کے تماشے، جنت کا تصور، دوزخ، خاص طور پہ مولوی، اُس کی تنگ نظری، آبِ زمزم اور خاکِ شفا کا بڑی خوب صورتی و شائستگی سے مذاق اُڑایا ہے۔ مولوی کے وہ سخت دُشمن ہیں اِس لیے سلسلے میں تلخی شدت سے ہے، مگر باقی اسباق میں شگفتگی کا عُنصر غالب ہے شگفتگی ایسی کہ اُس میں گھٹیا اور عامیانہ پن نہیں۔ پھبتی و ضلع جُگت نہیں بلکہ پاکیزہ و معیاری ظرافت ہے۔ جس میں ایک خاص قسم کی گہرائی و گیرائی ہے۔ بالکل غالبؔ کا سا انداز، اور ایسا انداز جس پہ کئی انداز قربان کیے جا سکتے ہیں :۔

"حُوروں کی آرزو کیا کروں جانتا ہوں کہ مَن و سلویٰ کھانے والے بھی لہسن و پیاز پر اُتر آئے تھے۔ سونے چاندی کے مکان وہاں ملے بھی تو کس کام کے، جب کہ اِن کی ایک اینٹ بھی فروخت کر کے یورپ جانے کے لیے ہوائی جہاز میں کوئی سیٹ ریزرو نہیں کرا سکتا۔ رہ گئے پھل سو آپ جانتے ہی ہیں یہاں یونہی نزلہ کا زور رہتا ہے چہ جائیکہ اُس پر پھلوں کی بھرمار۔ جو "سریع الاستحالہ" ہونے کی وجہ سے فوراً اخلاط غالب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ فردوس کا ٹمپریچر کیا ہوگا ــــ مولوی کہتے ہیں کہ جنت میں سب ایک عُمر، ایک ذوق، ایک رُجحان کے ہوں گے۔ صورت غالباً اس لئے ایک نہیں بتائی کہ حُوروں کو دھوکہ ہو جاتا، مَیں مَر کے خدا کو کسی جھگڑے میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ وہ اگر حشر نشر کر کے بھی خدا ہو سکتا ہے تو پھر ہم کیوں اُسے

[1] "نگار" انشائے لطیف نمبر ص ۱۰۴، ۱۰۵، مرتبہ عائشہ خاں۔ سالنامہ ۱۹۶۰ء جلد ۷۷، شمارہ ۲۰۱

اُلجھن میں مبتلا کریں [1]۔"

یہ ظرافت محض ظرافت نہیں، گہری سنجیدگی اور سوچ بھی ہے۔ جو ہر پڑھنے والے کو غور و فکر پہ مجبور کرتی ہے۔ عام طور پر مقابلہ و موازنہ سے بھی شوخی و ظرافت کا عنصر پیدا کیا جاتا ہے مقصود ہنسنا و ہنسانا ہے۔ موازنہ کا مقصد تفریحی بھی ہوتا ہے اور تعمیری بھی۔ نیاز نے بڑے مزاح نگار کی طرح تفریح میں تعمیر کا عنصر یُوں بے ساختگی سے پیش کیا ہے کہ باید و شاید حالانکہ وہ بنیادی طور پر مزاح نگار نہیں۔ لیکن وہ لُطف پیدا کیا ہے کہ مسکراہٹوں کی دُنیا جگمگا اُٹھی ہے

"جنت میں شراب ملی بھی تو کیا، نہ وہاں شور و نوشا نوش نہ رِندوں کا
جوش و خروش، نہ گھٹاؤں کا لُطف ہے نہ بادِ نسیم کے جھونکوں کا مزا نہ
جھانک تانک کا موقع ہے نہ کسی کی صدائے غلغال کا اِنتظار رہ گئی
حُور، سوا ایسے معشوق کو لے کر کیا کروں جو نہ جھوٹی قسم کھانا جانتا ہو اور
نہ دست درازی کے وقت بدن چُرانا، جسے نہ اظہارِ مُدعا پر گالیاں
دینا منظور ہو اور نہ انداز سُپردگی میں کسی خواہشِ لُطف کا اِحساس [2]۔"

یہ تو تھیں اُن دیکھی جنت کی باتیں، جس کی فضا اور ماحول کی دلکش کہانی نیاز مزے لے کر بیان کرتے ہیں، یُوں کہ چشمِ تصور محظوظ بھی ہوتی ہے اور چشمِ تماشا اس دُنیا کی اہمیت اور اس سے مزید لگاؤ پیدا کرتی ہے۔ اس دُنیا کی ناہمواری اور نشیب و فراز بھی نیاز کے وسعتِ مطالعہ کا محور و مرکز ہیں۔ وہ ہنستے ہیں، چھیڑتے ہیں، گدگداتے ہیں۔ مسکراہٹوں کے یہ انمول گُلاب ہمیں دل سے عزیز ہیں۔ ہمارے اندر پُھل جڑیاں سی چکر کھانے لگتی ہیں ساتھ ہی ہم غور و فکر پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہی کمال ہے نیاز کی شوخی و ظرافت کا کہ خوشگوار

۱۔ مکتوبات نیاز ج دوم ص ۲۰۰۔ "نگار" ستمبر ۱۹۳۹ء، ص ۵۲، ۵۳ جلد ۳۲، شمارہ ۲

۲۔ مکتوبات نیاز ج دوم ص ۱۲۲، نگار انشائے لطیف نمبر ص ۷۵، مرتبہ عائشہ خان

تاثر پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ فکر بھی دیتی ہے۔ ملاحظہ ہوں اس دنیا کی باتیں جہاں ہم آپ رہتے بستے ہیں:۔

"پہلے عاشق محبت میں اپنی جان دے دیتا تھا اب دوسروں کو ذبح کر
ڈالتا ہے۔ پہلے جنگلوں کی خاک چھانتا تھا، اب "پارکوں" میں ٹہلتا ہے
پہلے جیب و گریباں چاک کر ڈالتا تھا، اب کالر و ٹائی کی دُرستی میں معروف
رہتا ہے۔ پہلے "خونِ دل" پیتا تھا اور "لختِ جگر" کھاتا تھا، اب شراب پیتا
اور کباب کھاتا ہے۔ پھر تمہیں بتاؤ کہ اس زمانہ میں کیونکر کسی کو یقین آئے
گا کہ بنارس میں ایک فرہاد پیدا ہوا ہے جسے اگر شیریں نہ ملی تو سر پہ تیشہ مار کر
مر جائے گا [1]۔"

اس شوخی و ظرافت کا نصب العین محض تفریح ہی تفریح نہیں بلکہ یہاں سوچ و فکر کی گہرائی ملتی ہے یہ انداز اُسی فن کار کے ہاں پیدا ہو سکے گا جس نے زندگی کی اُونچ نیچ، اُس کی ناہمواریوں اور نشیب و فراز کا بڑے قریب اور گہرائی سے مشاہدہ و مطالعہ کیا ہو۔ نیاز کا مشاہدہ، مطالعہ اور تجربہ، وسیع و عمیق ہے۔ اُنہیں زندگی کے ہر مسئلہ اور ہر مشکل پہ دسترس حاصل تھی جو مطالعۂ کتب اور نصابی واکتسابی نہیں بلکہ وہبی، فطری اور جیتے جاگتے انسانوں کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے خوشی و مسرت، سرشاری و پُرکیفی کی اس عارضی دُنیا سے نکلیں تو حساس چوٹ کھایا دل آہ و فریاد کرتا ہُوا بھی نظر آتا ہے۔

زندگی دھوپ چھاؤں کا دلچسپ کھیل ہے۔ یہ خوشی و غم، روشنی و اندھیرے، خزاں و بہار کے بدلتے موسموں اور بدلتی رُتوں کی خوب صورت کہانی ہے۔ نیاز اس دلچسپ کھیل اور خوب صورت کہانی کے تمام رازوں سے واقف ہیں۔ علم و عرفان بھی یقیناً ایک بہت بڑا

۱۔ مکتوبات نیاز ج دوم ص ۱۲۲

کو ایک سے زائد خلا اپنے ذہن سے پورا کرنا پڑیں۔ چوتھے ہلکا مزاح، خواہ وہ محض الفاظ سے پیدا کیا جائے یا مفہوم سے، اگر پلاٹ میں کوئی کیفیت رُومان کی پیدا کرکے تھوڑا سا تمثیلی Dramatic touch دے دیا گیا تو اور زیادہ دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ کسی ایک مسئلہ پر مکالمہ میں صفحات کے صفحات رنگین کر دینا خلافِ آئین افسانہ نگاری ہے۔[1]

نیاز نے فنِ افسانہ نگاری پر جس طرح مختصر الفاظ میں بحث کی ہے وہ اُن کی ناقدانہ صلاحیتوں کے اظہار کے لئے بہت کافی ہے۔ انہوں نے مکتوبات میں محض اصنافِ ادب کا تجزیہ ہی نہیں کیا بلکہ خود فنِ تنقید اور نقاد کے منصب پہ بھی حتمی انداز میں فیصلہ صادر کیا ہے۔ جسے پڑھ کر فنِ تنقید سے آگہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ نیاز کی تنقیدی صلاحیتوں کے سب معترف ہیں ہمہ جہت ذہن کا تنقیدی حصہ نقد و انتقاد کے ایسے اہم نکتے سامنے لاتا ہے کہ نیاز کی ژرف نگاہی پہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ مٹی نم ہے اور کتنی زرخیز۔

"ایک نقاد اُس وقت تک صحیح تنقید نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے زمانہ کو چھوڑ کر شاعر کے زمانہ میں نہ پہنچ جائے۔ اور اپنی ہستی سے علیحدہ ہو کر شاعر کی ہستی نہ اختیار کرے۔ اس کے لئے ایک خاص قسم کی دُوربینی Telescopic کی ضرورت ہے۔ جو آسان نہیں۔ مثلاً غالب ہی کو لیجئے جب تک آپ بہادر شاہ کی دلی تک نہ پہنچیں اور غالب کی سی ذہنیت اپنے اوپر طاری نہ کر لیں اُس وقت تک اُس کے کلام پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتے، اسی کو میں نفسیاتی انتقاد کہتا ہوں۔"[2]

[1] مکتوباتِ نیاز جلد اوّل ص ۱۱

[2] مکتوباتِ نیاز۔ جلد سوم ص ۲۳

اس کے علاوہ بہت سے خطوط میں مومن، غالب، بیدل وغیرہ کے اشعار کا تنقیدی جائزہ یوں پیش کیا ہے کہ نیاز کے فیصلہ سے رُوگردانی مشکل ہے۔ نیاز کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے شعر و ادب کا احتساب و تجزیہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت اور ذہن کے مختلف پہلوؤں کو بھی تجزیہ و احتساب کی کسوٹی پہ پرکھا ہے۔ کیونکہ سونا بھٹی میں تپ کر ہی کُندن بنتا ہے۔ اپنی ذات پہ تنقید کے لئے جس وسعتِ نظری و وسعتِ قلبی کی ضرورت ہوتی ہے نیاز کے ہاں یہ دونوں چیزیں بڑی خوبی کے ساتھ موجود ہیں۔ اپنا تجزیہ یوں کریں گے کہ ہمیں اُن کی کمزوریوں سے بھی پیار ہونے لگتا ہے۔

فن کار جس ماحول اور جس فضا میں سانس لیتا ہے وہیں اُس کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے۔ اس کی خوبیاں و خامیاں دراصل اُسی معاشرہ کی پیداوار ہیں جس میں چل پھر کے وہ سانس لے رہا ہے۔ یُوں عصری تاریخ، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کو بھی ہم کسی فن کار کی شخصیت سے الگ نہیں کر سکتے۔ مگر کچھ لوگ مستقبل کی تعبیر اور آنے والے حالات و واقعات کا اشاریہ ہوتے ہیں۔ نیاز بھی ایسے ہی عظیم لوگوں میں سے ہیں۔ اُنہوں کے گرد و پیش کے مسائل پر گہری نظر ڈالی ہے۔ اُن کی فکر و سوچ میں وسعت و گہرائی ہے جو شاید بڑے سے بڑے سیاست دان، معاشرتی و سماجی مصلح اور مذہبی رہنما کو بھی نصیب نہ تھی۔ اُن کا دل و دماغ تفکر سے روشن ہے۔ اور اس تفکر کی روشنی میں ایسی باتیں منظرِ عام پر آئیں جو بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات کے بے شمار انقلابات کے باوجود بالکل صحیح و سچی ہیں۔ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اُن کے جادو ہاتھ میں بصیرت کا "جامِ جم" ہے اور وہ اُس کی گردش میں آنے والے وقتوں کی نا" ریں اور سنجیدہ مسائل کو دیکھ کے فکرمند ہیں۔ کھلتے ہوئے پھول بکھرتی خوشبو اور دامن پکڑتے، چھالے ڈالتے کانٹوں کی خوب صورت دُنیا میں نیاز کا ذہن نزاکت، حُسن و رعنائی سے محظوظ ہوتا ہے ساتھ ہی آنے والے وقتوں میں پھولوں کی نازک پنکھڑیوں کو بکھرتے اور کانٹوں کی شدید چُبھن کو محسوس کرتا ہے نیاز کی سوچ بوتل میں بند اُس طاقتور

جن کی مانند محسوس ہوتی ہے جو وقتِ مقررہ پہ ٹل جانے سے، دُھواں بکھیرتا ہُوا پچک کی تاریخی عدالت میں ایسے حقیقی اور ٹھوس شہادتوں پہ مبنی فیصلے سُناتا ہے جن سے شاید ہی کوئی منکر ہو:۔

"آزاد مُلک، آزاد فضا، اور آزاد خیال انسانوں کے درمیان چند سانسیں لینا اور مَر جانا، اِس سے زیادہ اب میری کوئی تمنا نہیں ——یہاں کا مسلمان قیامت تک آزاد نہیں ہو سکتا—لوگ کہتے ہیں کہ مایوسی شیوۂ مردانگی کے خلاف ہے۔ قومیں پستی سے نکل کر ہی دُنیا میں اُبھرتی ہیں۔ حالانکہ مجھے سبھی ایسی قوموں کے نام معلوم ہیں جو ایک بار ڈوبنے کے بعد پھر اُبھری ہی نہیں اور یہاں کے مسلمانوں کو میں اسی میں شامل سمجھتا ہوں۔"[1]

نیاز کی یہ پیشن گوئی بہت حد تک دُرست ہے۔ واقعی ہندوستان کا مسلمان آج تک آزاد نہیں ہو سکا۔ وہ مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی بندھنوں میں جکڑا ہُوا ہے۔ کہ "نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے اور نہ دم ہی نکلتا ہے" نیاز نے ایسے پہلوؤں پہ سنجیدہ مفکر کی طرح روشنی ڈالی ہے اُن کی سوچ محض سوچ نہیں وہ حالات کو سمجھنے، سُلجھانے، اور بہتر بنانے کے لیے ایک لائحہ عمل بھی تجویز کرتے ہیں۔ جس سے یقیناً ایک صحت مند، تعمیری معاشرہ کی تشکیل ہو سکتی ہے۔

"آپ کے لیے اصل مذہب بچوں کی صحیح تربیت اور فرائض نسوانی ادا کرنا ہے۔ ان سے کبھی فراغت نصیب ہو اور خدا کو سمجھنے کا جی چاہے تو کائنات کی COMDIES کو نہ دیکھئے بلکہ TRAGEDIES پر غور کیجئے اور عہدِ حاضر کی سب سے بڑی ٹریجڈی موجودہ جنگ ہے۔ اِس وقت مذہب سے

---

[1] مکتوباتِ نیاز جلد دوم ص ۱۳۴، ۱۳۵

زیادہ ضروری سیاسیات کا مطالعہ ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق ہماری آپ کی اقتصادی و معاشی زندگی سے بھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک آپ کو یہ اطمینان نہ ہو کہ سچ آپ کے بچے کیا کھائیں گے، عشاء و تہجد کی نماز بھی آپ سے اچھی طرح ادا نہ ہوگی۔"

یوں نیاز کا قلم، رواں اور مضبوط قلم زندگی اور ادب دونوں کے صد ہا جلوے و کرشمے دکھاتا ہے ہر جگہ جولانی ہے۔ گرمی ہے، تپش ہے، جوش ہے، ولولہ ہے اور کہیں بھی معلوم نہیں ہوتا یہ اظہار بے ساختہ اور فطری ہے۔

خطوط جذبوں کے اظہار کا سب سے فطری انداز ہیں۔ اسی فطری انداز اور حُسن کی وجہ سے ہم سب کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ اور جن خطوط میں زندگی کا ہر ہر لمحہ جذبوں اور لفظوں کے پنجرے میں مقید کیا گیا ہو، اُس زنداں میں تو ہر شخص عمر قید کو قابلِ فخر سمجھتا ہے۔ خوشی و غم، وقت کی سچی آواز اور زندگی کی پھیلتی شاہراہ کے وہ اہم راستے ہیں کہ ہر شخص حقیقی منزل تک پہنچنے سے پہلے یہاں سے گزرتا ہے۔ نیاز نے بھی عام انسان کی طرح ان دونوں ذائقوں کا مزا لیا ہے۔ مگر حوصلہ کا دامن بہت کم ہاتھ سے چھوڑا۔ بیدل اور اقبال کی موت اُن کے لیے عظیم سانحہ تھی، اُن کے دل کی رگ رگ میں دراڑیں سی پڑ گئیں:۔

"میں آج بہت ملول ہوں، اس قدر ملول کہ تم میرے پاس ہوتے تو شاید رو پڑتا۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ پرسوں بیدل کا انتقال ہو گیا اور ایسی بیچارگی کے عالم میں کہ خیال کر کے دل کانپ اُٹھتا ہے۔ ہائے ہائے ایسا جوہر نایاب اور یوں ناقدری کہ کہیں سر چھپانے کی جگہ بھی اُسے نہ ملے۔ ہائے وہ بلبل ہزار داستان اس وقت گورِ غریباں میں ہزاروں مَن مٹی کے نیچے خاموش

---

[1] مکتوباتِ نیاز جلد سوم ص ۳۴

پڑا ہے۔ اور کوئی شخص بھی آنسو بہانے والا نہیں۔ سچ کہتا ہوں دل بہت
بیقرار ہے اور ایک لمحہ بھی اُن کی یاد سے خالی نہیں گزرتا۔ افسوس
زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے۔"[1]

نیاز رسمی باتوں، بناوٹی رویّوں اور جھوٹے لفظوں سے ہمیشہ متنفر رہے۔ اُن کے دُکھ اُن کی نوحہ گری کی طرح سچے ہیں۔ روتے ہیں تو دل سے۔ ہنستے ہیں تو دل سے۔ دُکھ کا ساگر سمندر سے بھی گہرا ہے۔ نیاز اس گہرے سمندر میں ڈوبتے تو ہیں مگر یُوں نہیں کہ لہروں میں خود ساختہ ہلچل مچے۔ بلکہ اس طرح کہ غم سے خود سمندر کا سینہ بھی پھٹنے لگے۔ نیاز سچ و صداقت ہیں اپنی خوشی میں بھی اور دُکھ میں بھی۔ اقبال کے اس دُنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جانے پر غم کا پہاڑ ٹوٹا مگر انہیں سوگواریاں خاموش بھی لگتی ہیں۔ اُس زمانہ کے تقریباً سبھی رسالوں نے "اقبال نمبر" نکالے مگر نگار خاموش رہا اس لئے کہ نیاز کے مطابق غم و الم کوئی رسم نہیں جسے اہتمام سے منایا جائے کہ عمر بھر تو سنگ زنی ہو اور دفن اعزاز کے ساتھ کیا جائے۔

"آپ کیا پوچھتے ہیں کہ یہ حادثہ کتنا بڑا ہے۔ میری عمر میں بہت کم واقعات ایسے ہیں جنہوں نے اچانک صدمہ پہنچایا ہو۔ سُنتے ہی دماغ چکرانے لگا پیشانی پر پسینہ آگیا اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے تیز روشنی گُل کر کے دفعتاً اندھیرے میں ڈال دیا ہے ـــ آپ صدیاں کہتے ہیں میں کہتا ہوں یہ جگہ پُر ہو ہی نہیں سکتی ـــ اقبال کی جگہ بدستور خالی رہے گی۔"[2]

زندگی، بھرپور زندگی، مکتوبات نیاز میں جہاں تڑپتی، مچلتی، سرشاری و پرکیفی میں نظر آتی ہے وہاں اُن کا قلم خون کے آنسوؤں میں بھی ڈوبا نظر آتا ہے۔ یہی دلچسپ رنگا رنگی جہاں ترنگی زمانہ کے

۱؎۔ مکتوبات نیاز ج اوّل ص ۲۲۸، ۲۲۹

۲؎۔ مکتوبات نیاز ج دوم ص ۱۲۴

وارث پیش کرتی ہے وہیں دل کے حادثوں کی دلکشی بھی کچھ کم نہیں۔ بیان کہیں بھی اور کہیں بھی گراں نہیں گزرتا بقول پروفیسر رشید گاوری:۔

"مکتوبات میں زندگی و ادب اپنی تمام تر صد رنگی و تنوع کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جہاں مذہبی، سیاسی، علمی، معاشی غرض ہر قسم کی بحث موجود ہے لیکن بیان میں کہیں گرانی نہیں۔ لب و لہجہ مخصوص دلکشی رکھتا ہے۔ شگفتگی و تازگی سرشاری و پرکیفی نیاز کی تحریروں میں عموماً اور اُن کے خطوط میں خصوصاً جاری و ساری ہے۔ اِن کی انشا پردازی کا جوہر انتقادیات، ملاحظات، و مذاکرات میں بھی جلوہ پاش ہے لیکن مکتوبات کا تو عالم ہی کچھ اور ہے
صد جلوہ رُو برو ہے جو مژگاں اُٹھائیے"[1]

ادبی جلوؤں کی رنگا رنگی، انشا پردازی اور لفظوں کی قوسِ قزح کے دلکش رنگ بکھرتے دیکھنا ہو تو "مکتوبات نیاز" کا مطالعہ کیجئے جنہوں نے نیاز کو ایک صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔

نیاز کی نثر شعریت سے بھری ہوئی ہے۔ اُن کی انشا پردازی، اُن کی شاعری ہے "آزاد" نے جس انشا پردازی کی بُنیاد رکھ کے نثر میں نظم کا سا لُطف پیدا کیا تھا، اُس کی ایک نکھری ہوئی صورت ہمیں نیاز کے ہاں نظر آتی ہے۔ وہ لفظوں کے صحیح، برجستہ اور برمحل استعمال کا ہُنر جانتے ہیں۔ وہ اپنے قلم کی جنبش سے ادب لکھتے بھی ہیں اور ادب بولتے بھی ہیں بقول عالم خوندمیری:۔

"نیاز کی انشا پردازی اپنے اُسلوب کے لحاظ سے دو حصّوں میں منقسم ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق اُن کے ادبی مقالات اور ESSAY سے ہے اور دوسرا وہ جو اُن کے مکاتیب کے لئے مخصوص ہے۔ اِن دونوں میں بڑا فرق ہے

۱؎۔ "نگار" نیاز نمبر ص ۱۷، حصّہ اوّل جلد ۰، شمارہ ۲۰

اوّل الذکر اُن کی جُنبش قلم ہے اور دوسری جُنبش زبان۔ یعنی ایک جگہ وہ
ادب لکھتے ہیں اور دوسری جگہ ادب بولتے ہیں[1]۔"

ظاہر ہے جو شخص ادب لکھنے اور ادب بولنے دونوں کے فن نفاست و ذوق سے آگاہ ہو اُس کی دل موہ لینے والی انشاء یقیناً وہ طلسم خیال ہے کہ ہم لفظوں کے جال میں گرفتار، سحر زدہ ہیں۔ آزادی نصیب ہوتی ہے تو انہی لفظوں سے جو ہمیں قید کئے ہیں۔

"اللہ اللہ آپ تشریف لا رہے ہیں، ڈرتا ہوں کہیں ساکنان ملاءِ اعلیٰ کی نظر نہ لگ جائے۔ حجرۂ فلک سے جھانکتے جھانکتے کہیں حوریں نہ زمین پہ آرہیں کہیں کرّوبیاں عالم قدس میں تسبیح و تہلیل نہ بھول جائیں۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ آتے آتے رہ جائیں۔ اُمید کیوں بے وقوف بناتے ہو تم اور وعدہ پورا کرو۔ سچ کہتا ہوں جس دن ایسا ہوگا تو آسمان پھٹ جائے گا زمین شق ہو جائے گی۔ اور ہم اور تم دونوں اس میں سما جائیں گے۔ آپ تو مہربانی فرما کر وہیں جمے رہیئے جہاں آپ نصب کر دیئے گئے۔ گلگشت کی ضرورت نہیں۔ چمن والے یونہی تباہ ہیں[2]۔"

نیاز کی یہ خوب صورت نثر مکتوبات کی دُنیا میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اگر وہ ان خطوط کے علاوہ کچھ اور نہ بھی لکھتے تو بھی ایک کامیاب صاحب طرز انشاپرداز ہوتے۔

"کلیجہ پتھر کا ہو گیا ہے۔ اب نہ غمزۂ ناہید کا اثر ہوتا ہے نہ قہر مریخ کا۔ آنکھ اور زبان خشک ہیں۔ اور دل برف کی قاش۔ پھر آپ کے ابھی تک "خیال طرۂ لیلے" لئے بیٹھے ہیں۔ اس شخص کا قدم کیوں درمیان میں لاتے ہیں جو

---

[1] "نگار" انشائے لطیف نمبر سالنامہ ۱۹۶۰ء ص ۲۲ جلد ۳۶ شمارہ ۲

[2] مکتوبات نیاز ج دوم ص ۲۳۸، ۲۳۹

ماورار دُنیا کے محمل و منزل "زندگی بسر کر رہا ہو[1]۔"

نیاز کا ہر لفظ اور ہر جملہ ترشا ہوا اور خوب صورت سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ اُن کے قلم میں مصوّر کی نفاست اور نازک کاری ہے۔ لفظ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے بندھے چلے آتے ہیں جن میں ترنم بھی ہے، تازگی و نُدرت اور شوخی و شگفتگی بھی۔ انشاپردازی میں اگر دلکش لفظوں کے ساتھ ساتھ معنویت بھی ہو تو نثر کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ لفظ اور معنی کی یہ خوب صورت آنکھ مچولی ہمیں نیاز کے ہاں صاف صاف نظر آتی ہے۔

"ہم ہر روز ہزاروں چیونٹیوں کو پامال کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ممکن ہے اُن کی دُنیا میں اُن حوادث پر شور شیون ہوتا ہو لیکن ہمیں خبر نہیں خبر نہیں ہوتی پھر قدرت سے تو ہم کو وہ نسبت بھی نہیں جو چیونٹی کو ہم سے ہے۔ اس لئے شکایت کیجئے بھی تو کون سُنتا ہے۔ پھول کی پنکھڑیاں جب خشک ہو کر زمین پہ گر جاتی ہیں تو باغبان اُنہیں درخت کے پاس بھی نہیں رہنے دیتا۔ چُن کر دُور پھینک دیتا ہے۔ نباتات کی دُنیا میں اس ظلم پر کتنا ماتم ہوتا ہو گا اس کا حال باغبان سُنے بھی تو سوائے ہنسنے کے اور کیا کر سکتا ہے[2]۔"

جاندار لفظ، جذباتی کیفیات کو سمیٹے، سادگی و صنعت گری کے کمالات دکھاتے ہیں۔ یہ سادگی و صنعت گری نیاز کی پہچان ہے۔ کہیں سے کوئی خط اُٹھا لیجئے وہ گمنام نہیں رہے گا۔ مکتوب الیہم کو تو شاید ہمیں ڈھونڈھنا پڑے لیکن مکتوب نگار اپنی بھرپور شخصیت کے ساتھ ہمارے سامنے ضرور آئے گا۔ نیاز کے لفظ لفظ اور حرف حرف میں حُسن و دلکشی اور انشاپردازی ہے مگر اس کے لئے وہ کوئی شعوری کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ لفظ خود بخود جذبہ و رُومان کی آنچ پا کر بے ساختہ قلم سے ٹپک

---

[1] مکتوبات نیاز، ج دوم، ص ۱۴۲

[2] مکتوبات نیاز ج دوم ص ۲۶۸ "نگار" نومبر ۱۹۴۰ء ص ۶۰، جلد ۳۸، شمارہ ۵

پڑتے ہیں۔ اور اپنے فطری حسن سے پڑھنے والوں کے دل کو مسخر کر لیتے ہیں۔[1]

"اللہ اللہ یہ برہمی، خوب صورت پیشانی کی خوب صورت شکنیں، پھول سے رخساروں کے نیچے دہکتی آتشِ گل، یہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے نکلنے والے شعلے

آتش تیز است و داماں می زنم

ہاں ہاں میں چنگیز ہوں، ہلاکو ہوں، نیرو ہوں اور وہ سب کچھ ہوں جو آپ کے "لب لعلیں" مجھے بنا دیں۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ میں محبت کی اُس منزل سے گزر رہا ہوں جہاں نہ شکوہ و شکایت کی گنجائش ہے نہ شکر و تہنیت کی۔"[1]

یہ انشا پردازی نیاز کے قلم کا فطری حسن ہے جس کے لئے وہ ذہنی طور پر کوئی کاوش نہیں کرتے بلکہ لفظ خود بخود روانی سے بہتے چلے آتے ہیں۔

نیاز نے اپنے مکاتیب میں خوب صورت اشعار کا برجستہ و برمحل استعمال کر کے نہ صرف بیان کی تاثیر کو بڑھایا ہے بلکہ تحریر کے حسن میں اضافہ بھی کیا ہے۔ یہ اشعار ایک طرف نیاز کے وسیع مطالعے کا ثبوت ہیں تو دوسری طرف اُن کے ذوقِ تنقید خصوصاً مشرقی اندازِ تنقید کا معیار متعین کرتے ہیں۔ یہ معیار مشرقی تنقید کی ایسی منہاج ہے جسے اپنا کر نئی نسل بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ اُردو کے اشعار بھی بکثرت آئے ہیں لیکن فارسی اشعار کی تعداد اُردو کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے شاید ہی کوئی خط ہوگا جس میں اشعار نے جگہ نہ پائی ہو۔ مکتوباتِ نیاز کی تین مطبوعہ جلدوں میں تقریباً ۳۶۲ فارسی اشعار نظر آتے ہیں۔ اُردو اشعار کی تعداد دو سو گیارہ ہے۔ حصہ اول میں فارسی اشعار اٹھاسی اُردو اشعار ستاون۔ ج دوم میں فارسی اشعار ایک سو ستتر اُردو اشعار اٹھاسی جلد سوم میں فارسی اشعار ستانوے اور اُردو اشعار چھیاسٹھ یہ سارے اشعار کہیں اصل شکل میں اور کہیں عبارت کے اندر اس طرح کھپا دیئے گئے ہیں گویا انھیں مقامات کے لیے کہے گئے ہیں۔ ان میں بیشتر سعدی، حافظ

[1] مکتوباتِ نیاز جلد دوم ص ۱۵۹

خسرو، بیدل، نظیری، غالب، فیضی، عرفی کے ہیں۔ اُردو کے بیشتر اشعار مومن، غالب، داغ، امیر، وحشت کلکتوی، اور حسرت موہانی کی تخلیق ہیں۔ مکتوبات میں یہ انداز ابوالکلام آزاد کے ہاں بھی ملتا ہے۔ نیاز اُن سے بھی متاثر ہیں۔ لیکن ابوالکلام آزاد شعر کے ساتھ خود شعری فریب خوردہ پیدا کرتے ہیں۔ اور شعر سے پہلے اُس کا مطلب نثر میں بیان کر دیتے ہیں۔ یہ بات بڑی گراں گزرتی ہے۔ موقع کے لحاظ سے شعر کا حوالہ دے دینا ہی کافی ہے۔ نیاز کے ہاں حسن کی یہ ادا بھی موجود ہے۔[1]

"کیا پوچھتے ہو کس حال میں ہوں اور کیا بتاؤں عمر کس طرح بسر ہوتی ہے
جو زمانہ گزر گیا اُس کی یاد، بربادی کی یاد، جو گزر رہا ہے وہ مجسم حسرت ہے
شکوہ کروں تو کس کا کس زبان سے

ہستی بہ تپش رفت و اثر نیست نفس را
فریاد کز یں قافلہ برزد جرس را"

فارسی اشعار کے علاوہ اُردو کے خوب صورت شعروں کا استعمال کوئی نیاز سے سیکھے۔ بعض اوقات خط کی ابتدا ہی شعر سے ہوتی ہے:

"تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ہر چند ان سب کی شکایت آپ سے تو نہیں ہو سکتی لیکن ظلم کرنے والوں کی قوم ساری دُنیا میں ایک ہی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ عذرِ گناہ بعد از گناہ" اور کسی "زود پشیماں کا پشیماں ہونا" دونوں ایک چیز ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا زمین اُس کا نقش لیے ہوئے لاکھوں میل کا چکر لگا چکی اُس کو واپس

[1] مکتوباتِ نیاز ج دوم ص ۳ "نگار" مارچ ۱۹۳۶ء، ص ۴، جلد ۲۹ شمارہ ۲

لینا کسی کے امکان میں نہیں۔ پھر یہ فکر

اگر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو بالکل بے کار ہے[1]"

نیاز نے شعروں کو نثر میں بڑی خوب صورتی سے کھپایا ہے۔ اگر اصل شعر سے واقفیت نہ ہو تو اُن کی ذاتی نثر کا حصّہ معلوم ہوتے ہیں:۔

"آپ کو شاید یاد نہ ہو لیکن مَیں وہ ساعت کبھی نہیں بھول سکتا جب آپ
میرے سامنے نگاہ جھکائے ایک پھول سے کھیل رہی تھیں، مَیں خوش تھا
کہ مَیں نے اپنا دل "خوں کیا ہُوا دیکھا گم کیا ہُوا پایا" پھر کیا ہُوا اس کا مجھے
ہوش نہیں آپ دونوں پھر اجنبی ہو چکے، زخموں کو تازہ کرنا مناسب نہیں

؎ یہ سب درست کہ تم بُت بھی ہو خدا بھی ہو!
مگر نیاز کے قابل یہ دل ربا بھی ہو!!

مکتوباتِ نیاز میں ایسی سیکڑوں مثالیں مِل جاتی ہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ نیاز کا عام انداز یہی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی بنا پر پروفیسر آل احمد سرور نے ان مکاتیب کو انشائیہ قرار دیا ہے۔

"ان کے مکاتیب دراصل مکاتیب کم ہیں اور انشائیہ زیادہ، ان میں
بڑی خوب صورت زبان ہے۔ فارسی اور اُردو کے اشعار کا برمحل استعمال
ہے۔ اور موضوعات بڑے رنگین و شوخ ہیں مگر میرا خیال ہے کہ یہ خط لکھے
گئے، بھیجے نہیں گئے اور جو خط بھیجنے کے لئے نہیں لکھا جاتا وہ خط نہیں
انشائیہ ہوتا ہے[2]۔"

آل احمد سرور کا یہ قول دو حصّوں میں منقسم ہے۔ زبان و بیان اور انشا کا اعتراف نہ کرنا تو گویا

[1] ۔ مکتوباتِ نیاز ج دوم ص ۲۲۵۔ نگار "نومبر ۱۹۴۱ء" ص ۵۰ جلد ۴۰ شمارہ ۵
[2] ۔ "نیاز کی یاد میں" نگار "جولائی ۱۹۶۶ء" ص ۱۸

خدا کی وحدانیت سے منکر ہونا ہے۔ دوسری بات خطوط کا فرضی ہونا ثابت ہوتی ہے جس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ بہرحال نیاز کے خطوط انشاپردازی کا لاجواب و لازوال نمونہ ہیں نیاز کے ہاں وہ تمام فنّی لوازم بڑی خوب صورتی سے جگہ پا گئے ہیں جو تحریر کو پرکشش بناتے ہیں۔ نیاز نے انہیں بے ساختہ استعمال کرکے اپنے خطوط کو جاذبِ توجہ بنا دیا ہے۔ تشبیہ، استعارہ، تلمیح، تاریخی حوالے، لفظی پیکر تراشی اور کنایات کا وہ کون سا سحر ہے جسے وہ استعمال نہیں کرتے۔ تاریخی حوالوں اور تلمیح کا استعمال، اس سے بہتر شاید ہی دوسری جگہ ملے کہ بھولی بسری یادیں بھی تازہ ہو جاتی ہیں اور تخیل کی نزاکتیں اور رفعتیں بھی منظرِ عام پہ آ جاتی ہیں۔ ایک خط کی چند سطریں دیکھئے:۔

"آپ وہاں جا رہے ہیں تو کس اہتمام کے ساتھ، یوسف تو خیر پیغمبر تھے،
الزام عائد ہُوا تو صفائی میں قمیض کا پچھلا دامن پھٹا ہُوا دکھا دیا۔ اور لوگوں
نے مان بھی لیا۔ لیکن آپ اپنی چاک دامانی کو کیونکر چھپائیں گے[1]۔"

بعض اوقات اپنی بڑائی اور عظمت کا احساس دلانے کے لئے بھی تاریخی حوالے استعمال کئے ہیں:

"اگر آپ کو جلانا ہی تھا تو اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔ مَیں کوئی ابراہیم
تو ہوں نہیں کہ میرے جلانے کے لئے پہلے "نمرود" اور "آتشِ نمرود" کی جستجو
کی جائے۔ معمولی آدمی ہوں بغیر آگ کے بھی مجھے جلایا جا سکتا ہے[2]۔"

کبھی چھیڑ چھاڑ، شوخی و ظرافت کے لئے تلمیحات کو دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں:۔

"وہ بپھرے ہوئے تیور، وہ کھنچے ہوئے اَبرو، وہ غصّہ سے تمتماتا ہُوا
چہرہ، بس یُوں سمجھئے کہ "سراپا لن ترانی" سامنے تھی۔ شکر ہے کہ میں موسیٰ

[1] ۔ مکتوباتِ نیاز ج دوم۔ ص ۱۶۱
[2] ۔ مکتوباتِ نیاز ج دوم۔ ص ۲۲۰

نہ تھا ورنہ ختم ہی ہو جاتا[1]۔"

تشبیہ و استعارہ ادب کا زیور ہیں۔ ادب کو ترفع بخشنے والے لوازم ہیں ان کا مقام نہایت اہم ہے۔ لیکن اگر یہ چیزیں شعوری طور پر بطور صنعت گری کے لئے لائی جائیں تو حُسن و دلکشی عطا کرنے کے بجائے اُس کی بدصورتی کا باعث بن جاتی ہیں حُسن تناسب کا نام ہے اور نیاز کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تناسب کا ہر جگہ خیال رکھا ہے۔ اور مصنوعی زیورات کو اصلی اور سچا بنا دیا ہے۔ ایسی بے ساختگی اور بے تکلفی سے ان زیورات کا استعمال کیا ہے کہ نثر کی دُلہن چندے آفتاب چندے آفتاب، ایک بے مثل شاہکار بن جاتی ہے:-

"اُف وہ گلابی رنگ کا آنچل ـــ یہ معلوم ہوتا تھا کہ چہرے کی روشنی ایک جگہ قائم ہو کر رہ گئی ہے۔ باور کرو کہ معصوم آنکھوں کی "عصیاں کاریاں" بالکل بے نقاب تھیں اور میری رُوح لرزاں تھی اس موج بادہ کے ساتھ ساتھ جو آنکھوں کے "جامِ نرگس" سے تبسّم بن چھلکی پڑ رہی تھی[2]۔"

ایک اور جگہ دیکھئے:-

"اچھا تو بتاؤ کس تاریخ، کس دن، کس ساعت چودھویں کا چاند میرے "ظلمت خانے" میں طلوع کرے گا ـــ؟[3]"

"جوان جینا اور جوان مر جانا بھی کتنی بڑی نعمت ہے، پھول وہی ہے جو کھلتے ہی ٹہنی سے چُن لیا جائے۔ خشک ہونے پر زمین سے اس کی پنکھڑیاں کوئی چُنتا بھی ہے تو پھول سمجھ کر نہیں بلکہ کیاری صاف کرنے

۱۔ مکتوباتِ نیاز ج سوم ص ۳۶
۲۔ ایضاً ج اوّل ص ۲۲
۳۔ ایضاً ج اوّل ص ۳۲

کے لئے[1]۔"

نیاز کا ایک بڑا ہنر یہ بھی ہے کہ وہ لفظوں کے صحیح استعمال پر پوری دسترس رکھتے ہیں، کم سے کم الفاظ میں جہانِ معنی کی ایک وسیع دُنیا آباد کر دیتے ہیں۔ اُن کا ہر جملہ بھرپور اور اُن سے بعض اوقات لفظوں کی تکرار سے بھی نہایت اہم کام لیتے ہیں۔ ایک ہی مفہوم کو مختلف لفظوں میں ادا کرنے سے جہاں اثر میں اضافہ ہوتا ہے وہاں قاری بھی بہت لُطف محسوس کرتا ہے اور مکتوب نگار کی شدتِ جذبات کے ساتھ ساتھ اُس کے جذبات میں بھی جوش و خروش پیدا ہوتا چلا جاتا ہے:-

"ہائے کیا پوچھتے ہو کیا سانحہ ہو گیا، اُجڑ گیا، تباہ ہو گیا، لُٹ گیا۔ مرنے والے کی موت پہ حیرت نہ کرو۔ حیرت کرو میری زندگی پر، میری سخت جانی پر، میری سنگدلی پر، فطرت کا اپنے "ناخن و چنگال" کو خون سے رنگین کرنا کوئی نئی بات نہیں لیکن اس کے مقابلے میں سینے کو پتھر کر کے جیتے رہنا مشکل ہی سے کسی سے بن آتا ہے۔ آہ تفصیل نہ پوچھو سخت جانگداز داستان ہے[2]۔"

اس سادگی، بے تکلفی اور روانی میں خود بخود قافیے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ قافیہ پیمائی عبارت کے حُسن و لُطف کو مزید بڑھا دیتی ہے:-

"میری ہر ہر سانس آلودۂ گناہ، اِن کے جسم کا ریشہ ریشہ عالم پناہ[3]۔"

حُسنِ بیان کی یہ نگارنگی قلب کے سیاہ بادلوں کی یہ سیمابی کیفیت، جذبوں کی کشتیاں چلاتے

۱۔ مکتوباتِ نیاز ج دوم ص ۲۲۳ "نگار" فروری ۱۹۴۰ء، ص ۵۵ ج ۳۰، شمارہ ۲
۲۔ ایضاً ج اوّل ص ۸۹
۳۔ ایضاً ج دوم ص ۱۶۵

معروف خطوط جن پردہ نشینوں کا ذکر آیا ہے۔ اُن میں رام پور کی ایک خاتون شگفتہ بانو اور بھوپال کی [illegible] بانو کے نام تحقیق سے ثابت ہو چکے ہیں۔ یہ بات مستند ہے کہ نیاز کی بہت سی اہم شخصیتوں سے خط و کتابت تھی۔ جن کے نام انہوں نے سینکڑوں خطوط لکھے اور جواب بھی پائے۔ ان اہم شخصیتوں میں علامہ اقبال، شبلی نعمانی، سجاد حیدر یلدرم، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مہدی افادی، مولانا ظفر علی خاں، حکیم اجمل خاں، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، مولانا غلام رسول مہر، مالک رام، ل۔ احمد، احتشام حسین، ملا واحدی، کوثر چاندپوری، ابوالخیر مودودی، عبدالماجد دریابادی، مانی جائسی، [illegible] اکبر آبادی، مجیب انصاری، برہم ناتھ دت، [illegible] اختر حیدرآبادی، ہوش بلگرامی وغیرہ شامل ہیں۔ پھر فرضی خطوط کی غلط فہمی سجانے کیوں پیدا ہوئی؟ اس کا ایک سبب نیاز کی انشا پردازی بھی ہو سکتی ہے۔ بعضوں کی بنا پر بعض اوقات زیبِ داستان کے لئے بات کو بڑھا چڑھا کر بھی بیان کیا ہے۔ مگر ایسا تو اکثر خطوط لکھتے ہوئے ہر بڑے مکتوب نگار سے ہوا ہے۔ مجھے کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ خطوط محض فرضی و کتابی ہیں۔ ہر خط میں ایک جیتی جاگتی شخصیت کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ خواہ وہ انشا پردازی ہو یا سادگی و بے ساختگی۔ بقول مالک رام:

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب خط فرضی ہیں۔ یہ کسی کے نام نہیں لکھے گئے۔ خدا معلوم اس بدگمانی کا باعث کیا ہے۔ ان میں سے بعض خطوط خود میرے نام لکھے گئے تھے"[1]

اس غلط فہمی کا ایک اور اہم سبب "قمر زمانی" کے خطوط بھی ہو سکتے ہیں۔ جو دلکش اندازِ انشاء، سوز و گداز اور دھڑکتے جذبوں کی وجہ سے ہمیشہ ذوق و شوق سے پڑھے جائیں گے

---

[1] نیاز فتح پوری، رسالہ "آج کل" ص ۱۰، جولائی ۱۹۶۲ء جلد ۲۰، شمارہ نمبر ۱۲

جنہیں ایک مرتبہ شروع کر کے ختم کئے بغیر ہاتھ سے رکھ دینے کو جی نہیں چاہتا۔ ان میں خلوص و دردمندی ہے۔ شفقت و محبت ہے۔ شفا و مسیحائی ہے۔ "نقاد" جیسے اہم رسالے اور شاہد انعام دلگیر جیسے مایوس ہو جانے والے فن کار کو بچانا بہت ضروری تھا۔ اُن کے جذبات اور اُمنگوں کی بیداری کے لئے یارانِ نجد نے "قمر زمانی" کی تخلیق کی۔ دنیا کے شاید سب بڑے کام بہترین نیت سے کئے جاتے ہیں۔ ہمیں نیت کے اخلاص کو دیکھنا چاہیے کیونکہ اعمال کا دارومدار یقیناً نیتوں پر ہے۔ نیاز اور یارانِ نجد کی نیت پر کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیے مگر اس سے یہ سمجھ لینا کہ نیاز کے یہ مکتوبات فرضی ہیں، درست نہیں۔ نیاز کے انتقال کے بعد متعدد شعراء اور ادباء کے نام نیاز کے خطوط "نگار" میں شائع ہوتے ہیں۔ مثلاً چودھری برہم ناتھ دت، شفقت کاظمی، عبدالحلیم انصاری، پروفیسر کرامت علی کرامت، نذیر صدیقی، مجید تجی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ یہ خطوط جولائی ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک "نگار" میں چھپتے رہے۔ ان خطوط میں بھی جذبہ، خلوص، محبت اور شفقت کی وہی مہک ہے جو مکتوبات نیاز کے تینوں حصوں میں پنہاں ہے۔ یہ خطوط اتنے ہی دلچسپ و دلفریب ہیں جتنے وہ خطوط جن کے بارے میں فرضی ہونے کا خوب صورت الزام لگایا گیا ہے۔ محبت فرضی بھی ہو تو سمندر سے زیادہ گہری، دھنک سے زیادہ رنگین و دلکش، اور دن کے اُجالوں سے زیادہ سچی ہوتی ہے۔ نیاز کے مکتوب الیہم واقعی خوش نصیب ہیں جنہیں نیاز نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے لفظوں کی قیمتی سوغات بخشی ہے۔ برہم ناتھ دت کے نام جو خطوط ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ مختصر ہیں مگر اس اختصار میں افسانے کا حُسن لُطف ہے۔ تقسیم بہت بڑا دُکھ ہے خواہ وہ ملکوں کی ہو یا زمین کی، جسم کی ہو یا رُوح کی، ذہن کی ہو یا دِل کی، نیاز نے بھی اس تقسیم کا دُکھ سہا ہے۔

"۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی مادی تقسیم ہوئی اور بھارت و پاکستان ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ لیکن جب ۳۰ جولائی ۱۹۶۲ء کو اس

کی ذہنی تقسیم ہوئی پھر دونوں ایک ہو گئے۔ بھارت میں نیاز کی جگہ
برہم ناتھ دت نے لی اور پاکستان میں برہم ناتھ دت کی جگہ نیاز
نے ــــ اللہ بس باقی ہوس ــــ آج آپ بہت یاد آ رہے ہیں۔
اِدھر آؤ کیلوں بلائیں تمہاری لے۔[۱۵]

نیاز کا دل محبت کی ایسی شاداب وادی ہے، جہاں خزاں کا کبھی گزر نہیں۔ اس وادی میں جذبوں کے مدھر جھرنے، احساس کے رنگا رنگ پھول، تخیل کی ٹھنڈی ہوائیں اور تصور کے خوب صورت پرندے چہکتے ہیں۔ وہ محروم ہونے کے باوجود مایوس نہیں ہوتے۔ اُجڑنے کے باوجود پُرسکون دکھائی دیتے ہیں کہ اُن کا حوصلہ بلند جواں، اور دل و ذہن مضبوط ہے۔ ذات کی کشتی کے پتوار کو اعتماد و وقار سے تھامے ہیں اور جب کشتی بپھرے ہوئے طوفانوں سے لڑتی ہوئی کنارے پہ آ لگے تو شکوہ کیسا۔

"ــــ اِس میں شک نہیں کہ یہاں آکر میری زندگی کے کچھ دن اور بڑھ گئے ہیں۔ لیکن جتنے دن اس سے قبل گھٹ چکے ہیں اُن کی تلافی ممکن نہیں۔ اور اب بھی جب ذہنی صدمات کا تصور کرتا ہوں جنہوں نے مجھے ترکِ وطن پر مجبور کیا تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا اس کا سوگ کب تک کرتا رہوں گا۔ کشتی کنارے آ لگی ہے اور اب
"خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے"۔[۱۶]

خطوط کی اس جذباتی و حسین فضا سے قطع نظر اکثر خطوط، کلام کی اِصلاحوں، اور علمی و ادبی گفتگو پر مشتمل ہیں جو بہت مفید و کارآمد ہے اور نیاز کے ادبی ذوق و ذہن کو سمجھنے میں معاون ثابت

۱۵؎ ۔ بنام برہم ناتھ دت مورخہ ۳۰/۵/۶۲ مطبوعہ "نگار" ستمبر ۱۹۶۲ء، ص ۳۸

۱۶؎ ۔ بنام برہم ناتھ دت مورخہ ۳۱/۵/۶۲ مطبوعہ "نگار" ستمبر ۱۹۶۲ء، ص ۳۰

ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے لفظوں میں بڑے بڑے علمی نکتے اور ادبی راز چھپے ہیں جنہوں نے خطوط کو حُسن بھی بخشا ہے اور انفرادیت بھی۔

نیاز کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ نئی نسل کی صلاحیتوں اور ذہانتوں کے قائل تھے۔ سمجھتے تھے کہ ان جوان و توانا ہاتھوں میں قسمتوں کو بدل دینے کی پوری قوت ہے۔ مسئلہ اُن کی صحیح رہنمائی اور حقیقی راہوں کو متعین کرنے کا ہے۔ انہوں نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا ہمیشہ حوصلہ بڑھایا ہے، ہدایت دکھائی ہے۔ وہ چھپے ہوئے جوہر کو تلاش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور اسی جوہر کی روشنی میں صحیح و سچی رہنمائی کرتے ہیں۔

"عزیزم! آپ کا مستقبل یقیناً درخشاں ہے اور آپ کے مردانہ عزائم کو دیکھتے ہوئے مجھے اُمید ہے کہ اپنی زندگی ہی میں مجھے اس کو دیکھ کر خوش ہونے کا موقع مِل جائے گا ــــ وکالت کا پیشہ مجھے پسند نہیں، کیونکہ اس میں زیادہ تر فطرتِ انسانی کا تاریک پہلو سامنے رہتا ہے۔ اور آخر کار احساسِ حُسن ضعیف ہو جاتا ہے۔ وکالت کو ٹالیے جہاں تک ٹل سکتی ہے۔ اور کوشش کیجئے بی۔ٹی اور ایم۔اے دونوں میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل ہو تاکہ محکمہ تعلیم میں آپ کو اچھی جگہ مل سکے سب سے اختیار جی چاہتا ہے کہ کچھ دن آپ کے پاس خلوص و محبت کی اُس دُنیا میں چند ساعتیں بسر کروں جس کے دروازے اب مجھ پر بند ہیں ــــ کراچی اور احبابِ کراچی کے تصور سے دل دھڑکنے لگتا ہے"۔[۱۷]

نیاز کی ہدایت نے اُن کی پیش گوئی کو سچا ثابت کر دکھایا ہے۔ مگر یہ خطوط حرفِ آخر نہیں، کیونکہ نیاز کی سینکڑوں لوگوں سے خط و کتابت تھی اور ابھی بے شمار خطوط لوگوں کے پاس محفوظ ہوں گے۔ ان خطوط کو جمع کیا جائے تو یقیناً یہ ایک الگ مقالے کا موضوع بن سکتے ہیں۔

۱۷؎ ۔ بنام ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مورخہ ۲۹/۷/۵۴

باب ۵

صحافت

صحافت، عربی زبان کا لفظ ہے جو "صحف" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "کشادگی" اور وسعت کے ہیں۔ فارسی میں آکر اس لفظ کے معنی میں تغیر ہوا چنانچہ فارسی لغات میں صحافت کا لغوی مفہوم اخبار سے متعلقہ کام اور باتیں ہیں۔ اصطلاحاً اس کا اطلاق خبر و اخبار اور رسائل و جرائد کے اُن تمام شعبوں پر ہوتا ہے جو ہمیں مختلف علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، مذہبی، سائنسی، غرض ہر قسم کی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ دُنیا میں آئے دن ہونے والے حادثات اور زندگی کے تازہ ترین سماجی و سیاسی اور تہذیبی و ثقافتی واقعات کو ایک خاص انداز میں دوسرے تک پہنچانے کا نام صحافت ہے۔ یُوں صحافت کا میدان خاصا وسیع ہو جاتا ہے۔ آج دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اور آئندہ جس کے ہونے کے امکانات ہیں ان سب کی بروقت نشاندہی صحافت کا نصب العین ہے۔

ادب اور صحافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ ادب اور صحافت دونوں کے بنیادی محرکات میں جذبات و احساسات اور مشاہدات و تجربات ہی شامل ہیں۔ صحافت عصری معاشرے اور حالاتِ زمانہ کی عکاسی کرتی ہے اور اسی حوالے سے سچی اور حقیقی صحافت اپنے

دور کی تاریخ کہلاتی ہے عظیم اور ارفع ادب کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ کہ اس میں روحِ عصر کی موجودگی ازبس ضروری ہے۔ اعلیٰ اور معیاری صحافت کا مقصد ظلم، ناانصافی اور استحصال کا خاتمہ اور بلند انسانی اقدار کو فروغ دینا ہے۔ ادب بھی ایسے ہی مقاصد کا ترجمان ہوتا ہے۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ صحافت میں خبر، واقفیت، معلومات، اور صحت واقعات بے حد ضروری ہیں۔ تمام مقام، اعداد و شمار سب صحیح ہونا چاہئیں۔ یعنی صحافت کا تعلق معروضیت و واقعیت سے ہے جس میں جذبات و احساسات کی شدّت کی بجائے بے لاگ، حقیقی اور غیر جانبدارانہ رویّہ کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس ادب کی بنیاد ہی جذبہ، احساس اور تخیل پر ہے۔ اس میں داخلیت اور فن کار کا ذاتی رویّہ اور ردِّ عمل موجود ہوتا ہے۔ گویا ادب اور صحافت کے موضوع تو ایک ہو سکتے ہیں مثلاً محبت و نفرت، امن و شانتی، تلاش و جستجو، جرائم، انفرادی و اجتماعی کامیابیاں و ناکامیاں انکشاف و ایجادات مگر دونوں کی پیش کش کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ صحافت میں ذاتی محسوسات اور ردِّ عمل کی کوئی گنجائش نہیں، جب کہ ادب میں ذاتی خیال، مبالغہ اور فرضی کردار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ادب کسی فلسفۂ زندگی مثلاً رجعت پسندی، انقلاب یا رجائیت کو پیش کر سکتا ہے لیکن صحافت غیر جانبدار اور ٹھوس ہوتی ہے۔ صحافت میں وقت اور زمانہ کی بہت اہمیت ہے، خبر، تبصرے اداریہ، اور مضمون، موقع اور وقت کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔ جب کہ ادب میں یہ مناسبت اتنی ضروری نہیں۔ گویا صحافت میں معاشرے اور زمانے کے وقتی و عارضی پہلو زیرِ بحث ہوتے ہیں جب کہ ادب مستقل اور آفاقی قدروں کو سامنے لاتا ہے۔ ادب اور صحافت میں ایک اہم فرق طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان کا بھی ہے۔ صحافت کے لئے سادگی، سلاست، اختصار، اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معلومات یُوں پہنچانا ہے کہ معمولی درجے کا قاری بھی آسانی سے سمجھ سکے ادب میں نیا اُسلوب ایجاد کرنے، لفظوں کو نئے نئے معانی پہنانے اور صنائع بدائع کے ذریعے بیان کو قدرے مبہم اور مزیّن کرنے کی اجازت ہے۔ بایں ہمہ صحافت کی افادیت و اہمیت سے کسی طور پہ بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نہ صرف رائے عامہ کی تشکیل کرتی ہے بلکہ اُس کی تربیت

اور رہنمائی کا اہم فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے جیسا کہ بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کا کہنا ہے کہ

"قوم کی ترقی اور بہبود کے لیے صحافت ایک اہم ضرورت ہے۔ کیونکہ صحافت ہی وہ ذریعہ ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں سرگرمیوں کو فروغ دیتا ہے جو قوم کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور رائے عامہ کی تشکیل کرتا ہے۔ صحافت ایک عظیم طاقت ہے یہ فائدہ بھی پہنچا سکتی ہے اور نقصان بھی۔ اگر یہ صحیح طرح چلائی جائے تو رائے عامہ کی رہنمائی اور ہدایت کا فرض انجام دے سکتی ہے۔"[15]

صحافت اور ادب کی ایک درمیانی سطح ادبی صحافت کی ہے۔ جس میں دونوں کے اہم عناصر کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ یعنی صحافت کی بے باکی و صداقت، غیر جانبداری، اور وقت کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے اور اس میں کسی نہ کسی حد تک ادب کے ضروری اجزا یعنی جذبہ و احساس، دائمی اقدار اور طرز بیان کی طرف بھی توجہ کی جاتی ہے۔ اس ادبی صحافت کے ضمن میں ہمارے بعض رسائل و جرائد آتے ہیں۔ ادبی صحافت ایک شفیق طبیب کی طرح ہے۔ یہ معلم بھی ہے اور مؤدب بھی، بیدار پاسبان بھی ہے اور ہوشیار نگہبان بھی۔ یہ تمدن کا مضبوط قلعہ اور انسانی بھلائی کی محرک بھی ہے۔ اس میں دل کی جذباتی دنیا بھی آباد ہے اور ذہن کو علم و بصیرت عطا کرنے والی روشنی بھی ہے۔

صحافت کی تاریخ یوں تو بہت قدیم ہے لیکن اُردو میں اس کا رواج مغرب کے زیر اثر انیسویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ برصغیر کا پہلا فارسی اخبار "مراۃ الاخبار" اپریل ۱۸۲۲ء کو منظر عام پر آیا۔ اسی زمانے میں کلکتہ سے ایک اخبار "جامِ جہاں نما" جاری ہُوا۔ جو ایک اعتبار سے انگریزی اخبار کا فارسی ایڈیشن تھا۔ لیکن فارسی میں اشاعت بہت کم تھی۔ اِس لئے اُردو میں شائع ہونے لگا۔ جام جہاں نما میں تاریخ، شعر و ادب اور عام تہذیبی و سماجی نوعیت کے مضامین بھی چھپتے تھے۔ انداز جہاں سُلجھا ہُوا، سادہ اور پُرکار تھا۔ اُردو کا سب سے پہلا

۱۵۔ "کاروانِ صحافت" ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص۔ ۱۰۹، بار اوّل ۱۹۶۴ء، انجمن ترقی اردو کراچی

اخبار ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے مولوی اکرام علی نے جاری کیا۔ ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد باقر نے اردو اخبار نکالا۔ اور ۱۸۳۶ء میں "دہلی اخبار" جاری کیا۔ اسی دوران سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے "سید الاخبار" اور "صادق الاخبار" شائع کیا۔ کوہ نور، لاہور کا مشہور ترین اخبار تھا۔ یہ ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رائے کی ادارت میں منظرِ عام پر آیا۔ جو ۱۸۵۷ء تک نکلتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سرسید احمد خاں نے عوام اور حکمران طبقہ میں مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کے لئے پہلے ۳ مارچ ۱۸۶۶ء کو "سائنٹیفک سوسائٹی اخبار" یا "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" جاری کیا۔ اور اسی مقصد کی توسیع کے لیے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو "تہذیب الاخلاق" کا اجرا کیا۔ اس رسالے نے جدید ترقی اور نوجوانوں کی فلاح و بہبود اور ذہنی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔

اُنیسویں صدی دراصل اُردو صحافت کی ابتدا اور ترقی دونوں کی صدی ہے۔ جس میں اخبارات کا اجرا ہُوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بہت کم اخبار معیاری تھے۔ امان علی لکھنوی کا "کشف الاخبار"، سید عبدالستار کا "شمس الاخبار"، سید مرتضیٰ شاہ قادری کا "جریدۂ روزگار"، عبدالحلیم شرر کے "مہذب" اور "دلگداز"، محبوب عالم کا "پیسہ اخبار"، اُردو کے معیاری اور مقبول ترین اخبار و رسائل تھے۔ اُنیسویں صدی کے اواخر میں اُردو صحافت نے نئی کروٹ لی۔ اور اخبارات و رسائل خواص کے حلقے سے نکل کر عوام کے ہاتھوں میں پہنچنے لگے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں سیاست اور رائے عامہ نے نئی کروٹ لی۔ اب حکمران طبقہ سے مفاہمت و مطابقت کا دَور گزر گیا۔ نئی جماعتیں اور نئی تحریکیں تیزی سے اُبھرنے لگیں۔ مولانا ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر اور حمید نظامی، جیسے عظیم صاحبانِ قلم اور اخبار نویسوں نے اردو صحافت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا ظفر علی خاں کے "زمیندار" نے نرمی اور سلاست رَوی کی بجائے ولولہ انگیزی اور جذباتیت اختیار کی۔ پُرزور مقالات اور رُوح پرور نظمیں چھاپنا شروع کیں۔ تند و تیز اور باغی روّیہ کی وجہ سے "زمیندار" پر پابندی لگا دی گئی۔ مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹ ستمبر ۱۹۱۲ء کو "کامریڈ"

نکالا۔ اور بعد میں "ہمدرد" کا اجرا کیا۔ حکومت نے سنسر لگایا۔ اور دونوں اخبار ضبط ہو گئے۔ مولانا محمد علی اپنے بھائی شوکت علی کے ساتھ نظربند کر دیئے گئے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے ۱۹۱۴ء میں "انقلاب" نکالا۔ لیکن انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے الزام میں گرفتار ہو گئے۔ چنانچہ مولانا غلام رسول مہر نے ادارت سنبھالی۔ ۱۹۳۸ء میں ملک یوسف العزیز نے مقبول ترین اخبار "جنگ" اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں حمید نظامی نے "نوائے وقت" جاری کیا۔ اس ہنگامی دور میں اخبارات کے ساتھ ساتھ رسائل و جرائد کی کمی کو بھی شدت سے محسوس کیا جانے لگا۔

اُردو کا پہلا رسالہ "خیر خواہِ ہند" کے نام سے ۱۸۳۹ء میں شائع ہوا۔ دہلی میں دہلی کالج کے زیرِ اہتمام "قرآن السعدین"، "فوائد الناظرین" اور "محبِ ہند" جاری ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ سب رسائل ختم ہو گئے۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں سرسید کا "تہذیب الاخلاق" جدید ترقی، تعلیم و تدریس اور اصلاح معاشرہ کا علمبردار تھا۔ ۱۹۰۰ء میں مولانا عبدالحلیم شرر نے "دلگداز" کا اجرا کیا۔ جس میں تاریخی مضامین کے علاوہ علمی و ادبی مضامین و مقالے بھی چھپتے تھے۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں سر شیخ عبدالقادر نے "مخزن" جاری کیا۔ اس کا مقصد اُردو زبان و ادب کی خدمت تھا۔ نثر اور شاعری کے نت نئے تجربات کے ساتھ ساتھ مغرب کے ادبی فن پارے اُردو میں منتقل کئے گئے۔ اس دور میں صحافت ایک بھرپور قوت بن کر اُبھری۔ جس نے ذہنوں کو وسعت اور جلا بخشی۔ چنانچہ منشی دیا نرائن نگم کے "زمانہ" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں سیاست، مختلف علوم و فنون، شعر و ادب پر مضامین لکھے گئے۔ اس کے لکھنے والوں میں محمد حسین آزاد، اکبر الٰہ آبادی، خواجہ حسن نظامی، الطاف حسین حالی، تلوک چند محروم، علامہ اقبال، شبلی نعمانی، نذیر احمد اور پریم چند جیسے اہم ادیب شامل ہیں۔ جولائی ۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت موہانی نے "اُردوئے معلیٰ" جاری کیا۔ اس میں سیاسی، ادبی، تاریخی اور تنقیدی مضامین شائع ہوئے۔ بڑے سیاسی معرکے اور بڑے شعراء کی بیاضیں بالاقساط چھپتیں۔ اس دور کے اہم ترین رسائل رضی الدین کیفی کا "صحیفہ" (۱۹۰۵ء) میر ناصر علی کا "صلائے عام" (۱۹۰۸ء) محمد الدین چشتی نظامی کا "صوفی" (۱۹۰۹ء)

منشی پیارے لال شاکر کا "ادیب" (۱۹۱۰ء) ہیں۔ جن کی علمی و ادبی خدمات کو کسی طور پر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ عورتوں کے رسائل میں مولوی ممتاز علی کے "تہذیبِ نسواں" اور علامہ راشد الخیری کے "عصمت" کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ حقوقِ نسواں کے لئے آواز بلند کرنے والوں میں ایک اہم رسالہ "تمدن" بھی تھا جو اپریل ۱۹۱۱ء میں شیخ محمد اکرام نے جاری کیا۔ یہ خالصتاً خواتین کا رسالہ نہ تھا بلکہ اس میں معاشرتی، تاریخی، علمی و ادبی اور اخلاقی مضامین بھی چھپتے تھے۔

جنوری ۱۹۱۳ء میں آگرہ سے نکلنے والے "نقاد" کو خاص شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی جس کے ایڈیٹر شاہ نظام الدین دلگیر تھے۔ یہ خالص علمی و ادبی رسالہ تھا جسے سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا اور یہ رسالہ پاکیزہ، صاف ستھرے اعلیٰ ادب کا ذوق پیدا کرنا چاہتا تھا اس میں کلاسیکل زبان اور انشا پردازی کو خاص توجہ دی جاتی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ مولانا ظفر الملک علوی کا "الناظر" (۱۹۱۰ء) وحید الدین سلیم کا "معارف" (۱۹۱۶ء) فخر الدین ادیب کا "ادیب" (۱۹۱۶ء) اور امتیاز علی تاج کا "کہکشاں" (۱۹۱۹ء) بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا "اُردو" (۱۹۲۱ء) جہاں ایک طرف زبان و لسانیات کی خدمات سرانجام دے رہے تھے دوسری طرف علمی خدمات کے ساتھ ساتھ اعلیٰ و ارفع ادب کا ذوق پیدا کر رہے تھے۔ یہی وہ فضا اور زمانہ ہے جس سے متاثر ہو کر علامہ نیاز فتح پوری نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا

نیاز نے اپنی علمی و ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز بطور ایک صحافی کے ہی کیا تھا۔ "زمیندار" "توحید" اور "رعیت" نے نیاز کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ وہ بے باک و نڈر صحافی تھے اپنی ان دو خوبیوں کی بنا پر دیکھتے ہی دیکھتے اُردو صحافت پر یوں چھا گئے کہ لوگ اُن سے متاثر بھی تھے اور مرعوب بھی۔ اُن کے قلم نے روایت اور سخت گیر ماحول میں جکڑے لوگوں کو ایک دم چونکا دیا

نیاز نے باقاعدہ صحافی کے طور پر قمر زمانی کے فرضی نام سے "نقاد" کے لئے ایک افتتاحیہ لکھا جو "نقاد" میں بطور اداریہ شائع ہوا۔ صحافت کی سچی اور ٹھوس زبان سے ہٹ کر یہ اداریہ رومانی و جذباتی نثر کا قابلِ تعریف نمونہ ہے صرف ابتدائی حصہ بطور مثال دیکھئے:

"نقّاد کی زندگی کا دوسرا دَور

اور

میں !!

جب کوئی عزیز یا محبوب اپنے سے جُدا ہو جاتا ہے تو رنج اس بات کا
نہیں ہوتا کہ وہ جُدا ہو گیا بلکہ تکلیف کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا جانے کب
ملے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اس قدر مُدّت کے بعد وہ ضرور مِل جائے گا
تو یقیناً ہماری تکلیفیں بہت کچھ گھٹ جائیں ــــ نقّاد فنا ہو چکا تھا، مٹ
چکا تھا کون کہہ سکتا تھا کہ وہ پھر زندہ ہو جائے گا۔ کس کو یقین تھا کہ پھر
اس کی صورت ہمیں نظر آئے گی۔ اس کے مسیحا کی کس کو خبر تھی لیکن نہیں

اے نقّاد

نہ تجھے کسی نے زندہ کیا اور نہ کسی کی مسیحائی نے اثر کیا۔ تو اپنے حیات کے لئے
خود اپنی خاکستر کو کام میں لایا اور اب ہمارے سامنے اس طرح نغمہ زن ہے
سچ بتا تو وہ ستارہ تو نہیں ؟" [1]

نقّاد کے بانی مدیر شاہ دلگیر کی فرمائش پر اس افتتاحیہ کا جواب بھی نیاز ہی نے لکھا۔ وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ آخر آخر نیاز کی صحافتی زندگی کی جولاں گاہ دراصل وہ ماہنامہ رہا۔ جسے ادبی دُنیا "نگار" کے نام سے جانتی ہے۔ "نگار" خالصتاً مشرقی مزاج کا علمی و ادبی ماہنامہ جسے تھوڑے ہی عرصہ میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ ایک تحریک اور ایک ادارہ بن گیا، ایک ایسی تحریک اور ایک ایسا ادارہ جو نئے لکھنے والوں کے لئے مبداء فیض و درس گاہ بن گیا۔ اور ایک جرأت مندانہ روایت کو لے کر آگے بڑھا۔ "نگار" نے علمی و ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ معاشرتی و

[1]: "نقّاد" اپریل ۱۹۱۷ء ص الف تا ر

سیاسی اور مذہبی و ثقافتی خدمات بھی سر انجام دیں۔ اور یہ اُردو صحافت کی وہ واحد شمع ہے جو تیز آندھیوں اور طوفانوں میں بھی جلتی رہی اور آج چونسٹھ سال بعد بھی اُسی طرح روشن ہے۔ متعدد ادبی رسائل نکلے اور بند ہوئے لیکن "نگار" برّصغیر کا واحد ایسا ادبی ماہنامہ ہے جسے یہ اعزاز و افتخار حاصل ہے کہ ۱۹۲۲ء سے لے کر اب تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ علم و ادب کی ملی روایات اور خاص نمبروں کی اشاعت کا اہتمام ابھی تک جاری ہے۔ نیاز کی صداقت، آزادیٔ فکر، اور جرأت اظہار نے نگار کو یہ زندگی عطا کی ہے۔ اپنے قلم کے انہی اوصاف کے بنا پر نیاز کو یقین تھا کہ "نگار" اُس وقت شائع ہوتا رہے گا جب تک پتنگ بنانے کا کاغذ دستیاب ہوتا رہے گا "نگار" و "نیاز" لازم و ملزوم ہیں پروفیسر کاکوری نے صحیح لکھا ہے [2]:۔

"نگار ــــ نیاز صاحب کی شخصیت کا ایسا بھرپور اظہار ہے کہ نیاز و نگار
لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ کبھی کبھی بولنے لکھنے میں مجھ سے "نگار" فتح پوری
اور "مدیر نیاز" کی غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ "نگار" کا اپنا منفرد مزاج ہی نہیں
بلکہ ایک واضح شخصیت ہے۔" [3]

نیاز صحیح معنوں میں مدیرانہ مزاج رکھتے تھے۔ متوازن شخصیت، ذہانت، عقل و شعور اور وسیع وسیع مطالعہ لازمی شرائط ہیں۔ صحافت میں جذبات اور انتہا پسندی کی کوئی گنجائش نہیں۔ وسیع نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ ایڈیٹر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ واقعات کو جانچنے اور پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور محض سطحی و ظاہری صورت سے متاثر نہ ہو۔ اس کی معلومات وسیع ہو۔ فنونِ لطیفہ، ادب فلسفہ، سائنس، سیاست، مذہب اور اقتصادیات کے بدلتے ہوئے رُجحانات اور مسائل جائزہ پر اُس کی گہری نظر ہو۔ علاوہ ازیں صداقت اور غیر جانبداری بنیادی وصف ہے۔ نیاز کی شخصیت میں یہ اوصاف بدرجہ اُتم پائے جاتے ہیں۔ اس لئے وہ ادب کے دوسرے میدانوں کی

[2]: بحوالہ خطبہ استقبالیہ حکیم محمد سعید۔ نیاز صدی نمبر ۱۹۸۴ء ص۔۱۰
[3]: نیاز نمبر حصّہ دوم سالنامہ ۱۹۶۳ء ص ۱۱، ۱۲

طرح صحافت میں بھی بہت کامیاب رہے۔

فروری ۱۹۲۲ء میں نیاز اور "یارانِ نجد" نے "نگار" کا اجرا کیا۔ پہلے پرچے کے لئے بیس بیس روپیہ چندہ جمع ہوا۔ لیکن پہلی ہی اشاعت میں "نگار" خود کفیل ہو گیا اور "مخزن"، "نقاد"، "تمدن"، "ہمایوں"، "نگار"، "نیرنگِ خیال"، اور "کہکشاں"، جیسے معیاری پرچوں کے ہم پلہ ہو گیا بلکہ بعض مسائل میں اُن سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اگرچہ نیاز نے "نگار" کے اغراض و مقاصد کا تعین نہیں کیا بلکہ قارئین کے ذہن پر اعتماد کرتے ہوئے، فیصلہ اُن پر چھوڑ دیا کہ وہ اس میں چھپنے والے مضامین کی روشنی میں خود مقاصد متعین کریں پھر بھی "نگار" کی پہلی اشاعت میں ہی نیاز نے یہ بات ضرور واضح کر دی تھی کہ وہ "نگار" کو کیا بنانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

"جس وقت ترتیب "نگار" کے فرائض پر میں نے ضروریاتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ ترمیں نے پہلی ہی سانس میں کر لیا کہ "نگار" کو خالص ادبی رسالہ تر بننے نہ دوں گا۔ کیونکہ ادب کی وہ مانگ جو چند سال پیشتر تھی باقی نہیں رہی[1]۔"

نیاز کو احساس ہو گیا تھا کہ اب تخیلاتی و تصوراتی کہانیوں کا زمانہ نہیں رہا۔ تہذیب و معاشرت نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر لیں ہیں اور اب کار آمد لٹریچر کی ضرورت ہے۔ انسانی ذہن عقل، منطق و استدلال اور مسائل حاضرہ کا تجزیہ کرنے اور اُن کو حل کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے چنانچہ اسی روشن خیالی اور وسیع النظری کی روایت کی وجہ سے "نگار" نے ہم عصر صحافت میں بہت جلد اپنا ایک الگ اور انفرادی مقام بنا لیا۔ یہ انفرادیت "نگار" کو اس میں چھپنے والے مضامین کے موضوعات و مواد کے تنوع کے سبب حاصل ہوئی۔ "نگار" کے ٹائیٹل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نیاز کی توجہ "نگار" کے ظاہری حُسن کی طرف نہ تھی۔ وہ اس کے جسم کو نہیں بلکہ

---

[1] "خامہ نگار" ص۔ ۵۔ "نگار" فروری ۱۹۲۲ء

ادب کو ادب سے خوب تر بنانا چاہتے تھے۔ اسی لئے رنگوں اور تصاویر کی طرف توجہ نہیں کی ابتدا میں ایڈیٹر کی جگہ سرورق پر "رئیس التحریر" اور "مدیر" لکھے گئے۔ "نگار" کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ وہ نہ تو بڑے ناموں سے مرعوب ہوا اور نہ ہی غیر معروف اور نئے لکھنے والوں کو اس نے نظر انداز کیا۔ اُس نے کسی طرزِ فکر اور نظریے کو اپنا مقصد کبھی نہ بنایا بلکہ ہر اچھی اور معیاری تحریر کو چھاپنا اُس کا نصب العین رہا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:-

"نگار کے مدیر نے زندگی و ادب کا خاص نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود نگار کو کسی خاص مکتبۂ فکر کا پابند نہیں بنایا۔ نگار میں ہر فرد اور ہر مکتبۂ فکر کے ادیب کو آزادانہ اظہار خیال کی اجازت دی گئی ہے۔ ہندو، مسلمان، عورت مرد، بوڑھے، جوان پختہ کار اور نو آموز سبھی اس کی بزم میں شامل رہے ہیں اور اس نے ادیب کے نسل و رنگ، عمر و علاقہ اور مکتبۂ فکر کو نظر انداز کر کے صرف علم و ادب کی جمالیاتی اور ابدی قدروں کے پیش نظر ہر اُس تحریر کو چھاپنا پسند کیا ہے جو اُس کے معیار پر پوری اُتری ہے[1]۔"

"نگار" کی یہ وہ خوبی تھی جو اُس دور کے رسائل میں ذرا کم ہی نظر آتی ہے۔ بہت عظیم لکھنے والوں کے ساتھ اُس نے نئے اہلِ قلم کا ایسا حلقہ بھی پیدا کیا جس نے آگے چل کر خوب نام کمایا۔ "نگار" نے ایک طرف ماضی کے ادب اور ثقافتی ترکے سے ہمارے رشتہ کو استوار کیا دوسری طرف حال سے مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور مستقبل کو سمجھنے کی بصیرت عطا کی۔

"نگار" کی مقبولیت کا ایک اور بڑا سبب اُس کے کچھ مستقل کالم تھے جن میں علمی، ادبی، مذہبی سیاسی، معاشرتی، نفسیاتی، سائنسی، معلوماتِ عامہ، غرض ہر طرح کے مسائل زیرِ بحث آتے ان کالموں میں "ملاحظات"، "باب الاستفسار"، "باب الانتقاد" اور "ماله وماعليه" کے عنوانات

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"ملاحظات" دراصل "نگار" کے اداریہ کا مستقل نام ہے۔ "ملاحظات" نیازؔ ہمیشہ خود ہی تحریر کرتے تھے۔ اِس کا سلسلہ فروری ۱۹۲۲ء سے شروع ہُوا۔ اور یہ کہنا بے جا نہیں کہ "ملاحظات" ہی کی خاطر بہت سے لوگ حلقۂ نگار سے وابستہ ہو گئے۔ ادبی ماہناموں کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسرا رسالہ ایسا ہو جس میں اداریے کے تحت دُنیا بھر کے علوم و فنون، سیاست، مذہب، معاشرت، بدلتی ہوئی روایات و اقدار اور رُجحانات کا اِتنی وسیع النظری اور منطق و استدلال انداز میں تجزیہ کیا گیا ہو۔ عام طور پر اداریے میں مدیر، رسالے میں پیش کردہ مواد اور اپنی مشکلات سے آگے نہیں بڑھتے لیکن نیازؔ نے اُسے ایسی وسعت بخشی کہ "ملاحظات" سے اُس دور کی سیاسی و سماجی اور مذہبی تاریخ بہت آسانی سے مرتب کی جا سکتی ہے۔

اداریہ نویس وقت کا نباض ہوتا ہے۔ اِس خیال کے پیشِ نظر نیازؔ نے مختلف ملکوں کے حالات، اہم شخصیات، مختلف علاقوں کی تہذیب و ثقافت، سیاسی و اقتصادی حالات اور زبان و لسانیات کے مسائل کو "ملاحظات" کا موضوع بنایا ہے۔ اور اس کے لیے جس سائنسی و عقلی اندازِ نظر اور فن کارانہ صلاحیتوں کی ضرورت تھی۔ نیازؔ میں وہ بدرجۂ اُتم موجود تھیں۔ اگرچہ اُنہیں اِس بات کا احساس تھا کہ ہندوستان کی صحافت عدم متانت کی وجہ سے ناقص و نامکمل ہے اور نیازؔ کے مطابق وہ دور رسائل کے لیے سخت کٹھن بھی تھا لیکن وہ کسی طور پر مشکلات کے سامنے سپر انداختہ ہونے پر آمادہ نہ تھے۔ اِس لیے اُن کا قلمی جہاد برابر جاری رہا۔ اور اُنہیں اِس بات پر فخر ہے کہ نگار نے جو ذہنی انقلاب پیدا کیا ہے وہ صحافت کی دُنیا کا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اِسی سلسلے میں خود لکھتے ہیں:-

"نگار نے گذشتہ سالوں کے اندر جو خدمت زبان و علم کی انجام دی ہے یا جو ذہنی انقلاب اُس نے پیدا کر دیا ہے، وہ صحافت کی دُنیا کا ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے جس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ احباب نکتہ سنج نے اپنے

اعتراف سے اور اربابِ حسد نے اپنے اعتراض[1] سے بارہا اس کو تسلیم کیا ہے اور کرتے رہیں گے۔"

"ملاحظات" کا سب سے اہم موضوع وہ سیاسی حالات و واقعات ہیں جن پر بہت کم لوگوں نے پوری بے باکی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ اِن میں برصغیر کے سیاسی حالات، کانگریس، مسلم لیگ، جمعیت العلمائے ہند، جماعت اسلامی، اور دوسری جماعتوں کے نظریات و کردار، اثرات و نتائج، دو قومی نظریہ، مذہبی مسائل، ہندی اُردو تنازع سبھی کچھ زیرِ بحث آتے ہیں۔ نیازؔ نے نہ صرف مُلکی سیاست کو موضوع بنایا بلکہ دوسری جنگِ عظیم، جرمن اور اتحادی قوتیں، تنازع و تصادم اور اُس کے نتائج و اثرات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف بین الاقوامی سیاسی نظریات، قومیت، اشتراکیت، اشتمالیت، جمہوریت اور دوسری متحرک تحریکوں پر بھی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔

"نگار" کا خاص سیاسی اداریہ سب سے پہلے ستمبر ۱۹۲۶ء میں لکھا گیا۔ جو بمبئی میں "لگان کے اضافے" اور "نہرو رپورٹ" سے متعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیازؔ کانگریسی تھے اور کانگریس ہی کو ملک کا سب سے زیادہ اہم سیاسی ادارہ سمجھتے تھے۔ اور اُنہوں نے اُس وقت کے بے شمار سیاسی رہنماؤں اور صحافی مبصروں کی طرح مسلمانوں کو بھی یہی مشورہ دیا کہ اُنہیں کانگریس میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ اِس کے باوجود وہ آنکھ بند کر کے ہر بات کو تسلیم کرنے کے قائل نہ تھے۔ تحقیق و جستجو، تدبر و تفکر اُن کی فطرت میں شامل تھا۔ اِسی لئے لکھتے ہیں:-

"میں کانگریسی خیال کا آدمی ہوں اور کانگریس ہی کو مُلک کا سب سے اہم سیاسی ادارہ سمجھتا ہوں۔ تقلید و تتبع میری فطرت کے خلاف ہے اور بلا تحقیق و جستجو بلا تفکر و تدبر ضمیر کے منافی، میں کبھی کوئی راہ اختیار نہیں کرتا۔ اِس لئے

---

[1] "ملاحظات"، فروری ۱۹۲۹ء، ص۔ ۲، جلد۔ ۱۵، شمارہ ۔ ۲

کانگریس کی حمایت کے معنی میری لُغت میں یہ نہیں ہو سکتے کہ اگر اس میں
کوئی خامی یا نقص پایا جائے تو مَیں اُس کی بھی تعریف کروں اور اگر کسی وقت
وہ اپنے مقصد یا عمل کے لحاظ سے قابلِ اعتراض ادارہ بن جائے تو بھی مَیں
اُس کا حامی بنا رہوں[۱۸]۔"

نیاز نے ملکی مسائل کے سلسلے میں ہمیشہ مثبت، صحت مندانہ اور ترقی پسندانہ روّیہ اپنایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ قوموں کی ترقی کے لئے انقلاب بے حد ضروری ہے اور دُنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں بچے جس نے انقلاب کو بغیر مقابلہ، صدمات و خطرات کے قبول کر لیا ہو۔ انقلاب خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، یہ ان تمام نقوش و آثار کو بدل دینے کا نام ہے جو حالات کی تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ لیکن اس کے لئے خاص اُصول و ضوابط کی ضرورت ہے۔ نیاز کے مطابق اُصول بے کار چیز ہیں اگر اُن پر عمل نہ کیا جائے دُنیا میں جب کوئی انقلاب رُونما ہُوا تو وہ محض اُصولوں کا نہیں شخصیتوں کا مرہونِ منت تھا۔ اور جب وہ شخصیتیں نہ رہیں تو اُصول بے کار ہو گئے۔ نیاز کا موقف ہے کہ اتحاد و اتفاق اور جذبۂ یگانگت و محبت کے بغیر آزادی کا حصول ناممکن ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وطنیت کے رشتہ کو مستحکم کیا جائے کیونکہ ایک ایسے ملک کی ترقی جس میں مذاہب کے لحاظ سے مختلف جماعتیں پائی جائیں، اُن میں غرضِ مشترک اور مرکزیت صرف وطنیت کے جذبہ سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اتحاد و اتفاق کی اسی ضرورت پہ زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگر ہندو مسلمان چاہتے ہیں کہ صحیح معنی میں باہم اتحاد پیدا ہو تو اُن کا اوّلین
فرض یہ ہے کہ وہ تمام اُن نقوش کو قلب سے محو کر دیں جن سے بوئے عصبیت
آتی ہے۔ ورنہ جب تک ہندو یونیورسٹی کا نام ہندو یونیورسٹی، اور مسلم یونیورسٹی
کا نام مسلم یونیورسٹی ہے اور جب تک ہندو چوٹی میں گرفتار ہے اور مسلمان اپنی ریش دراز

۱۸۔ "ملاحظات" نگار۔ جون ۱۹۳۸ء ص ۳۔ جلد ۲۳، شمارہ ۶

میں جس وقت تک مذہب کا مفہوم اخوتِ عامہ اور انسانیت پرستی
نہیں ہو جاتا نہ ہندوستان کبھی آزاد ہو سکتا ہے اور نہ حُریت کی صحیح رُوح
پیدا ہو سکتی ہے۔ آزادی نام ایک کیفیت کا ہے جو پہلے قلبِ انسانی
میں خود اُس کے آزاد ضمیر کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور وہ علائقِ مذہب و ملت
سے بہت بلند ہے[۱۹]۔"

نیاز نے نہایت ہمت و جرأت سے حالات کا تجزیہ کیا ہے۔ آزادیٔ رائے اور حریتِ قلم کی جیسی پاسداری اُنہوں نے کی ہے ذرا کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اور پھر اداریے میں سیاسی حالات جس ٹھوس اور تحقیقی انداز میں پیش کئے ہیں وہ نگار کے علاوہ کسی علمی و ادبی رسالے میں نظر نہیں آتے۔ برصغیر کی دو بڑی اور اہم جماعتوں کے منشور، کمزوریوں اور اُن کے اختلافات کا ایسا تجزیہ کیا ہے کہ اُن کی سیاسی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بقول نیاز آزادی کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اتحاد و اتفاق ہی کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"ملک کی آزادی نہ گول میز کانفرنس سے مل سکتی ہے نہ سول نافرمانی سے بلکہ
وہ میسّر آسکتی ہے صرف اتحاد و اتفاق سے۔ اور یہ اُس وقت ممکن ہے جب
چھوٹی جماعتوں کے دلوں سے تمام اندیشے نکال دیئے جائیں۔ نہرو رپورٹ خواہ
کتنی ہی مناسب کیوں نہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے دل خطرات سے لبریز
ہیں اور عملی زندگی کے تجربات نے اِن کو ہندوؤں کی طرف سے سخت بدظن و بددل
کر رکھا ہے۔ اگر آج گاندھی اور نہرو نہایت فراخدلی سے اِس اَمر کا اعلان
کر دیں کہ وہ مسلمانوں کی تمام شکایات سُننے اور ان کی امداد کے لئے تیار ہیں تو ابھی
یہ دورِ تذبذب دُور ہُوا جاتا ہے۔ اور منزلِ مقصود قریب، لیکن ہم کو معلوم ہے

۱۹۔ "ملاحظات" نگار۔ مارچ ۱۹۲۹ء ص ۱۰ جلد ۱۵، شمارہ ۳

کہ یہ نہیں ہوگا اور حصولِ آزادی کے بعد ایک نہایت المناک قسم کی اندرونی جنگ شروع ہوگی اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس انتشار کا نتیجہ کیا ہوگا[1]۔"

برِ صغیر کی دو بڑی جماعتیں ہندو اور مسلمان، جن کا نصب العین آزادی تھا مگر ایک دوسرے پر اعتماد کرنے پر تیار نہ تھے۔ ایسی فضا میں نیازؔ نے توازن و اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اُنہوں نے جانبدارانہ رویّہ سے اجتناب کیا لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے برملا کہا کہ جتنی قدامت پرستی ہندوؤں میں پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں نہیں ہے اور ہونا بھی نہ چاہیئے کیونکہ مذہب اسلام انسان کو جن اُصولوں پر کاربند کرنا چاہتا ہے وہ یکسر ذہنی آزادی کے حامی ہیں۔ اُس کی سب سے اہم تعلیم تفکّر و تدبّر کی ہے اور وہ اُس ذہنیت کو ختم کرنا چاہتا ہے جو غلامانہ احساس پیدا کرتی ہے۔

نیازؔ کا کہنا ہے کہ کسی قوم میں قومی تشخّص اور ذہنی بیداری کی دو صورتیں ہُوا کرتی ہیں کہ یا تو اُس میں بعض افرادِ صالح ایسے پیدا ہو جائیں جو قومی جمود کو دُور کر دیں یا پھر افرادِ قوم کے اندر کسی خارجی اثر سے ذہنی اضطراب پیدا ہو جائے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اب جاگنا ہوگا اور ٹھوس اقدامات کرنا ہوں گے اس لیئے کہ بقول نیازؔ:۔

"ہندوستان کا مسلمان اس وقت جن راہوں سے گزر رہا ہے وہ اس قدر دشوار گذار ہیں کہ اگر کوئی فوری انقلاب نہایت ہی شدید قسم کا ان میں رُونما نہ ہُوا تو ان کے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ اور ان کا بالکل وہی حشر ہوگا جو ہسپانیہ کے مسلمانوں کا ہُوا کہ چند منہدم آثار تو ان کے باقی رہ گئے ہیں لیکن وہ خود کہیں نہیں پائے جاتے[3]۔"

---

1 :۔ "ملاحظات" نگار مارچ ۱۹۳۰ء، ص ۷، جلد ۱۷، شمارہ ۳

2 :۔ "ملاحظات" مارچ ۱۹۳۷ء، ص ۳، جلد ۳۱، شمارہ ۳

3 :۔ "ملاحظات" نگار نومبر ۱۹۳۲ء، ص ۶، جلد ۲۲، شمارہ ۵

نیازؔ ہندوستان کے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ اُنہیں مایوسی، انتشار و افتراق سے بچانا چاہتے تھے۔ اُن کا مؤقف تھا کہ جس طرح انفرادی طور پر انسان کی زندگی میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جو اُس کی دُنیائے خیال میں انقلابِ عظیم پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی میں بھی بعض ساعتیں ایسی آتی ہیں کہ قومی ذہنیت بدل دینے کی بڑی زبردست قوت ان کے اندر ودیعت ہوتی ہے۔ اگر کوئی جماعت ان ساعتوں کی اہمیت سمجھ کر ان سے فائدہ اُٹھا لیتی ہے تو زندہ رہتی ہے ورنہ زمانہ کا پہیہ گھومتا ہُوا آتا ہے اور ہمیشہ کے لیئے پامال کر کے چلا جاتا ہے۔ نیازؔ نے مسلمانوں کو وقت کی ضروریات کا احساس کرنے اور اُن کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دینے کا سبق دیا۔ انہوں نے تحریکِ خلافت اور تحریکِ تبلیغ کی مخالفت بھی اسی لیئے کی کہ وقت کا تقاضا کمیت نہیں کیفیت تھا اور یہی تقاضا اسلام کا بھی ہے اسی لیئے لکھتے ہیں:۔

"اسلام نے ہمیشہ کمیت کے مقابلہ میں کیفیت کو ترجیح دی ہے اور اسی بنا پر اُس کے دس افراد نے مخالف کے سو افراد کو نیچا دکھایا ہے لیکن اب ہماری ذہنیت یہ ہے کہ صرف تختۂ مردم شماری میں چند ناموں کا اضافہ دیکھنے کو کافی سمجھتے ہیں اور غالباً یہی بڑا ثبوت ان کے نزدیک اسلام کی صداقت کا ہے۔ اس وقت ضرورت تو اس کی ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ سات کروڑ کی تعداد کو بھی گھٹا کر نصف کر دیا جائے تاکہ جلد سے جلد اُن کی تنظیم ہو سکے نہ یہ کہ اس میں اور ناکارہ افراد کا اضافہ کر کے اصلاح کو اور زیادہ دشوار بنا دیا جائے[4]۔"

علاّمہ نیازؔ نے نام نہاد مولویوں اور مذہب کا استحصال کرنے والوں کے خلاف ہمیشہ ایک مضبوط

---

4 :۔ "ملاحظات" نگار فروری ۱۹۳۲ء، ص ۷، جلد ۲۱، شمارہ ۲

محاذ بنائے رکھا۔ جہاں اُنہوں نے بغیر استدلال بلند و بانگ دعوے اور ملّتِ اسلامیہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی، علامہ کا قلم حرکت میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز نے "جمعیت العلمائے ہند" "جمعیت العلمائے اسلام" اور "جماعتِ اسلامی" پر کڑی تنقید کی ہے کہ جدوجہدِ آزادی میں عملی طور پر شامل ہونے سے کتراتے ہیں:-

" لاہور کانگریس کا فیصلہ آزادی، صداقت و حقیقت سے ایک ایسی آواز ہے جس پر ہزار مصلحتیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ اور جس کے سُننے کے بعد ہر انسان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اُس پر لبیک کہہ کر دوڑ پڑے۔ لیکن کس قدر حیرتناک منظر ہے کہ ہندوستان کی ایک جماعت جو آٹھ کروڑ نفوس پر مشتمل ہے اور جو مذہباً اور اخلاقاً اپنے آپ کو حریتِ آزادی کا بڑا علمبردار جانتی ہے۔ اِس وقت ساکت اور خاموش ہے۔ اور اُس پر وہ کیفیت جمود و تعطّل کی طاری ہے جس کو ہم صرف موت کی بے حسی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ علمائے کرام کی جماعت ہے ___ اور جمعیۃ العلماء موجودہ حالات و سیاسیات پر مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہی ہے کہ کچھ مسلمان تو حکومت سے مل جائیں اور کچھ مُلک کی مختلف سیاسی جماعتوں سے۔ یہ منافقانہ، بُزدلانہ اور غیر مسلمانہ مشورہ ہے۔[1]"

نیاز کا کہنا ہے کہ ایک مولوی تبلیغِ اسلام کے نام سے جماعت قائم کر کے بے معنی ذہنیت رکھنے والے افراد کا اضافہ تو کر سکتا ہے۔ قرآن و حدیث کی غلط توضیحات کے ذریعے گمراہ کن اور مہمل دفاتر تو پیش کر سکتا ہے لیکن اُس کو یہ سلیقہ حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ مُلک کی فلاح پر غور کر کے وطن کی سیاسی اقتضا کو سمجھے اور ایثار و قربانی کا درس دے سکے علمائے کرام کی اِنہی جماعتوں کا تجزیہ

[1]: "ملاحظات"۔ اپریل ۱۹۳۰ء۔ ص ۴، ۵، جلد ۱۷، شمارہ ۴

کرتے ہوئے نیاز لکھتے ہیں:-

"جمعیۃ العلماء کے جس گروہ نے آزادیٔ مُلک کے نصب العین کو سامنے رکھ کر تحریک کانگریس میں شرکت کا رزولیوشن پاس کیا ہے اِس کی حقیقت بھی سب کو معلوم ہے اور جس جماعت نے اُس کی مخالفت میں آستانہ حکومت پر جبہ سائی کو ترجیح دی ہے اُس کا حال بھی کسی سے مخفی نہیں۔ کیونکہ نہ اُس جماعت میں یہ ہمت و جراُت ہے کہ عملاً وہ اِس تحریک کو بار آور بنائے اور نہ اس میں سلیقہ کہ حکومت ہی سے کوئی جائز یا ناجائز فائدہ اٹھاسکے مسلمانوں کو جان لینا چاہیئے کہ اِس وقت اُن کی جماعت میں کوئی قائد رہنما کوئی مولوی اور مولانا اِس قابل نہیں ہے کہ اُس کے اقوال و افعال پر اعتماد کیا جائے۔[1]"

نیاز کا قلم حقیقتاً ایک سچّے اور نڈر مدیر کا قلم تھا۔ اُنہوں نے ہر اُس مسئلے کو ملاحظات کا موضوع بنایا ہے جو اُس ہنگامہ خیز دور میں پیدا ہُوا۔ اُنہوں نے حقائق و واقعات اور واقعات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتے ہوئے ایک خاص نتیجہ بھی نکالا ہے۔ اداریہ نویس کے لئے متوازن معاملہ فہم اور دُور اندیش ہونا ضروری ہے۔ نیاز نے اپنے اِنہی اوصاف سے کام لیتے ہوئے غیر جذباتی انداز میں، واقعات کو منطقی شہادتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُن کی رائے معقول اور مدلل ہے۔ اُنہوں نے اگر کسی جماعت، شخصیت، نظریئے، فلسفے یا نظام کی مخالفت بھی کی ہے تو نہایت معقولیت کے ساتھ۔ نہ کسی کی بے جا تعریف کی ہے اور نہ بے بنیاد جذباتی مخالفت محض پروپیگنڈے سے کام لیا ہے اور نہ ہی انفرادی یا اجتماعی طور پر نفرت و اشتعال پھیلانے کا رویہ اپنایا ہے بلکہ حالات و واقعات کو نہایت دیانت داری اور ٹھنڈے دل و دماغ

[1]: ملاحظات۔ نگار جُون ۱۹۳۰ء۔ ص ۲، جلد ۱۷، شمارہ ۶

سے غور و فکر کرنے کے بعد پیش کر دیا ہے۔ اِن کا قلم بڑے سے بڑے جذباتی مسئلے میں بھی راہِ اعتدال سے بہت کم ہٹتا ہے۔ پنجاب کے ایک آریہ سماجی لیڈر راجپال نے "رنگیلا رسول" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جس سے مسلمانوں میں غم و غصّہ کی شدید لہر دوڑ گئی۔ راجپال کو ایک مسلمان نے مذہبی جوش و عقیدت میں قتل کر دیا جس سے ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہو گئی لیکن نیاز یہاں بھی اعتدال و توازن برقرار رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہر چند راجپال نے رنگیلا رسول لکھ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ کوئی ایسا دماغ لے کر نہیں آئے جس کے نقدان پر کسی قوم کو ماتم کرنے کی ضرورت ہو بلکہ وہ دماغ بھی وہی ذہنیت رکھتا تھا جو ان کے قاتل کی تھی۔ لیکن اس کی شکایت ہم ہندوؤں سے نہیں کر سکتے کیونکہ مسلمانوں میں بھی متعدد راجپال پائے جاتے ہیں اور آج پنجاب کے ہندو مسلمان اخباروں کی روش کا اقتضا تو یہی ہے کہ وہاں روز ایسی ہستیاں پیدا ہوں"۔ [1]

۱۹۳۱ء میں مسجد شہید گنج کی وجہ سے کانپور میں شدید ہندو مسلم فساد ہُوا۔ نیاز کا موقف تھا کہ مسجد ہو یا مندر محض عمارت ہونے کی وجہ سے اُن کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ تمدن و معاشرت کے باہمی تعلقات میں صرف مادی چیزوں کی قیمت کا سوال نہیں ہوتا بلکہ اُن جذبات و کیفیات کا ہوتا ہے جو اجتماعی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ مسجد شہید گنج گو غیر آباد، ویران و مسمار تھی مگر اس کے باوجود مذہبی حیثیت سے تمام مسلمانوں کے نزدیک واجب الاحترام تھی اور اُسے ڈھا دینے سے مسلمانوں کو صدمہ پہنچنا ایک فطری امر ہے۔ نیاز نے سکھوں کی اس حرکت کو غیر دانشمندانہ اور قومی وقار کے لئے خطرہ قرار دیا۔ لیکن فساد کے اصل محرک پر بھی اُن کی نظر تھی۔ اور وہ محرک انگریزی حکومت کا پیدا کردہ تھا چنانچہ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[1] "ملاحظات" نگار مئی ۱۹۲۹ء ص ۵۔ جلد ۱۵۔ شمارہ ۵

"جب ۱۹۰۸ء میں مسلمانوں کے وفد کو جُداگانہ انتخاب کی لعنت کا طوق مرحمت ہُوا تھا۔ یہ حکومت کی اتنی زبردست چال تھی کہ نہ اُس وقت مسلمانوں نے اس کو سمجھا اور نہ اب سمجھنے کو تیار ہیں۔۔۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہندو مسلم جماعتوں میں آہستہ آہستہ باہم اختلاف پیدا ہونے لگا۔ اور عصبیت اور فرقہ واری مستحکم ہونے لگی۔۔۔ ۱۹۰۸ء سے قبل جُداگانہ انتخاب کا وجود نہ تھا۔ نہ کہیں ناقوس و اذان پر جھگڑا ہوتا تھا اور نہ گائے قربانی کہیں نزاع ہوتی تھی، کیونکہ ایک کے مفاد دوسرے سے متعلق تھے اور ہر فریق مجبور تھا کہ دوسرے فریق کے ساتھ صُلح و آشتی سے کام لے"۔

ہندو چونکہ مسلمانوں کے مقابلے میں اکثریت میں تھے اس لئے اُن کی طرف سے ظلم و تشدد کے واقعات زیادہ ہوئے۔ نیاز نے کانپور بھی جا کر خود حالات و واقعات کا جائزہ لیا۔ وہاں کے دردناک حالات پر نیاز کا دل بہت غم زدہ ہُوا چنانچہ وہ انتہائی جذباتی انداز میں لکھتے ہیں:

"کانپور کے دردناک ہنگامہ کی تفصیل فراموش کی جا سکتی ہے۔ مندروں اور مسجدوں کے واقعات انہدام بھلائے جا سکتے ہیں۔ آتش زنی اور غارت گری کے واقعات بھی دلوں سے محو ہو سکتے ہیں لیکن ہندو قوم کی اس داستانِ شجاعت کو کبھی صفحۂ تاریخ سے نہیں مٹایا جا سکے گا کہ اُس نے مسلم عورتوں کو پناہ دینے کے بہانہ سے اپنے گھروں میں بُلایا اور پھر مکان کے اندر بند کر کے، اُن کے بچوں کو اُنہیں کے سامنے ذبح کر کے اُن کو بھی انتہائی بیدردی و شقاوت کے ساتھ تڑپا تڑپا کے ہلاک کر ڈالا۔ حیران ہوں کہ ایک انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والی جماعت اس نوع کی دناءت و رذالت

[1] "ملاحظات" نگار جون ۱۹۳۱ء، ص ۲، جلد ۱۹، شمارہ ۶،

اِس قسم کا ذلیل کمینہ پن اور اِس طرح کی وحشت و درندگی کا اظہار کر سکتی ہے تو ایک بھیڑیے کی نسل سے پیدا ہونے والے بچّے اور کن خصوصیات کو لے کر پیدا ہوں گے اور دُنیا اِن دونوں کے درمیان کیونکر خطِ امتیاز کھینچ سکے گی۔[1]"

نیازؔ نے وقت کے اہم ترین مسائل کی طرف خاص توجہ کی اور ہمیشہ کوشش یہی رہی کہ انتشار و تفریق کی بجائے صُلح و مصلحت سے مسائل کا حل ڈھونڈھ لیا جائے لیکن اگر کسی گروہ یا جماعت کی طرف سے زیادتی ہوئی تو وہ اُسے کُھلے لفظوں میں منظرِ عام پر لانے سے قطعاً نہ گھبراتے۔ ہندو اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے والے عناصر میں ایک اور اہم مسئلہ "زبان" اور "رسم الخط" سے متعلق تھا۔ نیازؔ کا مؤقف ہے کہ سب سے نمایاں چیز جو بیک وقت ایک قوم کو دوسری قوم سے متمیز کرنے والی بھی ہے اور افرادِ قوم کی شیرازہ بندی بھی، وہ زبان ہے۔ کہ اس کو سُنتے ہی ہم جان لیتے ہیں کہ فلاں شخص کس ملک و قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اگر وہ اپنا ہم زبان ہے تو فوراً جذبۂ ہمدردی و اخوت میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اِس لیے اصلاحِ زبان و تحفظِ زبان کا مسئلہ ہمیشہ تمام قوموں میں نہایت اہم مسئلہ رہا ہے۔ چنانچہ ہندی اُردو جھگڑا ابھی ایک سیاسی تنازع بن چکا تھا۔ ہندوستان بھر کی ادبیات انجمن کا اجلاس[2] تذکرہ نگار جولائی ۱۹۳۶ء مضمون "بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت" ۲۴، ۲۵ اپریل ۱۹۳۱ء کو ناگ پور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہُوا تو اُنہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اُردو زبان صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ "اُردو" کی بجائے "ہندی" یا "ہندوستانی" نام کی تجویز متفقہ طور پر منظور کی گئی اور طے یہ پایا کہ عربی، فارسی الفاظ کی بجائے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے جائیں اور

[1] "ملاحظات" نگار جون ۱۹۴۳ء، ص ۵، جلد ۱۹، شمارہ ۲

دیوناگری رسم الخط عام کیا جائے۔ ہندوؤں کی انجمنیں اس سلسلے میں بہت متحرک اور فعال نظر آنے لگیں لیکن مسلمان اُردو کی ترقی و اشاعت کے لیے کچھ نہ کر رہے تھے۔ چنانچہ اس مسئلے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے نیازؔ لکھتے ہیں:۔

"آپ مسلم کانفرنس، مسلم لیگ اور انجمن ہائے خلافت و تبلیغ وغیرہ کی تمام روئدادیں پڑھ لیجئے۔ آپ کو کسی ایک جگہ بھی اُردو زبان کی حفاظت و ترقی کا ذکر نظر نہ آئے گا اور کبھی کسی ایک لیڈر کی زبان سے آپ نے یہ نہ سُنا ہوگا کہ مسلمانوں کی حیثیت اجتماعی میں اُردو زبان کو بھی کوئی اہمیت حاصل ہے اور تو اور خود ہماری مسلم یونیورسٹی نے اس وقت تک کوئی ایسا لائحہ عمل پیش نہیں کیا جو اس باب میں ہماری رہنمائی کر سکے الغرض اُردو زبان اس وقت حد درجہ نازک دَور سے گزر رہی ہے اور ہندو مسلم نزاع کے سلسلے میں اس نے خاص سیاسی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس لئے اگر اس سیاسی جنگ میں ہندوؤں کو کامیابی حاصل ہوئی جس کے کُھلے ہوئے اسباب ہر چہار طرف نظر آ رہے ہیں تو اُردو زبان اور رسم الخط کے مستقبل کی تاریکی روزِ روشن سے زیادہ"[1]

اُردو کی اشاعت، ترقی و ترویج کے لئے ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ میں اُردو اکیڈمی قائم کی گئی جس کے تین شعبے، اُردو زبان کی وسعت، فاضل اُردو اور کامل اُردو کی ڈگری دینا معیاری تصانیف پر انعامات دینا تھا۔ نیازؔ نے اس اکیڈمی کی بہت تعریف کی۔ نیازؔ کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سب سے بڑی خلیج جس چیز نے حائل کر دی ہے ——— وہ ہندی اُردو جھگڑا ہے۔ مسئلہ قراردادیں پاس کرنے سے حل نہ ہوگا بلکہ اس کے لئے تجاویز پر عمل کرنا چاہئے کانگریس اور مسلم لیگ کا رویہ دیکھتے ہوئے نیازؔ نے جو لائحہ عمل پیش کیا وہ معقول و معتدل ہے

[1] "ملاحظات" نگار ستمبر ۱۹۳۵ء، ص جلد ۲۸، شمارہ ۳

جس سے انتشار اور تنازع کو کم کیا جا سکتا تھا۔

"مشترک زبان کے باب میں سب سے پہلی اور اُصولی بات جس پر ہندو مسلمانوں دونوں کا اتفاق ہونا چاہیئے یہ ہے کہ مُلک کی زبان سے مراد وہ زبان ہے جس کو دونوں فریق آسانی سے سمجھ سکیں اور اسی اُصول کی بنا پر کانگرس نے "ہندوستانی" کی رواج کی تجویز کی۔ اس میں سوال نہ عربی فارسی الفاظ کا ہے نہ سنسکرت کا۔ اگر عربی فارسی کا کوئی لفظ ایسا ہے جسے سب آسانی سے سمجھ سکتے ہیں تو اسے نکالنے کی کوئی وجہ نہیں اور اگر ثقیل عربی یا فارسی لفظ کی جگہ اس سے زیادہ لفظ ہندی کا مل سکتا ہے تو اس کے اختیار کرنے میں مسلمانوں کو کوئی عُذر ہونا چاہیئے؟"[5]

اسی دوران گاندھی جی کی یہ سیاسی چال کہ اُردو کا نام بدل کر "ہندی" رکھ دیا جائے۔ اور یہ مہم تیز سے تیز تر ہو گئی۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی طرف سے جناب ڈاکٹر اشرف صاحب ناظم شعبۂ اطلاعات سیاسی نے ایک پمفلٹ "گاندھی جی اور اُردو" شائع کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ اصل گاندھی جی "ہندی" کے مفہوم کو اتنا وسیع کرنا چاہتے ہیں کہ اُردو اُس میں شامل ہو جائے۔ ڈاکٹر اشرف گاندھی جی کو بے تعصب ثابت کرنا چاہتے تھے لیکن نیاز نے یہ اہم سوال اُٹھایا کہ آخر نام کیوں بدلا جائے؟ دراصل ہندوؤں کا یہ زمانہ نشاۃ ثانیہ کا تھا اور جب کوئی قوم اس دور سے گذرتی ہے تو ہر چیز کو خالصتاً دھنی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے۔ زبان کا تعلق براہِ راست کلچر سے ہے۔ اسی لئے ہندو اپنی زبان کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ نیاز اس رویے سے بدظن ہوتے ہندو مسلم تنازع اور دونوں جماعتوں میں اجنبیت کی ایک وجہ ہندی اُردو بھی بنا چنانچہ اسی سلسلے میں نیاز لکھتے ہیں:

"یہ بالکل صحیح ہے کہ کانگرس سے مسلمانوں کی علیٰحدگی کے اسباب متعدد ہیں لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ انہیں میں ایک سبب اُردو ہندی نزاع بھی ہے۔ شرکت کار کے لئے اصل چیز دو جماعتوں کی ذہنیتوں کا اشتراک ہے۔ اور یہ بغیر اخلاقی رواداری کے ممکن نہیں۔ پھر اگر کسی ایک جماعت کے طرزِ عمل سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس رواداری کے لئے تیار نہیں تو قیامت تک اتحادِ عمل ممکن نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مذہب کے باب میں ہندوؤں نے رواداری سے کام لیا ہو، ممکن ہے کہ سیاسیات میں اُنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ بہت رعایت کی ہو، لیکن زبان کے مسئلہ میں اُنہوں نے بطرف یہ کہ رواداری کام نہیں لیا بلکہ اُردو کی مخالفت کی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جماعتوں میں بہت زیادہ اجنبیت پیدا ہو گئی ہے۔"[6]

برصغیر کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں پر نیاز کی نظر بہت گہری تھی اُن کے انتقادات سے تحریک آزادی کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی۔ نیاز کو اب یقین ہو گیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے۔ کیونکہ مذہبی مسائل اور دو قومی نظریہ برصغیر کے مسلمانوں میں گھر کر چکا تھا۔ اور وہ اب ہر قیمت پر آزادی چاہتے تھے۔ لیکن انہیں کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے یہ شکوہ تھا کہ انہوں نے اپنی تقدیر کا فیصلہ انگریزوں اور کیبنٹ مشن کے سپرد کر دیا ہے۔ انہوں نے آزادی خوشی سے نہیں دی بلکہ وہ اس کے لئے مجبور ہیں۔ اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے خود اس بہت کی دعوت دی ہے۔ اسی نظریئے کے تحت نیاز انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ دینے کی ٹھوس وجہ اور اصل محرک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انگریز یہاں سے جا رہے ہیں اور اس طرح جا رہے ہیں کہ ہندوستان کے

---

[5] ملاحظات، نگار، اکتوبر ۱۹۳۶ء، ص ۷، جلد ۲۳، شمارہ ۴

[6] ملاحظات، نگار، جون ۱۹۳۶ء، ص ۹، جلد ۳۱، شمارہ ۶

ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ اس ملک کو کئی صدی
پیچھے ہٹا کر جا رہے ہیں۔ اور اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ
ہم نے خود اس رجعت کو دعوت دی ہے۔ انگریز ہندوستان کو خوشی سے
نہیں چھوڑ رہا بلکہ حالات نے اُسے مجبور کر دیا ہے۔ برطانیہ کو یقین ہو گیا ہے
کہ ہندوستان کو اب آزادی سے محروم رکھنا آسان نہیں۔ اور اس غرض کے لئے
اسے اتنے مصارف برداشت کرنے پڑیں گے کہ بہ لحاظ نتیجہ وہ نقصان
میں رہے۔ اس لئے وہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور تو ہے لیکن اس کے
ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہندوستان سے جتنا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے،
اُٹھائے رہے۔[1]"

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دو آزاد مملکتیں "پاکستان" اور "ہندوستان" وجود میں آ گئیں یہ ذہنی نظریاتی اور تہذیبی تقسیم تھی لیکن ہندو، مسلم اب واضح طور پر ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اور آزادی کے لئے مال و جان کی جتنی اور جس جس طرح سے قربانیاں دینا پڑیں۔ ایسی مثالیں تاریخ میں کم ہی ملتی ہیں اس آزادی کی قیمت بہت سے گھرانوں کو بہت بھاری ادا کرنا پڑی۔ بے دریغ خون ریزی، قتل و غارت گری، عورتوں اور بچوں پہ جو جو مظالم ڈھائے گئے وہ بھی صفحۂ تاریخ پہ کم ہی نظر آئیں گے۔ اس ظلم و ستم کو دیکھ کر نیاز بہت افسردہ ہوئے اُنہیں اس بات کا شدید غم تھا کہ آزادی ملی بھی تو اس عالم میں کہ ایک ملک سے دو ملک وجود میں آئے۔ اور وہ لوگ جو صدیوں سے اکٹھے رہ رہے تھے، شدید نفرتوں کا شکار ہو کر ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے۔ ان نفرتوں سے آزادی کی ساری تسکین ملیامیٹ ہو گئی چنانچہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان آزاد ہو گیا اور اس میں شک نہیں کہ دُنیا کی تاریخ میں کوئی مثال

[1] "ملاحظات" جون ۱۹۴۷ء، ص ۳، جلد ۵۱، شمارہ ۶

ایسی نہیں ملتی کہ صاحب حکومت سے جنگ کئے بغیر کسی ملک نے آزادی
حاصل کی ہو۔ لیکن اس کی بھی کوئی مثال تاریخ میں نہیں ملتی کہ حصولِ آزادی کے
زمانہ میں ایک ہی ملک کی مختلف قوموں نے اس قدر خونریزی کی ہو جتنی ہندوستان
میں ہوئی اور ہو رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بظاہر دیکھنے میں آزادی کا پرچم
ہر جگہ لہرا رہا ہے لیکن لوگوں کے دل غمگین ہیں، روحیں افسردہ ہیں اور بجائے
مسرتوں کے سینہ غموں سے لبریز ہے۔[1]"

برصغیر کی تقسیم کے بعد بھی وہ حالات و واقعات کا تجزیہ "ملاحظات" میں پیش کرتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں "نگار" کا سالنامہ "پاکستان نمبر" کے نام سے شائع ہوا۔ پورا پرچہ نیاز کا لکھا ہوا ہے۔ اور اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے دُنیا پر حکومت تلوار کے ذریعے نہیں بلکہ رواداری و اخوت کے ذریعے کی ہے۔ پاکستان کی اپنی تعمیر میں مسلمانوں کو یہی اُصول سامنے رکھنا چاہیئے۔

نیاز نے صرف ملکی حالات و واقعات ہی کو "ملاحظات" کا موضوع نہیں بنایا بلکہ بین الاقوامی تبدیلیوں پر بھی گہری نظر رکھی ہے۔ یوں مختلف تبدیلیوں کے مخصوص اسباب اور اصل محرکات کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ نیاز کو افغانستان کے سربراہ امان اللہ خان کے ملک کے لئے جذبۂ خلوص کا بھرپور اندازہ تھا۔ اور اُن کی جلا وطنی پر نیاز نے "ملاحظات" کو سیاہ حاشیے کے ساتھ شائع کیا لیکن حالات کا جو تجزیہ نیاز کی دُوربین گہری بصیرت نے ۱۹۲۹ء میں کیا تھا وہ موجودہ افغانستان سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"بیرونِ ہند کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم واقعہ انقلابِ افغانستان کا
ہے کہ ایک بغاوت جو پہلے بہت معمولی معلوم ہوتی تھی یہاں تک اہمیت
اختیار کر لی کہ امیر امان اللہ خاں کو سلطنت چھوڑ کر کابل سے قندھار آنا پڑا۔

[1] "ملاحظات" ستمبر ۱۹۴۷ء، ص ۳، جلد ۵۲، شمارہ ۳

حکومت برطانیہ نے اس بغاوت کو پیدا کیا ــــ رُوس اس قابل ہوتا تو موجودہ انقلاب افغانستان کی عام اقتصادی حالت کا کمزور ہو جانا ہے اور اس کے بعد دوسرا سبب وہاں کے عمال کا ناقابل ہونا ــــ واقعہ یہ ہے کہ افغانستان اُن ملکوں میں سے ہے جہاں نہایت آسانی سے ملوک الطوائف پیدا ہو سکتے ہیں۔[18]"

حقیقت یہی ہے کہ افغانستان کے حالات آج بھی نیاز کے تجزیے سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتے۔ نیاز کا مؤقف یقیناً قابلِ فکر ہے کہ مادی ترقی کی کوئی حیثیت نہیں اصل ترقی انسانیت اور اُس کی روایت و اقدار کی ترقی ہے لیکن انسان جُوں جُوں مادی ترقی میں آگے بڑھتا جا رہا ہے وہ انسانی اور رُوحانی اعتبار سے اُتنا ہی کمزور اور پست ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ترقی معکوس انسان کو انسان سے بہت دُور لے جا رہی ہے۔ ایشیا اگر بیدار ہو رہا ہے تو اُسے پہلے یہ سوچنا ہو گا کہ ترقی کی کن راہوں اور کن اُصولوں کو اُسے اپنانا چاہیئے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آج ایشیا اگر بیدار ہو رہا ہے تو اُس کو پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ کیا وہ مغرب کے اُنہیں نقوشِ قدم پر چلے گا جو انسان کو دولت مند تو بنا سکتے ہیں لیکن اُسی کے ساتھ انسانیت بھی چھین لیتے ہیں یا وہ اپنی اُنہیں دیرینہ خصوصیات کو قائم رکھے گا جو زمانہ نامعلوم سے لے کر اس وقت تک کو برابر انبیاء و رُسل، اولیاء و اکابر کے ذریعے سے ان کے دردمند دلوں میں ودیعت کی گئی ہے۔[19]"

۱۸؎: "ملاحظات" فروری ۱۹۲۹ء، ص ۷، جلد ۱۵، شمارہ ۲

۱۹؎: "ملاحظات" نگار جولائی ۱۹۳۱ء، ص ۹، جلد ۲۰، شمارہ ۱

نیاز نے دوسری جنگِ عظیم، جرمن اور اتحادی قوتیں، تنازع و تصادم اور نتائج کو بھی "ملاحظات" کا موضوع بنایا ہے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے سے برسرِپیکار قوتوں اور ممالک کے حالات کو جانچا اور پرکھا۔ جرمنی، انگلستان، فرانس و اطالیہ، روس، جاپان، منچوریا اور چین کے اقتصادی، معاشی، سماجی اور سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ اب جنگِ عظیم ناگزیر ہے۔ اور کسی وقت بھی چھڑ سکتی ہے۔ حالانکہ اُنہوں نے جنگ کو کبھی بھی پسند کی نظر سے نہیں دیکھا کیونکہ اُن کے مطابق مسائل کے حل کا یہ کوئی مہذب طریقہ نہیں ہے جیسا کہ لکھتے ہیں:

"فضا تاریک ہوتی جا رہی ہے۔ دُنیا کا امن و سکون سخت خطرے میں ہے۔ اور اگر یہ جنگ ہمارے آپ کے سامنے چھڑ گئی جس کا یقین ہے تو اس میں شک نہیں کہ دُنیا اس کے بعد بالکل نیا دور شروع کرے گی اور انسان کی زندگی اُس عہدِ وحشت تک لوٹ جائے گی جب آدمی جاہل تو تھا مگر علوم کی ترقی نے اُسے حیوان نہیں بنایا تھا۔[20]"

نیاز دُنیا کو امن و سکون کا گہوارہ دیکھنا چاہتے لیکن ان کا خیال ہے کہ جب تک دُنیا سے بلندی و پستی، نشیب و فراز کے دھبے نہ مٹیں گے۔ امن و سکون کا دور کبھی نہ آئے گا۔ نیاز نے ملاحظات کے ذریعہ جنگ کے پس منظر، محرکات و اسباب اور مدّوجزر سے پڑھنے والوں کو پوری طرح باخبر رکھا۔ پولینڈ، جرمنی، روس، اٹلی، رومانیہ، برطانیہ، بلجیم اور فرانس کی حالت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نازی اور اتحادی کشمکش کو پوری طرح پیش کیا۔ اور طویل اداریے لکھے یہاں تک کہ اُنہیں یہ صفحات مختصر معلوم ہونے لگے۔ اور جنگ کے مسائل سے متعلق ایک الگ اخبار نکالنے کا ارادہ کیا۔ "نگار" فروری ۱۹۴۰ء (ص ۸۰) میں اس کی اشاعت سے متعلق

[illegible]: "ملاحظات" اکتوبر ۱۹۴۲ء، ص ۲

اشتہار بھی چھپا۔ لیکن مصارف کو دیکھتے ہوئے ارادہ ترک کر دیا۔ چنانچہ اب اُنہوں نے جنگ کی رفتار اور نئے نئے نتائج "ملاحظات" ہی میں پیش کرنا شروع کر دیئے مختلف نقشہ جات کے ذریعے جنگ کی صورتِ حال کو واضح کیا۔ نیاز کا خیال تھا کہ یہ جنگ دو مخالف قوتوں کی جنگ نہیں بلکہ دو متضاد عناصر کی جنگ ہے۔ اِنسانوں کی لڑائی نہیں بلکہ خیال و اعتقاد کی لڑائی ہے اور اُس کا فیصلہ اُسی وقت ہو گا جب کرۂ ارض پر یزدان و اہرمن میں صرف ایک کسی کی حکومت آئندہ کے لیے متعیّن ہو جائے۔

جنگ کے جو سیاسی، سماجی، معاشی و اقتصادی اثرات متعیّن ہو رہے تھے۔ نیاز نے اِن کا تجزیہ بڑے سائنٹفک انداز میں شہادتوں کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن وہ اِس کی تباہ کاریوں کا تذکرہ بہت حسّاس اور جذباتی انداز میں پیش کرتے ہیں:۔

"ہم ہندوستان میں ہیں جہاں ہم کو دونوں وقت بُرے بھلے کسی نہ کسی طرح روٹی مل رہی ہے۔ جہاں ہم آزادی کے ساتھ چل پھر رہے ہیں۔ اور اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں لیکن جنگ کیا چیز ہے اور اِس ایک سال میں اُس نے کیا سے کیا کر دیا۔ اِس کا حال آپ یوروپ میں جا کر دیکھیے جو آگ کی بھٹی بنا ہُوا ہے اور جہاں اِس بھٹی میں اِس وقت تک ایک درجن سے زیادہ سلطنتوں کو جھونکا جا چکا ہے اور معلوم نہیں آئندہ کن مُلکوں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے۔ اسٹریا، حبشہ، البانیہ، زیکوسلوکیا، پولینڈ، اسٹونیا، لیتھونیا، فن لینڈ، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ، بلجیم، اور فرانس گویا چودہ حکومتیں اِس وقت تک تباہ ہو کر جرمنی، روس اور اٹلی کے زیر آ چکی ہیں یہ سب کچھ خلافِ حق و انصاف ہُوا ہے تو اِس میں شک نہیں کہ قُدرت نے شاید سب سے پہلی مرتبہ اِتنی بڑی ناانصافی و حق تلفی کو گوارا کیا ہو۔ تقریباً ۱۲ لاکھ مربع میل زمین اور اِس میں تیرہ کروڑ سے زیادہ بسنے والی آبادی کی

قسمتوں کا دفعتاً یُوں پلٹ جانا کوئی تماشا نہیں ہے لیکن ہم نے یہ سب کچھ دیکھا اور ابھی اور دیکھنے کی تمنا ہے۔ سچ ہے انسان سے زیادہ متحمل اور تماشا پسند مخلوق دُنیا میں اور کوئی نہیں [11]"

نیاز کو حالات کے تیزی سے بدل جانے کا خوب اندازہ تھا کیونکہ انقلابات کبھی بھی بغیر سبب کے نہیں ہوتے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اب زمانے کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اِنسان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ صدیاں، ہفتوں کی طرح گزر جاتی ہیں۔ نیاز کے مطابق یہ دَور انسان کی ذہنی بیداری کا دَور ہے۔ اور اَب ذہنی غلامی و استحصال کو کسی طور پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دُنیا میں ایسی تحریکیں بڑی سرگرمی سے اپنا کام کر رہی ہیں جو انسانی حقوق کی پاسدار ہیں قومیت کے اِحساس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت، اشتمالیت اور جمہوریت کے پنپنے کا یہ وقت ہے۔ اِس سلسلے میں چین کی مثال دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"۱۹۱۰ء میں چین کی حالت ایک ایسی لاش کی تھی جسے مختلف کتے نوچنے کے لیے گھیرے ہوئے تھے لیکن جب وہاں ملوکیت ختم ہو کر جمہوریت پیدا ہوئی اور مُلک میں بیداری کے آثار ظاہر ہوئے تو اُس کی تمام املاک جو ملک یوروپ کے اجارہ میں تھی واگزاشت ہوئیں۔ اور اِس کا حقِ استقلال تسلیم کر کے وہ امتیازات اُٹھانے پڑے جو اہلِ مغرب کو وہاں حاصل تھے[12]"

نیاز کی رائے میں دُنیا کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے انسان اور انسان کے درمیان فاصلوں کی خلیج بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ مختلف سیاسی و سماجی تحریکیں اور ادارے تو منظرِ عام پر آ رہے ہیں لیکن محض قرار دادیں منظور کر لینے میں مسائل کا حل

---

[11]۔ "ملاحظات"، ستمبر ۱۹۴۰ء، ص ۴، جلد ۳۸، شمارہ ۳

[12]۔ "ملاحظات" [illegible] ۱۹۳۳ء، ص ۶، جلد ۲۴، شمارہ ۱

نہیں ہے۔ ہمیں مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہوئے دُور اندیشی سے مثبت نتائج نکالنا چاہئیں، اور جب تک انسان، انسان کی حیثیت سے مسائل کو سمجھے اور محسوس نہیں کرے گا کوئی تحریک کوئی سیاسی نظریہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ مختلف سیاسی نظریات اور اُن کے نتائج کی طرف توجہ دلاتے ہوئے نیاز لکھتے ہیں :-

"ایک طرف شیخیت Suzerenity ہے جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ خیر خواہِ عالم قرار دیتی ہے۔ دوسری طرف آمریت Dictatorship ہے جو اپنے آپ کو قیامِ امن و سکون کا سب سے بڑا حامی کہتی ہے۔ تیسری طرف اشتراکیت ہے جو مساوات و آزادی کی سب سے بڑی نعمت دینے کے لئے آمادہ ہے۔ لیکن جس وقت ہم فلسطین کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو شیخیت کے پردہ میں سوائے تیغ و خنجر کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اور جب حبشہ کے انجام اور اسپین کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہیں تو آمریت جس کی سب سے بہتر نمائندگی اس وقت جرمنی اور اٹلی سے ہو رہی ہے۔ کے چنگل سے بھی ہم کو خون ٹپکتا نظر آتا ہے۔ اشتراکیت بے شک ہمارے درد کا علاج ہو سکتی ہے لیکن اس کو خود جینے کے لالے پڑے ہیں۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ نازیت اور شیخیت اسے زندہ بھی چھوڑے گی یا نہیں"۔[1]

کمیونزم، سوشلزم یا اشتراکیت سے متعلق بھی نیاز نے مفید اور نتیجہ خیز باتیں کہی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اشتراکی نظام نہایت خوشنما اور دلکش نظر آتا ہے کیونکہ اس میں تمام افراد میں ہر چیز مشترک ہے اور فطرت کے تمام انعامات سے یکساں طور پر فائدہ اُٹھاتی ہے۔ انسانیت، اخوتِ عامہ اور امنِ عام کے اُصول اشتراکیت میں موجود ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ سرمایہ داری اور جماعتِ عاملہ کے درمیان جو

[1] "ملاحظات" نگار دسمبر ۱۹۳۶ء، ص ۲، جلد ۳۲، شمارہ ۶

عدم توازن پایا جاتا ہے اُس کو مٹا دیا جائے۔ اور جمہور کی مدد سے ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس میں تمام افرادِ انسانی مساوی حیثیت رکھیں اور مزدوروں کے حقوق مساوات کسی طرح پامال نہ کیے جا سکیں لیکن نیاز کے بقول اسے نافذ کرنا اتنا آسان نہیں کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ :-

"میں اُصولِ اشتراکیت کا حامی نہیں ہوں اور نہ اُسے افلاس کا مداوا سمجھتا ہوں کیونکہ وہ میرے نزدیک اُصولِ فطرت کے منافی ہے لیکن میں یقیناً ہر اُس تحریک کا طرفدار ہوں جو مزدوروں اور کاشتکاروں کی اصلاح و ترقی سے متعلق ہے۔ کیونکہ ایک مُلک کی حقیقی ترقی اُس کے طبقۂ ادنیٰ کی ترقی ہے جس سے غالباً حکومت کو بھی انکار نہیں ہو سکتا"۔[1]

عصرِ حاضر اور موضوعاتِ علم و فن کے ساتھ ساتھ نیاز نے مذہبی اُمور و مسائل پر بھی اداریے لکھے۔ مذہبی مسائل کو انہوں نے جذباتیت سے ہٹ کر ہمیشہ عقل و منطق کی نظر سے دیکھا ہے۔ "ملاحظات" میں انہوں نے اسلام کی صحیح و سچی رُوح کو اُجاگر کیا ہے۔ انہوں نے مذہبِ اسلام کو انسانیت کا عظیم ترین مذہب قرار دیا ہے کیونکہ سب سے پہلے اسلام ہی نے بتایا کہ آزادی انسان کا فطری حق ہے۔ اور دُنیا میں وہی اوّلین مذہب تھا جس نے دین کو دُنیا سے ملا کر اُس حقیقت سے عالم کو روشناس کیا جس نے دُنیا میں اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالیں وہ قیامت میں بھی اندھا ہی اُٹھے گا۔ نیاز کا مؤقف ہے کہ خدا مندر، مسجد اور کلیسا میں نہیں بلکہ اس کا معبد انسان کا قلب و دماغ ہے۔ اور خدا کی طرف جس چیز نے انسان کو مائل کیا وہ صرف حوادثِ طبعی تھے۔ لیکن یہ امر حسرت ناک ہے کہ وہی حوادثِ طبعی جنہوں نے انسان سے خدا کے وجود کو تسلیم کرایا تھا اور آج اُسی کی بنیاد پر خدا سے انکار کیا جا رہا ہے۔

نیاز نے مذہبی مباحث میں تعقل و توازن کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ اور محض روایاتی نقطۂ نظر

[1] "ملاحظات" نگار اپریل ۱۹۲۹ء، ص ۵، جلد ۱۵، شمارہ ۴

باتوں کو بغیر سوچے سمجھے قبول نہیں کر لیا بلکہ تفکر و تامّل سے کام لیتے ہوئے نتیجہ خیز باتیں کہی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے عبادات، نماز، روزہ کو تو لے لیا لیکن اُس جوشِ عمل اور اُس ولولۂ ترقی کو نظر انداز کر دیا جس کے پیدا کرنے کے لئے طاعت و عبادت کی پابندیاں پیدا کی گئی تھیں۔ اُنہوں نے جنّت کی حوریں اور دوزخ کے اژدہے تو یاد رکھے لیکن اِس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ جہنم میں جو چیز اژدھا بن کر ڈسنے والی ہے وہ اِسی نکبت و ذلت کی دوسری صورت ہے جو اِس دُنیا میں کسی قوم پر مستولی ہو جاتی ہے اور جس لذت کو حور کہا جاتا ہے وہ اُسی استیلا و ترقی کا نام ہے جس کے بدولت ایک جماعت اِسی دنیا کو جنت بنا لیتی ہے۔ مذہبی مسائل سے متعلق اسی روشن خیالی، ترقی پسندی اور وسیع النظری کو نئی نسل نے بڑی خوش دلی سے قبول کیا۔ نیازؔ نے مذہب سے متعلق جتنے بھی مسائل درپیش رہے اُن کا بڑے منطقی و استدلالی انداز میں حل پیش کیا ہے مثلاً ایک اہم مسئلہ ”اُردو میں نماز پڑھنے“ سے متعلق تھا۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے کہا تھا کہ اُردو میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ اِس مسئلے سے متعلق سرسیّد احمد خاںؔ سے پوچھا گیا تو اُنہوں نے کہا کہ نماز نہ ہوگی۔ نیازؔ اِسی مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”اگر اِس امر کی اجازت دے دی جائے کہ ہر شخص کلام مجید کا ترجمہ نماز میں پڑھ سکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اُس مرکز کو جو اصل الفاظ قرآنی کے احترام سے متعلق ہے اور جو ذریعہ ہے تمام دُنیا کے مسلمانوں کو ایک رشتہ سے وابستہ کر دینے کا ضعیف و کمزور کر دیا — اِس وقت تو یہ حالت ہے کہ اگر میں دُنیا کے کسی گوشے میں پہنچ جاؤں اور وہاں کسی جگہ کھڑے ہو کر قرآن مجید کی کوئی آیت باآوازِ بلند پڑھنے لگوں تو وہاں کے تمام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے گا کہ میں اُنہی میں سے ایک ہوں اور وہ میری

۱۔ ”ملاحظات“۔ نگار مارچ ۱۹۳۵ء، ص ۷-۸، جلد ۲۷، شمارہ ۳

ہمدردی کو تیار ہو جائیں گے[1]“

اِس اجتماعیت کے تصوّر کے ساتھ ہی وہ اِس کی ایک اور وجہ بھی بیان کرتے ہیں جو جذباتی نہیں بلکہ عقل و منطق پر مشتمل ہے:-

”اِس میں کلام نہیں کہ نماز میں قرآن پاک کی اصل عبارت کے بجائے کسی اور زبان میں اِس کا ترجمہ پڑھنا سوائے اِس کے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ رفتہ رفتہ لوگوں میں یہ اعتقاد پیدا ہو جائے کہ کلام پاک ”بلفظ“ نہیں بلکہ صرف اِس کا مفہوم ”وحی“ ہوا تھا — اِسلام کا مفہوم بے کسی و بے چارگی کے سامنے گردن جھکانے کا نہیں بلکہ معقولیت و آزادیٔ رائے کے سامنے سرِ اعتراف خم کر دینے کا ہے[2]“

مذہب کے علاوہ حقوقِ نسواں، خواتین کی آزادی، کمسنی میں شادی جیسے اہم مسائل کو بھی نیازؔ نے ”ملاحظات“ کا موضوع بنایا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ عورت، معاشرہ کا ایک طاقتور اور فعال حصّہ ہے۔ لیکن اِس سے جانوروں سے بدتر سلوک رَوا رکھا گیا ہے۔ خاص طور پر ہندوستانی معاشرہ میں اِس کے حقوق کو بُری طرح سے پامال کیا گیا۔ دُنیا کا کوئی معاشرہ عورت کی ترقی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ اِس لئے اِس کی ذہنی تربیت اور حقوق کی پاسداری کا خاص خیال رکھنا گو اُس دور میں عورت کی تعلیم کی طرف توجہ دِلانا ایک اہم مسئلہ تھا۔ چنانچہ نیازؔ نے تعلیم کو ہر فرد کا بنیادی حق قرار دیتے ہوئے عورت کی تعلیم پر بہت زور دیا۔ تعلیم کا مقصد اُن کے خیال میں ڈگری کا حصول نہیں بلکہ تربیتِ اخلاق اور آزادیٔ فکر ہے۔ جیسا کہ لکھتے ہیں:-

”تعلیم کا تنہا مقصد خواہ وہ کسی زبان کے ذریعے دی جائے محض تربیتِ اخلاق

۱۔ ”باب المراسلہ“ نگار جون ۱۹۶۲ء، ص ۴۸

۲۔ ”ملاحظات“ نگار مارچ ۱۹۳۲ء، ص ۷، جلد ۲۲، شمارہ ۵

اور آزادئ فکر و ضمیر ہے یعنی ایک بچہ کو شروع سے صحیح معنی میں ایک انسان بننے کا درس دیا جائے۔ اور اس کے دماغ میں آزادی کے ساتھ سوچنے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ لیکن افسوس ہماری درسگاہوں میں اگر فقدان ہے تو انہیں دو چیزوں کا اور یہاں کا تعلیم یافتہ انسان اگر عاری ہوتا ہے تو انہیں دو خصوصیات سے۔[1]"

نیاز کا یہ موقف درست ہے ہمارا تعلیمی نظام واقعی اس لحاظ سے بہت کمزور ہے۔ نیاز کو ان کمزوریوں پر گہری تشویش ہے۔ اس کے بعد بیروزگاری جو اس سے بھی بڑا مسئلہ ہے اُس پر بھی نیاز نے سنجیدگی سے غور و فکر کیا۔ اس مسئلے اور اس کے ایک قابلِ عمل حل کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ہر سال لاکھوں نوجوان اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہیں اور سب کے سب یہی چاہتے ہیں کہ انہیں کوئی فوری نوکری مل جائے اور یہ چاہنا ان کا بالکل حق بجانب ہے۔ پھر اگر دنیا کی کوئی حکومت ملک کے تمام تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملازمت دینے کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی اور یقیناً نہیں ہو سکتی تو پھر اس کو سوچنا چاہیئے کہ ملازمت کے علاوہ حصولِ معاش کے اور کیا ذرائع ہو سکتے ہیں اور ان ذرائع کی فراہمی حکومت کا فرض ہے یا نہیں۔ آج ایک چپراسی کی جگہ خالی ہوتی ہے تو اس کے لیے سینکڑوں گریجویٹ درخواست لے کر پہنچ جاتے ہیں لیکن ان میں سے کسی میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ جوتا صاف کر کے یا صابون بیچ کر اپنی روزی کمائے۔ افسوس ہے کہ جو غلامانہ ذہنیت آزادی سے پہلے پائی جاتی تھی۔ آزادی کے بعد بھی بدستور باقی

[1]۔ ملاحظات جولائی ۱۹۳۶ء، ص ۳، جلد ۲۸، شمارہ ۱

ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے صرف غلط تعلیم کا۔[2]"

اس کے بعد بے روزگاری جو اس سے بھی بڑا مسئلہ ہے اس پر بھی نیاز نے سنجیدگی سے غور و فکر کیا۔

"ملاحظات" کا موضوع صرف سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی مسائل ہی نہیں رہے بلکہ نیاز نے مختلف مکتبۂ فکر کی عظیم شخصیات کے انتقال پر بھی اداریے لکھے ہیں۔ جن میں اُن کی خدمات کو سراہتے ہوئے اُنہیں خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے اور گہرے رنج و الم کا اظہار بھی کیا ہے۔ مصطفٰے کمال پاشا سے نیاز کو گہری عقیدت تھی چنانچہ اُن کے انتقال پر لکھتے ہیں:-

"وہ شخص جس کا نام ماں باپ نے مصطفٰے رکھا تھا۔ مدرسہ میں پہنچ کر اپنے ذہنی امتیاز کی وجہ سے مصطفٰے کمال ہو گیا۔ جو درۂ دانیال کے بعد مصطفٰے کمال پاشا کہلایا۔ جس نے ۱۹۲۱ء میں یونانیوں کو شکست دے کر قوم سے غازی مصطفٰے کمال پاشا کا لقب حاصل کیا۔ اور جو آخر میں ان تمام امتیازات سے بلند تر ہو کر صرف آتاترک کہلایا۔ وہ آج دنیا سے منہ موڑ کر عالمِ اسلامی کو حد درجہ سوگوار و ملول چھوڑ گیا ہے ــــ کمال آتاترک اب نہیں ہے لیکن اُس کے کارنامے ہمیشہ باقی رہیں گے اُس کا جسم فنا ہو گیا لیکن اُس کی پیدا کی ہوئی رُوح کبھی فنا نہ ہو گی۔ وہ اس زمانہ کا بطلِ اعظم تھا۔ اس دور کے ترکوں کا پیغمبر تھا۔ گمراہ قوموں کے لیے مشعلِ ہدایت تھا۔ اور وہ سب کچھ تھا جو انسان کو "نیم خدا" بنا دیتا ہے۔[3]"

قائدِ اعظم اور نوابزادہ لیاقت علی خاں کے انتقال پر بھی نیاز نے اداریے لکھے۔ جن میں حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے، اُن کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا اور آئندہ امکانات سے متعلق روشنی ڈالی ہے۔ لیاقت علی خاں کی شہادت کو قوم و ملک کی شہادت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

[2]۔ ملاحظات۔ نگار مئی ۱۹۶۱ء، ص ۴، شمارہ ۵

[illegible] شمارہ ۱

یوں تو ہر انسان کا قتل اپنی جگہ افسوسناک ہوا کرتا ہے۔ لیکن کسی ایسے فرد کی ہلاکت جس کی ذات کسی قوم یا جماعت کی ملکیت ہو، قوم و جماعت کی ہلاکت ہے ـــــ تقسیم ہند کے بعد پاکستان ایک جداگانہ سلطنت تو بن گئی تھی لیکن اس کی حیثیت ایک جامۂ تار تار سے زیادہ نہ تھی اور مشکل سے باور کیا جا سکتا تھا کہ وہ آسانی سے منزلِ استقامت تک پہنچ سکے گی زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ قائد اعظم اس جہان سے رخصت ہو گئے یہ پہلا زبردست صدمہ تھا جو پاکستان کی نوزائیدہ سلطنت کو پہنچا لیکن نواب زادہ مرحوم کے وجود نے یہ صدمہ بھی ملک کو زیادہ محسوس ہونے نہ دیا اور انہوں نے تمام تر ذمہ داریاں جو قائد اعظم نے سنبھال رکھی تھیں اپنے مضبوط شانوں پہ لے لیں اور حکومت کا وہ ڈھانچہ جو تیار ہو چکا تھا بگڑنے نہ دیا نواب زادہ مرحوم کی شہادت کے اسباب کیا تھے۔ ان کا نہ ہمیں صحیح علم ہے نہ ان کے معلوم کرنے کی ضرورت کیونکہ دنیا میں اکثر بڑے بڑے کام کرنے والوں کا یہی حشر ہوا ہے۔ اور اس انجام کے بعد جو ردِ عمل ملکوں میں ہوا کرتا ہے وہ ہمیشہ برا نہیں ہوا کرتا۔[1]"

سیاسی شخصیات کے علاوہ نیاز نے علمی و ادبی شخصیات سے بھی گہری عقیدت و محبت کا اظہار یا ہے۔ اور ان کے دنیا سے اٹھ جانے علم و ادب کی دنیا سے میں جو خلا پیدا ہوا ہے نیاز س پر افسردہ و ملول نظر آتے ہیں:۔

"یہ سال اربابِ ادب و انشاء کے لئے بہت خون آشام ثابت ہوا۔ مرزا رسوا کی موت، طباطبائی کا انتقال، ناصر نذیر فراق کی رحلت، اور پھر آخیر

۱؎۔ ملاحظات نومبر ۱۹۵۱ء، ص ۳، جلد ۶، شمارہ ۵

میں میر ناصر علی کا اٹھ جانا، ایسے معمولی واقعات نہیں جنہیں دنیائے علم و ادب فراموش کر سکے۔ یہ سب بزمِ اردو کے اس دور کی یادگار تھے جس کو دنیا بھلا چکی ہے۔ مرزا رسوا پر لکھنؤ کی زباندانی ختم ہو گئی و فراق پر دہلی کی۔ طباطبائی کے ساتھ لکھنؤ کے عہد آفریں کا نفس و کمال ختم ہو گیا اور ناصر علی ادب و انشاء کے اس رنگ کو اپنے ساتھ لے گئے جو ان کی زندگی میں بھی کسی دوسرے کا حصہ نہ ہو سکا۔[2]"

"ملاحظات" کے علاوہ نیاز کی صحافتی زندگی کا ایک اہم ترین باب "باب الاستفسار" بھی ہے۔ اس کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ اس میں نیاز نے سائنس، اسلامیات، مذہبیات ریخ اور اسلامی تاریخ، معاشرتی علوم خصوصاً معاشیات، جغرافیہ، نفسیات، سماجیات، فنونِ لطیفہ تلف شخصیات، ادبیات، لغت و قواعد، اصطلاحی الفاظ کے تراجم، ضرب الامثال اور محاورہ وغیرہ سے متعلق جتنے بھی سوالات ان سے پوچھے گئے ان کے جوابات دیئے ہیں۔ یہ کالم ت ۱۹۲۲ء میں "استفسارات" کے عنوان سے شروع ہوا۔ مئی ۱۹۲۶ء میں "باب الاستفسار" نوان ہو گیا۔ یہ کالم نیاز کا بہت پسندیدہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دو جواب ب الاستفسار" کے تحت ہی انہوں نے مئی ۱۹۶۶ء کے شمارے میں دیئے۔ ابتدا میں س کا دائرہ تاریخ اور مختلف علوم و فنون اور ادب تک محدود رہا مگر بعد میں دنیا بھر کے مختلف نوع موضوعات کی وجہ سے یہ معلومات کا ایک انسائیکلوپیڈیا بن گیا۔ نیاز نے ہر جگہ سائنٹفک قطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ ان کا جواب دینے کا انداز منطقی، استدلالی، مثبت اور تعمیری ہے نیاز نے سوالات کی اہمیت کے پیش نظر "استفسارات و جوابات" تین جلدوں میں کتابی شکل میں شائع کیے۔ پہلی جلد ۱۹۲۶ء تک کے سوالات و جوابات پر مشتمل ہے جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی جس میں تقریباً دو سو مسائل کے جوابات پیش

۲؎۔ ملاحظات نگار جولائی ۱۹۳۲ء، ص ۴، جلد ۲۴، شمارہ ۱

گئے ہیں یہ مسئلۂ جبر و اختیار، خواب کی حقیقت معاد و خلود، طبقۂ نسواں اور غزل گوئی، برج بابل، فاسسٹ جماعت سامری کون تھا؟ باغِ ارم کی حقیقت، فلسفۂ محبت، بھرت پریت اصحابِ کہف، معجزہ و کرامات فرقۂ معتزلہ، مذہب و عقل، طوفانِ نوح، یاجوج و ماجوج، برہمو سماج، مریخ کی حقیقت، منصور و حلاج، غالب و بیدل، غالب و مومن، چند الفاظ کی تحقیق اور اصطلاحاتِ تصوف کے ترجمے جیسے اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

استفسار و جواب کا دوسرا حصہ جو زیادہ تر مذہبی سوالات و جوابات پر مشتمل ہے اپریل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں جو اہم ترین مسائل پیش کئے گئے اُن میں عالم برزخ، علمِ غیب، ہاروت و ماروت حوض کوثر، امام مہدی۔ دعا و توبہ کی حقیقت، آدم اور شجرِ ممنوعہ، آتشِ نمرود، نفس و روح، حضرت لقمان، خضر کی حقیقت، اور وحی، شامل ہیں۔

استفسار و جواب کا تیسرا حصہ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں گوناگوں علمی و ادبی، تاریخی و تنقیدی، مذہبی و معاشرتی مباحث پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً ابوریحان بیرونی، نفسِ ذبح، نظامِ زین، مہاتما گاندھی کا فلسفہ، بچوں کی ابتدائی تعلیم، واقعہ شق القمر، ختمِ نبوت، وجود و روح، مذہب و مذہبیات، کوہِ نور ہیرا، رضا شاہ پہلوی کی داستان ترقی، حدیث پر تاریخی و فنی گفتگو، عہدِ اسلام اور علمِ نجوم وغیرہ۔ اس پورے سلسلے میں نیاز نے پوری چھان بین کی ہے۔ اور تحقیق و جستجو سے کام لیا ہے۔ لیکن وہ اپنے جواب کو آخری اور حتمی نہیں سمجھتے بلکہ اُن کا ایمان ہے کہ جب تک تحقیق و جستجو کی لگن قائم رہے گی علم کا میدان وسعت اختیار کرتا رہے گا کیونکہ تبدیلیوں کا امکان موجود ہے۔ خود لکھتے ہیں:۔

"ہر استفسار کا جواب میں نے اپنے خیال سے پوری تحقیق کے ساتھ دیا ہے لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ اس میں اب کسی اضافہ کی گنجائش نہیں یا یہ کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس میں غلطی کا امکان نہیں، کسی طور درست نہیں ہو سکتا۔ بالکل ممکن ہے کہ میری تحقیق میں کہیں کہیں غلطی رہ گئی ہو یا یہ کہ خود میں نے کسی بات کو صحیح نہ سمجھا ہو لیکن اس کا مجھے یقین ہے اور آپ بھی یقین کیجئے کہ دیدہ و دانستہ میں نے کسی مناظرانہ مکر و فریب سے کام نہیں لیا۔ اور اپنے خیال کے مطابق وہی بات لکھی جسے میں صحیح باور کرتا ہوں۔"

"استفسارات" سے نیاز کے مطالعے کی وسعت کا حقیقی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قدیم و جدید علوم، معلوماتِ عامہ اور عصرِ حاضر کی تبدیلیوں پر اُن کا مشاہدہ و مطالعہ کتنا گہرا تھا۔ بہت سی روایاتی باتیں جو توہم پرستی کا نتیجہ تھیں نیاز نے منطقی و سائنسی انداز سے انہیں باطل قرار دیا ہے اُن کی روشن خیالی اور عقلیت پسندی نے کہیں بھی ہتھیار نہیں ڈالے "حجرِ اسود" کے بارے میں بہت سی باتیں روایاتی طور پر موجود تھیں۔ کہ یہ پتھر جنت سے آیا اور انسان کے گناہوں نے اس کا رنگ سیاہ کر دیا لیکن نیاز جناب منظور الٰہی کلکتہ کے اس سوال کہ یہ پتھر کہاں سے آیا اور اُس کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"عبادت کی اولین صورت قربانی تھی جس کا ثبوت خود قرآن پاک سے ملتا ہے قربانی کے لئے کوئی خاص مقام مختص نہ تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی بنا کر بھیجے گئے تو انہوں نے حسبِ دستور قربان گاہ یا مذبح جسے مقدس ترین معبد کی حیثیت حاصل تھی، قائم کی۔ توریت مقدس سے ابراہیم اور آلِ ابراہیم کا اس طرح پتھر نصب کر کے مذبح بنانا پورے طور پر ثابت ہوتا ہے جب حضرت ابراہیم سرزمین مکہ میں تشریف لائے تو انہوں نے یہاں بھی دستور کے مطابق ایک پتھر قربانی کی جگہ متعین کرنے کے لئے نصب کیا جس کو حجرِ اسود کہتے ہیں۔ یہ پتھر جبل بوقبیس سے حاصل کیا گیا تھا۔ کعبہ میں آگ لگنے سے اس کا رنگ سیاہ ہو گیا ہے کلامِ مجید میں کسی جگہ اس پتھر کا ذکر نہیں آیا ہے

اور اسی سے اس کی عدمِ اہمیت ظاہر ہے۔"[1]

نیاز نے مذہبی مسائل پر اظہارِ خیال کرنے میں ہمیشہ کلام پاک ہی کو بنیادی سرچشمۂ ہدایت بنایا ہے اور اسی میں جملہ مسائل کا حل تلاش کیا ہے۔ کیونکہ اُن کے مطابق قرآن مکمل مذہب اسلام کا مظہر ہے اور اس کی تمام باتیں عقلی و منطقی ہیں۔ نیاز کا کہنا ہے کہ مذہب اسلام کو سمجھنا ہے تو قرآن مجید کو سمجھے اور اسے براہِ راست خود سمجھنے کی اہمیت پر اُنہوں نے زور دیا ہے لیکن اگر تفاسیر کا مطالعہ کیا بھی جائے تو عقل و درایت کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے کیونکہ یہ بھی بہرحال انسانی ذہن کی پیداوار ہیں اور اس میں غلطی و لغزش کا امکان ہے۔ قرآن مجید کو نیاز نے لفظاً ہی نہیں بلکہ معناً بھی سمجھا ہے اور اس کے معنوں میں گہرائی اور نزاکت کا خاص خیال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی باتیں معمولی اور سرسری نہیں اسی لئے دل پر اثر کرتی ہیں اور انسان سوچ بچار پہ مجبور ہو جاتا ہے۔

نیاز نے آدم و حوّا، رُوح کی بقا، حشر و نشر، عذاب و ثواب، جنت و دوزخ۔ ہر مسئلے کو خالص عقلی و سائنسی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ اور کسی بات کو بھی روایتاً قبول نہیں کیا۔ جدید ترین مسائل کا حل بھی اُنہوں نے قرآن مجید سے ڈھونڈھ نکالا ہے۔ برتھ کنٹرول جیسے نزاعی مسئلہ کو منطقی دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ محمد ایوب صاحب ــ بجوں کے سوال کہ کیا اولاد کی زیادتی اسلام نے جائز قرار دی ہے جبکہ پرورش کے سامان موجود نہ ہوں کیا یہ قوم کی تنزلی کی وجہ نہیں، کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آپ کا سوال غالباً برتھ کنٹرول سے متعلق ہے کلام مجید کی سورۂ انعام اور سورہ بنی اسرائیل کے الفاظ ہیں وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاهُمْ یعنی تم اپنی اولاد کو غربت و افلاس کے اندیشہ سے ہلاک نہ کرو تمہیں اور

[1]: نگار اگست ۱۹۲۶ء ص ۸۹

اُن کو رزق پہنچانے والے تو ہم ہیں ـــ اگر انصاف سے کام لیجئے تو اس آیت کی رُو سے برتھ کنٹرول ناجائز قرار پا سکتا ہے، لیکن اقتصادی و معاشی حالات میں اگر واقعی کوئی شخص مفلس و نادار ہے تو اُس کے لئے عقبیٰ سے زیادہ عذاب دُنیا میں ہی ہے کہ اولاد کی کثرت ہو۔ اس لئے اُس کا انفرادی و ذاتی فرض یہ ہے کہ وہ قطعاً اس سلسلے کو روک دے کیونکہ محض آزادی کی زیادتی کوئی چیز نہیں جب تک اس میں اہمیت و انسانیت نہ پائی جائے اور یہ بغیر تعلیم و تربیت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔"[1]

مذہب کے ساتھ ساتھ نیاز کی علوم جدیدہ اور سائنس سے متعلق بھی معلومات تازہ اور حالات کے عین مطابق تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جواب میں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ تفصیلی و تجزیاتی انداز میں ہر پہلو سے قارئین کو مطمئن کرتے ہیں۔ مراد آباد کے رُکن الدین صاحب کے سوال کہ مریخ کی حالت کیا ہے اور وہاں آبادی کا امکان ہے بھی یا نہیں، کا جواب کچھ یُوں دیتے ہیں:۔

"مریخ ایک چھوٹا سا کرّہ ہے اور ہمارا کرّہ ارض اس سے بڑا ہے۔ تاہم ہمارا چاند اس سے چھوٹا ہے۔ چونکہ چھوٹے کرّوں میں اس لحاظ سے کہ اُن کی حرارت جلد کم ہو جاتی ہے اور وہ جلد ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، جاندار چیزوں کو پیدا کرنے کی صلاحیت بہت جلد پیدا ہو جاتی ہے اس لئے مستبعد نہیں ہے کہ مریخ میں بھی آبادی ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ اگر وہاں کوئی آبادی ہے تو وہ کرۂ ارض کی آبادی سے ضرور مختلف ہو گی کیونکہ مریخ میں کشش ثقل بہ نسبت کرۂ ارض سے کم ہے۔"[2]

[1]: "باب الاستفسار" نگار جولائی ۱۹۲۳ء، ص ۵۵، جلد ۲۴، شمارہ ۱

[2]: "باب الاستفسار" جون ۱۹۲۴ء ص ۶۲، جلد ۵، شمارہ ۶

"باب الاستفسار" کا کینوس وسیع دائرہ معلومات عامہ کا ہے جس میں نیاز نے مختلف اسلامی، بین الاقوامی شخصیات، مختلف علوم، قدیم و جدید طریقہ ہائے رسل و رسائل، مختلف ایجادات سے متعلق قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔ اسی کے تحت روح، مابعد الطبیعیات، دُنیا اور عالم سے متعلق سوالات کے جوابات بھی دیتے ہیں۔ نیاز کو مختلف فنون کی ابتدا، تاریخ اور ارتقاء سے خاص دلچسپی تھی۔ اُن کا متجسس ذہن ہمیشہ اس بات کا متلاشی رہتا کہ مختلف علوم و فنون کی ابتدا کیسے اور کہاں اور کیونکر ہوئی۔ اس سلسلے میں اُن سے مختلف سوالات کیے جاتے اور اُن کے مطالعے کی وسعت ایسے جامع اور مکمل جواب فراہم کرتی کہ کسی تحقیق کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ مثلاً فن کاغذ کی ابتدا اور رواج سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"یہ اَمر تو بالکل یقینی ہے کہ کاغذ سازی مشرق کی اختراع ہے۔ اہل چین مدعی ہیں کہ اس کے مخترع وہ ہیں۔ اہل عرب کا دعویٰ ہے کہ یہ اُن کی ایجاد ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس باب میں چینیوں کو تفوق حاصل ہے چین میں نہایت قدیم زمانہ سے یہ صنعت رائج تھی اور وہاں سے منتقل ہو کر سمرقند گئی جب مسلمانوں نے سمرقند کو فتح کیا تو اسیرانِ جنگ میں سے بعض چینی لوگ بھی تھے جو فن کاغذ سے واقف تھے اور اِس طرح اوّل اوّل مسلمانوں نے کاغذ بنانا سیکھا[1]۔"

فن کاغذ کے ساتھ ساتھ "باب الاستفسار" میں گھڑی سازی کی تاریخ "خورد بینی"، "فن کتابت"، اخبار نویسی، فن جراحی، "نامہ بر کبوتر" پر بھی تحقیقی جوابات ملتے ہیں۔ حامد نعمانی کلکتہ کے سوال کہ ہندوستان میں سب سے پہلے کس نے کس مقام پر بندوق کا اِستعمال کیا، کا جواب تحقیق سے بالکل دُرست ثابت ہُوا ہے۔

[1]۔ "استفسارات و جوابات" جلد اوّل ص ۳۸،

"اس میں شک نہیں کہ بندوق کا اِستعمال سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے کیا کیونکہ بارود مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ اور اس کا اعتراف ڈریپر نے بھی کیا ہے۔ واقعی سب سے پہلے اسے بابر ہی نے رواج دیا۔ اس سے قبل کسی مسلمان بادشاہ کا ہندوستان میں بندوق اِستعمال کرنا تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا[1]۔"

مختلف علوم اور فنی ایجادات کے علاوہ نیاز نے "باب الاستفسار" میں مختلف شخصیات اور اُن کے کارناموں سے متعلق جامع معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ جن میں ابوریحان البیرونی، نیرو، لقمان، تیمور، فرعون، منصور حلاج، ابن رُشد، سیّد جلال، سامری، مُلّا دو پیازہ وغیرہ شامل ہیں۔ بہت سی ایسی شخصیات جن کے حالات تاریخ کے اوراق میں دفن تھے یا اُن کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں۔ نیاز نے نہایت تحقیق اور چھان بین کے بعد اصل واقعات کو پیش کیا ہے مثلاً مرزا محمد علی بیگ۔ پالن پور کے سوال کہ مُلّا دو پیازہ اصل میں کہاں کا رہنے والا تھا۔ اس کا اصل نام اور قبر کہاں ہے کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"مُلّا کا اصل نام عبدالمومن تھا اور وطن دہلی، مُلّا کا انتقال ہنڈیہ میں ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔ یہ گاؤں دریائے نربدا کے کنارے بھوپال سے چالیس کوس کے فاصلے پر ضلع ہوشنگ آباد میں واقع ہے جس حجرہ میں مُلّا محوِ خواب ہیں وہیں اُن کی بیوی کی قبر ہے[2]۔"

"باب الاستفسار" میں نیاز نے اُردو، ہندی، عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی ادبیات سے متعلق مختلف مگر اہم سوالات کے جواب بھی دیے ہیں۔ اس ضمن میں تحقیقی سوالات کے جوابات

[1]۔ "باب الاستفسار" نگار جولائی ۱۹۲۳ء ص ۴۷،

[2]۔ نگار اگست ۱۹۲۵ء، ص ۸۳

خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ مثلاً کسی کتاب، اُس کے مصنّف، سنِ تصنیف، لُغت و قواعد
علمِ بیان، عروض و قوافی، شعر کا مفہوم، عربی، فارسی، اُردو انگریزی کے مترادفات، اِصطلاحی
تراجم، ضرب الامثال، محاورہ اور روزمرّہ پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف
شعراء مثلاً غالبؔ و بیدلؔ، غالبؔ و مومنؔ، داغؔ و امیرؔ کا موازنہ بھی کیا ہے۔ تبصرہ و رائے
بہت حقیقت پسندانہ اور بے لاگ ہے۔ مثلاً محمد یٰسین۔ حاجی پور، کے سوال کہ داغؔ اور امیرؔ میں
کس کو فضیلت ہے، کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی کی یہ غلطی دُنیائے حقیقت میں کبھی فراموش
نہیں کی جا سکتی کہ اُنہوں نے اپنے آپ کو ایک شاعر کی حیثیت سے رُونما
کیا کیونکہ اُن کے فضل و کمال کے لحاظ سے شاعری اُن کے لئے ننگ تھی اور
اسی کے مقابلہ میں داغؔ کی دانشمندی اس سے زیادہ اور کوئی نہیں ہو سکتی
تھی کہ اُنہوں نے فنِ شعر کو اختیار کیا کیونکہ وہ دُنیا میں اس سے زیادہ اور کچھ
نہ بن سکتے تھے[16]"

مومنؔ و غالبؔ کی شاعری اور اُن کی فارسی تراکیب کے اِستعمال کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے،
باوجود مومنؔ سے بے پناہ عقیدت و محبت رکھتے تھے، انتہائی حقیقت پسندی سے کام
لیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"فارسی شاعری کے لحاظ سے غالبؔ نے مومنؔ سے زیادہ شہرت حاصل
کی۔ کیونکہ غالبؔ نے اپنے وقت کا کافی حصّہ اس میں صرف کیا، اور
مومنؔ نے کم۔ مومنؔ نے جو کچھ فارسی میں کہا وہ بھی باقی نہ رہا۔ اور اِس
لئے لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع ہی نہ مِلا کہ مومنؔ اِس خصوص میں بھی کس مرتبہ

[16]: باب الاستفسار، نگار مئی ۱۹۲۴ء، ص ۲۱، جلد ۵، شمارہ ۵

کا شخص تھا[17]"

مختلف اصنافِ ادب و شعر سے متعلق بھی نیازؔ نے بہت چھان بین کی تھی۔ اُن کے متجسّس
ذہن نے اس بات کا پتا چلایا کہ مختلف اصناف سب سے پہلے کب، کہاں اور کس نے متعارف
کرائیں چنانچہ بڑے وثوق اور اعتماد سے سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ نفسِ امین مراد آباد کے
سوال کے بہترین ترانہ کس زبان میں لکھا گیا، لکھتے ہیں:-

"ترانہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے لیکن یہ فیصلہ بہت مشکل ہے کہ ان میں بہترین
کون ہے۔ کیونکہ ہر ترانہ داعیاتِ وطن کے لحاظ سے جداگانہ جذبات رکھتا ہے
تاہم جس قدر شہرت فرانسیسی زبان کے ترانہ لامارسیلیاز
کو ہوئی ہے۔ اتنی شہرت کسی اور ترانے کو نصیب نہیں ہو سکی۔ اس کا
مصنف روجہ دی لائل ہے اس ترانہ کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا
ہے۔ عربی میں "الہلال" میں شائع ہوا تھا[18]"

زبان و لسانیات، نیازؔ کا پسندیدہ موضوع تھا۔ لہٰذا اکثر اُن سے مختلف زبانوں کے الفاظ
کے مفاہیم بھی دریافت کئے جاتے۔ جس سے اُن کی تحقیقی صلاحیتوں اور وسعتِ مطالعہ کا پتا
چلتا ہے۔ عربی، فارسی، ہندی، اُردو، ترکی اور انگریزی پہ بیک وقت مہارت رکھتے تھے
اصغر خاں نظیر لدھیانہ کے اسی نوعیت کے سوال کا جواب ملاحظہ ہو:-

"موافی۔ میفار کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایک شخص جو اپنے مطالبات ادا
کر سکتا ہے اور جسے انگریزی میں Solvent کہتے ہیں۔
"چقمق" ترکی زبان کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں۔ نکلنا، طلوع ہونا، برآمد ہونا
چقماق کو چقماق اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی ضرب سے چنگاریاں

[17]: استفسارات۔ جلد اوّل ص ۳۰
[18]: استفسارات، نگار ۱۰ مارچ ۱۹۲۴ء، ص ۲۱، جلد ۵، شمارہ ۳

نکلتی ہیں [1]"۔

نیازؔ نے مختلف سماجی و معاشرتی مسائل کے بھی مدلّل جواب دیتے ہیں۔ ان میں جادو منتر تعویز، حمائل، پردہ، تعلیم، آزادیٔ نسواں، شادی بیاہ کے رسم و رواج شامل ہیں۔ سوال کی نوعیت کے اعتبار سے سنجیدہ و متین لہجہ اختیار کیا ہے، اور جہاں شوخی کا موقع ہو وہاں اپنی اس فطری ظرافت سے خوب کام لیا ہے مثلاً "آگرہ سے ایک خراب محبت" کے سوال کہ مذہب عشق سب سے پہلے کس کافر نے اختیار کیا؟ کا یوں جواب دیتے ہیں:۔

"اگر آپنے کافری شرط نہ لگائی ہوتی تو انجیل کی عام روایت کے مطابق آدم ہی
اس کا موسّس اوّلین قرار دیتا ہے۔ جس نے جذبۂ اُلفت سے مجبور ہوکر
جنت ایسی پیاری چیز کی پرواہ نہ کی۔ اور اگر کافر کہنا آپ کا صرف پیار ہے
تو میرا جی چاہتا ہے کہ مذہب عشق کی ابتدا بجائے آدم کے جنسِ لطیف کی
اُس اوّلین فرد سے متعلق سمجھوں جس نے سب سے پہلے اپنی ضد سے محبت
کرنا سیکھا۔ "اِک خراب محبت" اور وہ بھی "از آگرہ" کے سامنے جس نے نہ کبھی
محبت کی اور نہ کوئی خرابی اپنے لئے پیدا کی، اِن سوالوں کا جواب کیا دے
سکتا ہوں [2]"۔

"باب الاستفسار" ہمیشہ "نگار" کا ایک اہم اور مقبول کالم رہا۔ جو قارئین کے لیے انسائیکلوپیڈیا کا کام دیتا رہا۔ گرچہ نیازؔ خود بھی حوالہ جاتی کتب سے مدد لیتے تھے لیکن اس کے باوجود نیازؔ کا مختلف علوم و فنون پر کامل دسترس رکھنا، پیرایۂ اظہار پر قدرت، اندازِ نگارش کا منفرد اسلوب ان سب نے مل کر "باب الاستفسار" کو معلومات کا ایک ایسا نادر ذخیرہ بنا دیا جو اُس دور بلکہ آج تک

---

[1] :۔ استفسارات، نگار اپریل ۱۹۲۶ء ص ۶۱، جلد ۵، شمارہ ۴

[2] :۔ استفسارات، نگار مئی ۱۹۲۳ء ص ۸۹

کسی ادبی رسالے میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ "استفسارات" چاہے مذہبی ہوں یا سائنسی، تاریخی ہوں یا سیاسی، ادبی ہوں یا سماجی و معاشرتی، نیازؔ نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت آزادی اور بے باکی سے کیا ہے۔ اور کہیں بھی حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔

"باب الاستفسار" کے علاوہ "نگار" کے مقبول ترین کالم "باب الانتقاد"، "مالہٗ و ما علیہ" اور "برّتِ موصولہ" بھی تھے۔ اِن کا تفصیلی ذکر تنقید کے ضمن میں آچکا ہے۔ پھر بھی یہاں صرف نیازؔ کا ایک صحافی ہونے کی حیثیت سے ان کالموں کی قدر و قیمت کو سامنے لانا ہے۔ "باب الانتقاد" جو آگے چل کر "مالہٗ و ما علیہ" کا عنوان اختیار کر گیا، یہ نیازؔ کی عملی تنقید کا ایک ایسا سلسلہ تھا جو اپریل ۱۹۲۴ء سے "نگار" میں شروع ہوا۔ یہ باب شعری معائب و محاسن سے متعلق تھا اور اس عملی تنقید کے کامیاب نمونے ملتے ہیں جو گرچہ زیادہ تر علم بیان و بدیع، اور عروض و قوافی سے تعلق رکھتا تھا لیکن ہم عصر شعراء کے کلام میں جو خامیاں تھیں نیازؔ انہیں بڑی بے باکی سے منظرِ عام پر لائے تھے اس سلسلے میں اُنہوں نے عموماً جوشؔ، جگرؔ، فراقؔ، وحشتؔ، سیمابؔ اکبر آبادی، اور یاسؔ عظیم آبادی جیسے مشہور شعراء کے کلام پر تنقید کی ہے۔ اس کے علاوہ اشعار کا تنقیدی مفہوم بھی بیان کیا ہے اس کام کا مقصد بقول نیازؔ یہ تھا کہ:۔

"وہ شعراء جو نثر و شعر میں کوئی فرق نہیں کرتے جن کے نزدیک شعر نام ہے
بگڑی نثر کا وہ میرا مخاطب نہیں لیکن وہ حضرات جو واقعی فنی حیثیت سے
شاعری کرنا چاہتے ہیں اُنہیں چاہیئے کہ اپنے کلام کو اس نوع کے اسقام سے
پاک رکھنے کی کوشش کریں [1]"۔

یہ کالم ثابت کرتا ہے کہ نیازؔ کے ہاں وہ تمام تنقیدی صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک کامیاب صحافی میں ہونا ضروری ہیں۔ جن کے تحت اُس کی باریک بیں نظریں مختلف شعبہ ہائے زندگی کا تجزیہ

---

[1] :۔ "مالہٗ و ما علیہ" ص ۴، بار اوّل مئی ۱۹۴۰ء، نگار بک ایجنسی لکھنؤ

۳۔	بہادر شاہ ظفر نمبر	سنہ ۱۹۳۰ء
۴۔	فراست الید نمبر	سنہ ۱۹۳۱ء
۵۔	غالب کی شوخیاں نمبر	سنہ ۱۹۳۲ء
۶۔	ملاحظات نمبر	سنہ ۱۹۳۳ء
۷۔	تأثرات نمبر	سنہ ۱۹۳۴ء
۸۔	اُردو شاعری نمبر	سنہ ۱۹۳۵ء
۹۔	ہندی شاعری نمبر	سنہ ۱۹۳۶ء
۱۰۔	اصحاب کہف نمبر	سنہ ۱۹۳۷ء
۱۱۔	اسلامی ہند نمبر	سنہ ۱۹۳۸ء
۱۲۔	مصحفی نمبر	سنہ ۱۹۳۹ء
۱۳۔	نظیر نمبر	سنہ ۱۹۴۰ء
۱۴۔	خود نوشت شعرا نمبر	سنہ ۱۹۴۱ء
۱۵۔	تبصرہ	سنہ ۱۹۴۲ء
۱۶۔	ریاض خیر آبادی نمبر	سنہ ۱۹۴۳ء
۱۷۔	جدید شاعری نمبر	سنہ ۱۹۴۴ء
۱۸۔	قرآن نمبر	سنہ ۱۹۴۵ء
۱۹۔	انتقاد نمبر	سنہ ۱۹۴۶ء
۲۰۔	ماجدولین نمبر	سنہ ۱۹۴۷ء
۲۱۔	پاکستان نمبر	سنہ ۱۹۴۸ء
۲۲۔	افسانہ نمبر	سنہ ۱۹۴۹ء
۲۳۔	تنقید نمبر	سنہ ۱۹۵۰ء

۲۴۔	مستقبل کی تلاش نمبر	سنہ ۱۹۵۱ء
۲۵۔	حسرت موہانی نمبر	سنہ ۱۹۵۲ء
۲۶۔	داغ نمبر	سنہ ۱۹۵۳ء
۲۷۔	فرمانروایانِ اسلام نمبر	سنہ ۱۹۵۴ء
۲۸۔	علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر	سنہ ۱۹۵۵ء
۲۹۔	خدا نمبر	سنہ ۱۹۵۶ء
۳۰۔	اصنافِ سخن نمبر	سنہ ۱۹۵۷ء
۳۱۔	معلومات نمبر	سنہ ۱۹۵۸ء
۳۲۔	تنقیح اسلام نمبر	سنہ ۱۹۵۹ء
۳۳۔	انشائے لطیف نمبر	سنہ ۱۹۶۰ء
۳۴۔	غالب نمبر	سنہ ۱۹۶۱ء
۳۵۔	اقبال نمبر	سنہ ۱۹۶۲ء
۳۶۔	نیاز نمبر دو جلد	سنہ ۱۹۶۳ء
۳۷۔	تذکروں کا تذکرہ نمبر	سنہ ۱۹۶۴ء
۳۸۔	جدید شاعری نمبر	سنہ ۱۹۶۵ء
۳۹۔	اصنافِ ادب نمبر	سنہ ۱۹۶۶ء

ہر چند کہ "نگار" کے سالناموں کا یہ عظیم سلسلہ ہنوز جاری ہے لیکن اس جگہ صرف اُن خاص نمبروں کی فہرست دی گئی ہے جو نیاز فتح پوری کی زندگی اور اُن کے زمانۂ ادارت میں شائع ہوئے۔ یہ ضرور ہے کہ ان خاص نمبروں میں آخری چار نمبر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مرتب کیے ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۴ء کا سالنامہ "تذکروں کا تذکرہ نمبر" پورے کا پورا ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا لکھا ہوا ہے پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان نمبروں کے محرک بھی نیاز فتح پوری ہی ہیں۔ ان خاص نمبروں کے

اجرا سے پہلے سالناموں کی روایت کا آغاز "نیرنگِ خیال" "مخزن" اور "ہمایوں" سے ہو چکا تھا۔ نیاز کے ذہن میں ان خاص نمبروں کو شائع کرنے کا کوئی خاص منصوبہ نہ تھا چنانچہ ان خاص نمبروں کی نوعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نگار کا نہ کوئی خاص نمبر نکلتا ہے اور نہ اس کا کوئی سالنامہ۔ البتہ کبھی کبھی بغیر کسی التزام و تعین کے ضخامت زیادہ کر دی جاتی ہے۔ اگر کوئی صاحب کسی ایسی مخصوص اشاعت کو سالنامہ وغیرہ کے لفظ سے یاد کرتے تو اس کی ذمہ داری انہیں پر ہے"۔[1]

نیاز کا جدت پسند اور اپنی راہیں خود تلاش کرنے والا ذہن خاص نمبر اور سالنامہ کی اصطلاح کو شاید پسند نہ کرتا تھا۔ حالانکہ ایک ہی شخصیت یا موضوع کے حوالے سے مواد کو یکجا کر دینے کے لیے خاص نمبر کی اصطلاح خاصی موزوں و مناسب ہے۔ چنانچہ "نگار" کا پہلا خاص شمارہ "مومن نمبر" تھا۔

مومن کے کلام کی رومانیت، سادگی اور موسیقیت سے نیاز بے حد متاثر تھے۔ "کلیاتِ مومن" اُن کی گراں قدر اور قیمتی متاع تھی۔ غالب اور اقبال جیسے بڑے شعراء کی مقبولیت کی وجہ سے مومن کا صحیح مقام متعین نہ ہو سکا تھا۔ چنانچہ نیاز نے "مومن نمبر" نکالا یہ مومن پر پہلا کام تھا اور آج بھی مومن پر کام کرنے والے نگار کے اس نمبر کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

"منتخبات نمبر" میں اُن مضامین اور منظومات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جو نگار کی جلد اول ۱۹۲۲ء کے مختلف شماروں میں چھپ چکے تھے۔

۱۹۳۰ء میں "بہادر شاہ ظفر نمبر" میں ظفر کی زندگی و شخصیت کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے شاعرانہ مرتبے کو متعین کیا گیا ہے۔ اس نمبر میں مختلف مقالہ نگاروں کے تحقیقی و تنقیدی

[1] "ملاحظات" "نگار" فروری ۱۹۲۹ء، ص ۳

مضامین شامل ہیں۔

۱۹۳۱ء کے خاص نمبر میں تھیوفائل گاٹئے کے فسانہ کا اردو ترجمہ جو خود نیاز نے "داستانِ حسن و عشق کا زریں ورق" کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے علمائے کرام کا عجیب و غریب نظریہ دینی "انجام و آغاز" اور سید یامین ہاشمی کا دلچسپ معلوماتی مضمون "علم فراست التحریر" شامل ہے۔

۱۹۳۲ء میں مرزا غالب کی شوخیاں اور شوخ نگاریوں پہ "غالب نمبر" شائع ہوا۔ غالب نے "دیوانِ ظرافت" کے مزاج میں جو فطری شوخی و شرارت تھی اس کا تفصیلی جائزہ، غالب کی رنگین تصویر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

۱۹۳۳ء میں ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک نیاز نے نگار کے جو سیاسی، مذہبی، علمی و تاریخی اداریے لکھے وہ "ملاحظات نمبر" کے تحت پیش کیے۔ اس نمبر کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں برصغیر میں جو قومی، ملی اور ادبی تحریکات اور رجحانات تھے اُن کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۹۳۴ء کا خاص نمبر سید یامین ہاشمی کے طویل مضمون "لبوں کی داستان" پر مشتمل ہے۔

۱۹۳۵ء کا "اردو شاعری نمبر" اردو زبان و شاعری پر ایک تاریخی تبصرہ ہے، دہلی، آگرہ، دکن اور لکھنؤ کے مختلف مکاتبِ فکر اور شعراء کے کلام کا تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ممتاز شعراء سے متعلق سوانحی مواد اور کلام کا انتخاب بھی ملتا ہے۔

۱۹۳۶ء کا "ہندی شاعری نمبر" بے حد اہم تحقیقی و تنقیدی مواد پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے ہندی شاعری سے متعلق ہمیں کہیں کوئی مستند تصنیف نہیں ملتی جو اردو داں طبقے کو ہندی شاعری کی نزاکت و لطافت سے روشناس کراتی۔ اس میں ہندی شاعری کے ارتقاء، مختلف اصناف کی خصوصیات، مشہور شعراء کی سوانح اور کلام کا انتخاب، ہندی شاعری میں تشبیہات و استعارات کا فنی و تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جو ہر لحاظ سے بہت افادیت و اہمیت

کا حامل ہے۔ اس کی افادیت و اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۶۲ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن اور اب ۱۹۸۴ء میں تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس میں وہ تمام مواد شامل ہے جو ۱۹۲۲ء سے لے کر اب ہندی شاعری سے متعلق ”نگار“ میں شائع ہوا ہے۔

۱۹۳۰ء کا ”اصحاب کہف نمبر“ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل پورے کا پورا نیاز کا اپنا تحریر کردہ ہے۔ اس میں ڈراما ”اصحاب کہف“ کے ساتھ ساتھ خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ، مسئلہ خلافت و امامت“ اور سائنس کی کچھ دلچسپ معلومات پیش کی گئی ہیں۔

”تاریخ اسلامی ہند نمبر“ جو ۱۹۳۸ء کا خاص شمارہ ہے، ۱۵۲ صفحات پر مشتمل پورے کا پورا نیاز ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ، مسلمان حکمرانوں کی سیرت اور اُن کے طرزِ حکومت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۹۳۹ء کا مصحفی نمبر، حیاتِ مصحفی، اردو غزل گوئی میں مصحفی کا مقام و مرتبہ — مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے اس کی اہمیت اس اعتبار سے بہت زیادہ ہے کہ اُس وقت تک مصحفی پر کوئی کام نہیں ہوا تھا اور اہل علم و ادب اُردو غزل گوئی میں مصحفی کے صحیح مقام و مرتبہ سے آشنا نہ تھے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ مصحفی کے مطالعے کے سلسلے میں اس نمبر کو کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

نظیر اکبر آبادی، اُردو کا عوامی شاعر جس کی شاعری کو عامیانہ اور بازاری کہہ کے ٹھکرا دیا گیا نیاز نے ۱۹۴۰ء میں نظیر نمبر پیش کر کے اُن کے شاعرانہ مرتبے کا تعین اور اُن کی شاعری کی قدر و قیمت کی طرف متوجہ کرایا ہے۔ اس نمبر میں نظیر کا مسلک، شاعری پر تبصرہ، نظیر اور عوام اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔

اُردو شعراء کا خود نوشت ”تذکرہ نمبر“ ۱۹۴۱ء میں پیش کیا گیا۔ اس میں ہم عصر بڑے شعراء نے اپنے حالات لکھے۔ اور اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ نیاز نے ان حالات اور منتخبات کو بڑے قرینے سے مرتب کر دیا ہے۔ اس نمبر میں آرزو لکھنوی، آسی الدنی، اثر لکھنوی،

احسان دانش، علی اختر اختر، اختر شیرانی، امید امیٹھوی، بیخود دہلوی، تاجور نجیب آبادی، مرزا ثاقب لکھنوی، جلیل مانک پوری، دل شاہجہاں پوری، جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، فراق گورکھ پوری، حسرت موہانی، حفیظ جالندھری، امرناتھ ساحر، سیماب اکبر آبادی، تلوک چند محروم، آنند نرائن ملا، [illegible] لکھنوی، وحشت کلکتوی، یگانہ چنگیزی، اور افسر میرٹھی شامل ہیں۔

۱۹۴۲ء کے ”انتقاد نمبر“ ”تذکرہ نمبر“ کے شعراء کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر تاثیر جیسے اہم ناقدین نے اس کی تنقید و تبصرہ میں حصہ لیا ہے۔

۱۹۴۳ء میں ”ریاض خیر آبادی نمبر“ پیش کیا گیا۔ ریاض خیر آبادی پر اس سے پہلے اور شاید بعد میں بھی کوئی کام نہیں ہو سکا۔ اس اعتبار سے یہ نمبر بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں ریاض کی شخصیت و فن پر خود نیاز، خواجہ احمد فاروقی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، سید عقیل احمد جیسے اہم مصنفین کے مقالات شامل ہیں۔

۱۹۴۴ء کے ”جدید شاعری نمبر“ میں شاعری کے بدلتے ہوئے نئے رجحانات جو مغرب سے اخذ کیے گئے، اُن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ وزن و قافیہ کی اہمیت، آزاد نظم اور نظم معریٰ کا تجزیہ کرتے ہوئے مستقبل میں اُن کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

”قرآن نمبر“ جو ۱۹۴۵ء میں پیش کیا گیا خود نیاز کا تحریر کردہ ہے۔ بعض مغربی مصنفین و مفکرین نے اسلام اور اُس کے ماخذات کو اکثر تنقید کا نشانہ بنایا ہے چنانچہ ڈاکٹر ٹسڈل نے ”ماخذ القرآن“ کے عنوان سے کلام مجید پر اعتراضات کیے تھے۔ نیاز نے ان تمام اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے۔

۱۹۴۶ء کے ”انتقاد نمبر“ میں تنقید کی اہمیت و ماہیت، اُصولِ تنقید، تنقیدی نظریات پر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، خواجہ احمد فاروقی، فراق گورکھپوری اور نیاز نے اہم ترین مقالے پیش کیے ہیں جو تنقید کی دُنیا میں بہت افادیت کے حامل ہیں۔

۱۹۴۷ء کا ”ماجدولین نمبر“ فرانس کے مشہور ادیب کی تصنیف کا اُردو ترجمہ ”زیرِ سایۂ زیزفون“

کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ جسے مصر کے ادیب مصطفیٰ لطفی المنفلوطی نے پہلے عربی میں منتقل کیا
اس عربی ترجمے کو نیاز نے سامنے رکھا ہے۔

جنوری ۱۹۴۸ء میں نیاز نے پاکستان نمبر پیش کیا۔ یہ پورا نمبر نیاز کا تحریر کردہ ہے۔ مسلمان حکمرانوں کی سیرت، طرزِ حکومت، اور علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں ہمیشہ تعصب سے کام لیا گیا ہے۔ نیاز نے ان کا حقیقی جائزہ لیتے ہوئے یہ بات دلائل سے ثابت کی ہے کہ مسلمان فرمانروا بہت وسیع النظر، اخوت و محبت کے علمبردار تھے اور برصغیر میں اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ محبت اور رواداری سے پھیلا ہے۔ ایسے پُرآشوب دور میں جب کہ ہندوستان میں پاکستان کا نام لینا بھی بڑے حوصلے اور جرأت کی بات تھی، نیاز کا ہندوستان میں رہ کر پاکستان نمبر نکالنا قابلِ تحسین ہے۔ جو برصغیر اور خاص طور پر مسلمانوں کی ایک اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا انتساب بھی انہوں نے پاکستان کے مسلمانوں ہی کے نام کیا ہے۔

۱۹۴۹ء میں منتخب پچیس افسانوں پر مشتمل افسانہ نمبر پیش کیا گیا جو اس سے قبل نگار میں شائع ہو چکے تھے۔

۱۹۵۰ء کا تنقید نمبر عملی تنقید پر مشتمل ہے۔ اس میں نیاز نے فنِ تنقید پر ایک جامع مقالہ تحریر کیا ہے۔ اور ایسے شعرا پر بھی تحقیقی و تنقیدی مقالے موجود ہیں جن پر اس سے پہلے کوئی قابلِ ذکر کام نظر نہیں آتا مثلاً اثر دہلوی، آسی غازی پوری، آزاد انصاری، یقین دہلوی، فانی بدایونی، شیر علی افسوس، ان کا شاعرانہ مرتبہ کا تعین یقیناً ایک قابلِ ذکر کارنامہ ہے۔

۱۹۵۱ء کا خاص نمبر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ایک یورپین سیاح مارس ہنڈلس کی تصنیف In Search of future. کا اُردو ترجمہ "ایک مستقبل کی تلاش" کے عنوان سے لطیف الدین احمد اکبرآبادی نے کیا ہے۔ ایران، عراق، مصر اور فلسطین کی سیاحت کے بعد ہنڈلس نے جو رائے قائم کی تھی وہ پیش کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ نیاز نے تحریر کیا ہے۔ جس میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد مسلمان حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور ان کے زوال کے اسباب کو

نظرِ عام پر لایا گیا ہے۔

۱۹۵۰ء میں حسرت موہانی نمبر "نگار" کا خاص نمبر ہے۔ یہ حسرت کی شخصیت اور اُن کی شاعری کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ رشید احمد صدیقی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، پروفیسر احتشام حسین، آل احمد سرور، پنڈت کشن پرشاد کول، خواجہ احمد فاروقی، سید سلیمان ندوی، جیسے عظیم اہلِ قلم نے اس میں جامع و پُرمغز مقالے لکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت کے مطالعے اور اُن پر تحقیقی و تنقیدی کام کے سلسلے میں اس نمبر کو کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۵۲ء میں نگار نے داغ نمبر پیش کیا اس میں داغ کی شخصیت اور شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

۱۹۵۴ء میں فرمانروانِ اسلام نمبر نیاز کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں نیاز نے ولادتِ نبوی سے لے کر دورِ حاضر تک مسلم حکومتوں کے عروج و زوال اور مدوجزر کی داستان پیش کی ہے۔ اس میں نیاز کی مورخانہ صلاحیتیں کھل کر سامنے آئی ہیں۔ انہوں نے انتہائی سوچ بچار اور تحقیق سے کام لے کر جامع و مستند تاریخ پیش کی ہے جو مسلم حکومتوں سے متعلق ہے۔

۱۹۵۵ء کا علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر بھی نیاز کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں عہدِ نبوی سے لے کر ہندوستانی مشاہیر تک مسلمانوں نے جن علوم و فنون کو متعارف کرایا ہے یا اہم کارنامے سرانجام دیئے ہیں، اُن کی تاریخ پیش کی ہے۔ یہ نمبر چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مختلف عہد اور مختلف ملکوں کی اسلامی سلطنتوں کا ذکر ہے۔ دوسرا حصہ علوم اسلامی کے ارتقا پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصے میں مشاہیر علمائے اسلام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چوتھے حصے میں ہندوستانی علماء کے کارناموں کا ذکر ہے۔ گویا یہ مسلمانوں کی علمی و ادبی خدمات کی جامع اور مستند تاریخ ہے۔

۱۹۵۸ء میں نیاز نے خدا نمبر تحریر کیا۔ اس میں نیاز نے دُنیا کے مختلف مذاہب میں خدا کا جو تصور ہے۔ اس پر تحقیقی و تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ اس میں مختلف مذاہب سے متعلق اہم

اور مفید معلومات ملتی ہیں۔

۱۹۵۵ء کے "اصنافِ سخن" نمبر میں شاعری کی مختلف اصناف غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، نظم، اور آزاد نظم پر جاندار اور عالمانہ مقالے ملتے ہیں جو شاعری کی دُنیا میں اِن اصناف کی اہمیت اور مستقبل میں اِن کے امکانات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

۱۹۵۸ء میں نیازؔ نے "معلومات نمبر" پیش کیا۔ یہ وہ معلومات ہیں جو وقتاً فوقتاً "نگار" میں شائع ہوتی رہیں۔ یہ مختلف علوم و فنون، اہم نامور شخصیات اور مختلف مقامات کی اہمیت مذہبی مسائل پر مشتمل ہے۔ اِس سے نیازؔ کی علمیت، مطالعے کی وسعت، آزادیٔ رائے اور تفکّر کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۹ء کا "تنقیحِ اسلام نمبر" نیازؔ کا لکھا ہوا ہے۔ اِس کا بنیادی موضوع مذہب ہے اِس میں دُنیا کے مختلف مذاہب پر بحث کرتے ہوئے، مذاہبِ عالم میں اِسلام کا مرتبہ متعیّن کیا گیا ہے۔ نیازؔ کا مذہب کے بارے میں جو منطقی و استدلالی روّیہ ہے وہ نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔

۱۹۶۰ء کا "انشائے لطیف نمبر" عائشہ خاں نے مرتب کیا ہے۔ عائشہ خاں نیازؔ سے بہت عقیدت و محبت رکھتی تھیں۔ یہ نمبر اُس عقیدت و محبت کا نتیجہ ہے۔ اِس میں نیازؔ کی زندگی اور فن پہ جاندار مقالے کے ساتھ ساتھ اُن کی مختلف تصانیف خاص طور پر مکتوبات کا انتخاب اور عورت کے بارے میں اُن کے نظریات سامنے لائے گئے ہیں۔

۱۹۶۱ء کا "غالبؔ نمبر" نیازؔ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ نمبر غالبؔ کی شخصیت، اُن کی فارسی و اُردو شاعری کی جدت و انفرادیت، اور اُسلوب کی خاص نہج پر مشتمل ہے۔ آخر میں کلامِ فارسی و اُردو کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ مطالعۂ غالبؔ کے سلسلے میں یہ ایک اہم اور مکمل تصنیف کہی جا سکتی ہے۔

۱۹۶۲ء میں نیازؔ نے "اقبال نمبر" پیش کیا۔ اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اِس میں

اقبال کی شخصیت و فن پر ایک نئے انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں تقریباً نصف حصہ خود نیازؔ کا نتیجۂ فکر ہے۔

۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۶ء کے خاص نمبر گرچہ نیازؔ کی زندگی میں شائع ہوئے ہیں لیکن اُن کی ترتیب و تدوین میں علّامہ نیازؔ فتح پوری سے زیادہ حصّہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ہے اس لئے انہیں زیرِ بحث لانا اِس جگہ مناسب نہیں۔

"ملاحظات"، "باب الاستفسار"، "باب الانتقاد"، "مالہ و ما علیہ"، "مطبوعاتِ موصولہ" اور "نگار" کے خاص نمبروں کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیازؔ یقیناً ایک کامیاب صحافی تھے اُنہوں نے "نگار" کے ذریعے صحافت کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ اور ادب و صحافت دونوں کو اِس طرح باہم پیوستہ کیا کہ دونوں کا وقار بڑھ گیا۔ "نگار" کے ذریعے اُنہوں نے حرّیتِ قلم، آزادیٔ فکر اور جرأتِ اظہار کی بُنیاد ڈالی۔ اور "نگار" کو ایک رسالے سے آگے بڑھا کر اُسے ایک تہذیبی انجمن ایک فکری تحریک اور ایک علمی و ادبی ادارہ بنا دیا۔ اِس کامیابی میں نیازؔ کی مستقل مزاجی اور قوتِ ارادی کو بڑا دخل ہے۔ اُنہوں نے اپنی پینتالیس ۴۵ سالہ صحافتی زندگی میں ہمیشہ ہر قسم کے چیلنج کا مقابلہ کیا۔ اور اِتنی جرأت و بے باکی کے ساتھ کہ "نگار" کا قاری اُن کی صحافیانہ دیانت و استقامت پر حیرت زدہ رہ گیا۔ "نگار" کے ہم عصر پرچوں میں متعدد پرچے بڑی آن بان کے ساتھ منظرِ عام پر آئے لیکن نیازؔ کے درجے کا مدیر نہ رکھنے کے سبب کچھ دِنوں بعد بند ہو گئے۔ خالص علمی و ادبی صحافت کی تاریخ میں "نگار" ہی وہ واحد ماہنامہ ہے جو ایک خاص معیار و مزاج کے ساتھ ہر ماہ پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ ایسے میں کون ہے جو نیازؔ کی صحافیانہ صلاحیتوں کی داد نہ دے گا اور "نگار" کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھے گا۔ دونوں نے نئی نسل کے قلمکاروں کی رہنمائی کی ہے۔ اور یہ رہنمائی ہمارے ادب و ادبیت اور صحافت و صحافی کے حق میں حد درجہ کارگر ثابت ہوئی ہے۔

باب ۶

تراجم

انسان اس خوب صورت کائنات کی سب سے خوب صورت حقیقت ہے۔ اُس نے جذبات سے معمور دل اور تدبر و تفکر سے لبریز ذہن کے ساتھ، ارتقائے حیات کی سینکڑوں کٹھن منزلیں طے کی ہیں۔ چنانچہ جب الہام کے جنگل میں انسانی ذہن آباد ہُوا اور سوچ کی وادی میں جذبوں نے خیمے ڈالے تو دِل کا یہ نگر لامتناہی وسعتیں اختیار کر گیا۔ زبان اور ذہن کے رابطے بڑھے تو انسان دُور دراز بسنے والے لوگوں کی زبان بھی سمجھنے لگا۔ یُوں اِنسان نے دوسروں کے مذہبی، سیاسی، تاریخی، سماجی، سوانحی، علمی و ادبی خیالات سے بھرپور استفادہ کیا۔ علمی و ادبی لین دین کا یہ عمل "ترجمہ" کہلایا۔ اور اُس سے پتا چلا کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کیا کیا علمی و ادبی خدمات سرانجام دی جاچکی ہیں۔ ترجمے کے وسیلے کی یہ روایت بہت اہمیت و افادیت کی حامل ہے۔

ترجمہ اصل کی نقل ہے۔ اِس لئے کہ یہ براہِ راست اِظہار نہیں بلکہ اصل اِظہار کا عکس ہوتا ہے اور اِس کا حقیقی مقصود یہ ہے کہ اختلافِ زبان کے باوجود اصل کا قریب ترین مفہوم ذہن نشین ہو جائے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں:۔

"ترجمے کی اہمیت یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کے ذریعے نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں، جس سے ذہنی جذب و قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور دوسری طرف زبان کی قوتِ اظہار میں نئے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ زبان بھی بدلتے ہوئے طرزِ احساس و خیال کی نئی نئی تصویریں اُبھارنے کی اہل ہو جاتی ہے۔"[1]

گویا ترجمہ ہی کے ذریعے علوم و فنون لسانی پیراہن بدلتے ہیں، اور عالمگیر ملکیت بنتے ہیں۔ انسان رنگ و نسل، جغرافیائی حدود اور زبان کے اعتبار سے تو مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اُن کے دِل کی آواز اور جذبوں کی زبان عموماً ایک ہی ہوتی ہے۔ وہ اکثر ایک ہی طرح سوچتے اور محسوس کرتے ہیں۔ محبت کی تڑپ اگر میر کی رگ رگ زخمی کئے ہے تو یہی محبت کیٹس کی جان لے لیتی ہے۔ منٹو اگر معاشرے کی تلخ جان لیوا حقیقتوں کا سفاکی سے پوسٹ مارٹم کرتا ہے تو موپساں اسی انداز میں منافقتوں کے نقاب نوچتا ہے۔ فرق جذبات و احساسات یا سوچ اور فکر کا نہیں بلکہ زبان و بیان کا ہوتا ہے۔ تراجم صرف یہی نہیں کہ کسی زبان کی ترقی کا باعث بنتے ہیں بلکہ آفاقی ادب سے بھی عام افراد کو روشناس کراتے ہیں۔ عمر خیام، کالی داس، شیکسپیئر، میکسم گورکی، اقبال و غالب اور فیض کو جو عالمی شہرت حاصل ہوئی ہے، وہ ترجموں ہی کی رہینِ منت ہے۔

ترجمہ، تفسیر اور تلخیص کی بُنیاد تو ایک ہی ہے لیکن تفسیر میں خیالات، وضاحت اور تشریح کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ تلخیص میں خیالات کو مختصر کر کے صرف اہم نکتوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ لیکن ترجمے کے اصل متن کو اسی خاص دائرہ میں ایک نئی زبان کا پیراہن عطا کیا جاتا ہے۔ اس لئے ترجمے کا کام تشریح و تلخیص کے مقابلے میں مشکل اور محنت طلب ہے۔ امیر چند بہار کے مطابق:۔

---

[1] "تنقید و تجربہ" ص ۱۲۲ ۔ بار اوّل اگست ۱۹۶۷ء مشتاق بک ڈپو شیدی روڈ کراچی نمبر ۱

"ایک زبان سے ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرتے ہوئے اصل کے حُسن کو دو بالا کر دینا تو بہت بڑا وصف ہے لیکن اصل کے حُسن کو برقرار رکھنا اچھے ترجمے کے لئے کم سے کم شرط ہے۔ اور اگر مترجم کے ہاتھوں اصل کی سپرٹ ہی مفقود ہو جائے تو نقشِ ثانی کتنا ہی دلآویز کیوں نہ ہو وہ ترجمہ نہیں کہلائے گا بلکہ کچھ اور ہی چیز بن جائے گی۔"[1]

ترجمہ کرتے ہوئے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ ترجمے میں اصل مفہوم صحیح طور پر ادا ہو جائے اور صحیح مفہوم اُسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب لفظی ترجمہ کرنے کی بجائے مفہوم کو سمجھ کر اپنے الفاظ میں۔ بامحاورہ زبان میں ادا کیا جائے۔ ہر زبان میں جملوں کی ساخت اور تراکیب سازی کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اُسے اپنی زبان کے مزاج اور ساخت کے مطابق ڈھالنا چاہیئے فنی اصلاحات کا لفظی ترجمہ کرنے کی بجائے اپنی زبان کی اصطلاحات کو استعمال کرنا چاہیئے ترجمہ کے لئے دو زبانوں کی ساخت اور مزاج سے واقفیت ضروری ہے۔ یعنی جس زبان میں ترجمہ کرنا ہو، اُس کی گہرائیوں کو جاننا اور جس زبان سے ترجمہ کرنا ہو، اُس کی نزاکتوں کو پہچاننا دونوں زبانوں سے متعلق معلومات جس قدر دُرست ہوں گی، ترجمہ اُتنا ہی صحیح و دُرست ہوگا۔ مترجم کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرزِ ادا کا خاص خیال رکھے۔ ترجمے کے لہجہ اور مزاج میں اصل، اور اُس کے انداز سے فن کار کی جھلک ضرور نظر آتی رہے۔ نئی زبان اور نیا اسلوب فن کار کی زبان و اُسلوب سے ہم رنگ و ہم آہنگ ہو۔ بعض اوقات ایک زبان دوسری زبان کے مفہوم و تاثر کی متحمل نہیں ہو پاتی۔ اور جذبوں کی ترجمانی میں کسی انجانی کمی کا احساس ہونے لگتا ہے اس کمی کو مترجم اپنے جمالیاتی شعور سے پورا کرتا ہے۔ اور مترجم سے آگے بڑھ کر تخلیقی فن کار کی سطح کو چھُو لیتا ہے۔ بعد ازاں اُس کا ترجمہ، بے جان ترجمہ نہیں رہتا بلکہ تخلیق کا ہم پلّہ ہو جاتا ہے

---

[1] "نسیمِ مغرب" ص ۹، بار اوّل ۱۹۴۳ء، انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ

لسانی مہارت اور ہر دو زبانوں کے رموز و نکات پر کامل دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ترجمہ کرنے والے اور ترجمہ کئے جانے والے افراد کے مزاج و ذوق میں ہم آہنگی بھی ہو۔ دونوں کی جمالیاتی حس کو متحرک اور بیدار کرنے والے عناصر کم و بیش ایک سے ہوں۔ دونوں ہم خیال ہیئت اور مواد کے تخلیقی رشتوں کا احساس و شعور رکھتے ہوں۔ چونکہ کسی تخلیق یا فن پارہ میں جو الفاظ تراکیب، تشبیہات و استعارات استعمال ہوتے ہیں، اُن سب کا ایک تہذیبی پس منظر اور تاریخ ہوتی ہے۔ اس لئے مترجم کو اس تہذیبی پس منظر اور تاریخ کا پورا ادراک اور شعور بھی ہونا چاہیئے۔ نیز مترجم کو فن کار کی زندگی، اُس کے ماحول و پس منظر، تہذیبی اقدار اور ثقافتی روایات سے بھی گہری واقفیت ہونی چاہیئے۔ اب رہ گیا ترجمے کے معیار کا مسئلہ تو اس سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیئے کہ ادب کی مختلف سطحوں کی طرح ترجمے بھی مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ آسانی کے لئے ہم انہیں تین خانوں میں رکھ سکتے ہیں:۔

پہلی قسم معلوماتی ادب کی ہے جس کے تحت مختلف علوم، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، نفسیات وغیرہ کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ یہاں لب و لہجہ اور لفظوں کی تاثیر کے بجائے موضوع اور اُس کے علمی و فکری پہلو کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ دوسری قسم کے ترجموں میں ناول اور افسانہ شامل ہیں۔ یہ خالصتاً ایک لفظ کا دوسری زبان میں منتقل کرنا نہیں بلکہ ایک تہذیبی معنویت کو دوسری تہذیبی معنویت میں پیش کیا جاتا ہے۔

تیسری قسم خالص ادبی یا جمالیاتی سطح کے ترجموں کی ہے۔ یہاں لفظ کی تاثیر، جذبے اور احساس کی وہی اہمیت ہے جو اصل تخلیق میں حاصل ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی تخلیق ہی ہوتی ہے لیکن ترجمہ کو تخلیق سے بڑھنا نہیں چاہیئے۔ البتہ ترجمے میں فن کار کی رُوح کی آواز صاف سُنائی دینی چاہیئے۔ ترجمہ کی خوبی یہ ہو کہ جن محاسن شعر و ادب نے اصل عبارت میں جان ڈال دی ہے وہی محاسن اُس کے ترجمے میں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

اُردو میں ترجمے کی روایت خاصی قدیم ہے۔ عام طور پر ترجمے کی ابتدا ملا وجہی کی "سب رس"

سے سمجھی جاتی ہے۔ ۱۶۳۵ء میں وجہی نے "سب رس" کو پیش کیا۔ یہ ادبی نوعیت کا بامحاورہ و تخلیقی ترجمہ تھا۔ شمالی ہند میں پہلا ترجمہ ۱۷۷۶ء میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین کا ترجمہ قرآن مجید ہے۔ دکن میں زیادہ تر تصوف کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ چنانچہ اس دور کے اہم ترین تراجم میں سید محمد فاروق کا "طوطی نامہ"، "ملا حسین واعظ کاشفی نے "روضۃ الشہدا" کا اردو ترجمہ، اور ۱۷۳۱ء میں فضلی نے "دہ مجلس" یا "کربل کتھا" کے نام سے کیا ۱۷۹۹ء میں ایک اہم ترین ترجمہ شدہ کتاب "نو طرزِ مرصع" ہے۔ یہ ادبی کتاب تھی۔ بامحاورہ ترجمہ کی اس کوشش میں تخلیقی عنصر کا فقدان رہا۔ سلاست اور سہل نگاری کی بجائے عربی و فارسی تراکیب ویسے ہی موجود رہیں۔ اردو میں آسان اور باقاعدہ ترجموں کا آغاز انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج سے ہوا۔ اگرچہ ان کا پس منظر کافی حد تک سیاسی تھا لیکن ترجموں کے طویل کام میں علمی، ادبی اور مذہبی کتابیں، عربی، فارسی اور سنسکرت سے اردو میں منتقل کی گئیں۔ اور پہلے سے بہتر تراجم وجود میں آئے۔

ترجموں کا تیسرا دور دلی کالج سے شروع ہوا۔ اس میں علمی اور سائنسی کتابوں کے تراجم ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمۂ قرآن مجید خاص اہمیت رکھتا ہے جو دلی کی خاص بامحاورہ زبان میں ہے۔ مگر نذیر احمد کا اصل کارنامہ "تعزیراتِ ہند" ہے، یہ پہلی کتاب ہے جس میں قانونی اصطلاحات کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

اردو تراجم کے چوتھے دور کی ابتدا ۱۸۶۲ء میں سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی سے ہوئی۔ اس میں سائنسی اور علمی موضوعات پر ترجمہ کرنے کے لئے باقاعدہ مترجمین کا تقرر کیا گیا۔ اس سوسائٹی نے چالیس کے قریب کتابوں کے تراجم کئے۔ ان کی مجموعی خصوصیت سادگی، سلاست اور روانی ہے، کہ جو بات بھی دل سے نکلتی ہے، دل پر اثر کرتی ہے۔

اردو تراجم کے سلسلے میں دارالمصنفین اعظم گڑھ، "انجمن ترقی اردو" دارالترجمہ حیدرآباد دکن، ہندوستان اکیڈمی، اور "اردو اکیڈمی" کی خدمات بیش بہا ہیں۔ جن کے تحت سائنسی، علمی، قانونی،

عمرانی، تعلیمی، اور دوسری علمی و ادبی کتابوں کے تراجم پیش کئے گئے۔ اس کام میں اردو کے نامور ادیبوں مولانا ظفر علی خاں، سید سجاد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا عبد الماجد دریا آبادی، ڈاکٹر یوسف حسین، منشی احمد علی، اور نیاز فتح پوری نے بھرپور حصہ لیا۔ اور اچھے ترجموں کے ذریعے موضوع اور اسالیب کے نئے امکانات، زبان و لسانیات کی نئی تشکیل سے اردو کو وسعت بخشی۔

نثر افسانہ اور ناول کے ساتھ ساتھ اردو میں منظوم تراجم بھی ہوئے۔ انگریزی شاعری سے اردو میں ہیئت اور مواد کے نئے راستے تلاش کئے گئے۔ کامیاب ترجمہ جس میں اصل نظم کا حسن اور فنی نزاکت و لطافت برقرار رہے، خاصا مشکل کام ہے۔ کیونکہ استعاروں اور کنایوں سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اور جب تک اصل نظم کی باریکیوں اور گہرائیوں سے پوری واقفیت نہ ہو ترجمے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود اردو میں کامیاب منظوم تراجم ہوئے ہیں۔ عبدالحلیم شرر، وحید الدین سلیم، مولانا ظفر علی خاں، حسرت موہانی، اثر لکھنوی، تلوک چند محروم، اور نیاز فتح پوری کے نام خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

منظوم ترجموں سے اردو زبان کی توانائی ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان شاعری اور موسیقی کے لئے بہت موزوں ہے اور شاعرانہ خیالات اور لطیف جذبات نہایت کامیابی اور خوب صورتی سے ادا ہو سکتے ہیں۔

نیاز فتح پوری اعلیٰ درجے کے مترجم بھی ہیں۔ زبان و لسانیات اُن کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور ترکی پہ کامل عبور حاصل تھا۔ چنانچہ انہوں نے علمی، ادبی، تاریخی، مذہبی کتابوں کے ترجمے کئے۔ اس میدان میں بھی انہوں نے اپنی ذہانت اور فن کی سنجیدگی و ندرت کو منوایا ہے۔ اُن کے تراجم میں عموماً تخلیقی رنگ غالب ہے۔ چونکہ انہیں زبان اور اس کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ کا پورا پورا شعور تھا۔ نیز مختلف زبانوں پر عبور نے اُن کے ترجموں میں فنکارانہ نفاست پیدا کر دی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اُن کی فن کارانہ زندگی کی ابتدا ہی ترجمے کے ذریعے اس وقت ہوئی جب انہوں نے ۱۹۰۸ء میں Arrow & Song کا ترجمہ "تیر و نغمہ" کے نام سے

کیا۔ اِس نظم میں اُن کی رُومانی وجمالیاتی حس ایک خاص انداز میں اُبھری ہے۔ بعد میں اُن کی یہ جمالیاتی انفرادیت، شعور سے ہم آہنگ ہو کر عرفانِ حقائق کا ذریعہ بن گئی ہے۔ وہ نظم کی نزاکتوں اور گہرائیوں کا پورا پورا ادراک رکھتے ہیں۔ اور یہ ادراک اُن کے جذبہ اور احساس سے مِل کر ایسی نازک اور دلکش فضا پیدا کرتا ہے جو اصل نظم کے حُسن سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ گرچہ اِس نظم کو تسکین سوردنوی نے بھی "ناوک ونغمہ" کے نام سے ترجمہ کیا ہے مگر جذبہ کی وہ لطافت، احساس کی وہ نزاکت اور جمالیاتی شعور کا وہ عرفان، جو نیازؔ کے ترجمے میں ہے اُن کے ہاں نظر نہیں آتا۔ "تیر و نغمہ" اور "ناوک و نغمہ" کا فرق ملاحظہ ہو:-

نیازؔ

اِک شعر ہوا میں میں نے چھوڑا گا کر
معلوم نہیں کہاں وہ ٹھہرا جا کر
ہے کِس کی نظر کی تیز ایسی پرواز
جو نغمہ کی ہو سکے ہوا میں دمساز
ایک عرصہ کے بعد تیر آیا وہ نظر
اِک نخل بلوط میں چُھپا تھا جا کر
وہ شعر بھی مِل گیا مجھے نخل میں
پیوست تھا میرے اِک محب کے دِل میں

تسکینؔ

میں نے گایا ایک نغمہ اِس فضا میں دوڑ کر
وہ کہاں گو نجا مِلا اِس کا نہ مجھ کو کچھ اثر
کونسی وہ آنکھ ہے جِس کی نظر ہے اتنی تیز
جو شِشِ رفتار اِس کی دیکھے ہنگام گُریز
ہائے جب دُنیا نے ڈالیں ہزاروں گردشیں
میں نے پایا اپنا ناوک ایک بیخ نخل میں
اور وہ نغمہ مِلا اوّل سے آخر تک تمام
در دِلِ یارے کہ اُنرا بود از تسکین مدام

تکلم ایک ہے۔ موضوع ایک ہے، خیالات ایک سے ہیں مگر دونوں کے ترجمے میں نُمایاں فرق ہے۔ نیازؔ کے ہاں نازک احساسات، جذبہ کی گہرائی کے ساتھ، لاشعوری اور آمد کے انداز میں سامنے آئے ہیں۔ اِس کے برعکس تسکینؔ کے ہاں شعوری طور پر، لفظوں کے انتخاب کا رویّہ مِلتا ہے۔ کامیاب مترجم وہی ہے جو اصل تجربہ کی رُوح کو برقرار رکھے۔ نیازؔ کے ہاں اِس کا پورا لحاظ پایا جاتا ہے۔ اُنہوں نے انگریزی، ہندی، اور ترکی کی مختلف نظموں کے تراجم بھی

کئے ہیں۔ اور ہر جگہ شاعری کے حُسن و جمال اور نزاکت و لطافت کو برقرار رکھا ہے۔

نیازؔ کے تراجم مختلف النوع موضوعات و اصناف سے متعلق ہیں۔ اِن میں شاعری بھی شامل ہے اور مذہب و تاریخ بھی۔ فلسفہ و نفسیات سے بھی اِن کا تعلق ہے اور ادب و انشاء سے بھی۔ وہ باقاعدہ مترجم بھی ہیں اور بے قاعدہ مترجم بھی۔ باقاعدہ مترجم اِس طرح کہ کچھ کتابوں کا اُنہوں نے ہو بہو ترجمہ کیا اور کچھ کے بعض اجزا کو اُردو میں منتقل کر دیا ہے۔ نیازؔ کی مندرجہ ذیل کتابیں براہِ راست ترجمے کی ذیل میں آتی ہیں۔

۱۔ عرضِ نغمہ۔
۲۔ جذباتِ بھاشا۔
۳۔ جھانسی کی رانی۔
۴۔ اصحابِ کہف۔
۵۔ مسئلۂ شرقیہ۔
۶۔ محمد قاسم سے ہلہ بابر تک۔
۷۔ صحابیات
۸۔ ترغیباتِ جنسی یا شہوانیات
۹۔ An Oriental Biographical Dictionary

"عرضِ نغمہ"، بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرۂ آفاق تخلیق "گیتا نجلی" کا اُردو ترجمہ ہے۔ اِسے نیازؔ نے آغا محمد طاہر کی فرمائش پر ۱۹۱۴ء میں ٹیگور کے انگریزی ترجمے سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ ٹیگور کی شاعری بنیادی طور پر رُوح اور فطرت کی پرستش کا درس دیتی ہے اور اپنے اندر جذب و کشش کا غیر معمولی مواد رکھتی ہے۔ چنانچہ ٹیگور کے شاعرانہ تخیل اور زورِ قلم نے یورپ کو خاصا متاثر کیا ہے۔ یورپ کی شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو جس میں "گیتا نجلی" کا ترجمہ نہ ہُوا ہو۔ اِس کی اہمیت کا اندازہ اِس سے کیجئے کہ ۱۹۱۳ء میں "گیتا نجلی" کو بہترین تصنیف

قرار دے کر ٹیگور کو نوبل پرائز" دیا گیا۔ نیازؔ کو گلہ یہ ہے کہ ہم اپنے قابل جواہر کو اُس وقت پہچانتے ہیں جب باہر کا جوہری اُن کی قدر و قیمت لگاتا ہے۔ اُن کے مطابق :-

"جس طرح اس سے زیادہ بد قسمت تغافل ایک کاشتکار کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اُسے خود معلوم نہ ہو کہ اُس کی پیداوار کیا ہے اور معلوم بھی ہو تو ایک اجنبی کی زبانی۔ اسی طرح اس سے زیادہ شرمناک بد مذاقی ایک ملک کی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے ہاں کے جوہر قابل سے بے خبر ہو اور آگاہ ہو بھی تو ایک غیر ملک کے کہنے سے جس کو صورتاً و سیرتاً اس سے ایک تعلق بعید ہو۔"[1]

نیازؔ کا موقف یہ ہے کہ خدا جب اپنی کسی قوت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک بیدار دماغ، ایک ہوش مند طبیعت کو منتخب کر کے اُسے مظہر فیضان قرار دیتا ہے۔ وہ قوت اگر چہ صورت، مذہب و ملت کی تفریق سے بے پروا برکت و راحت اور شرق و غرب کو نشیمن بناتی ہے اور ہمیشہ ایسے سینوں کی متلاشی رہتی ہے جو حوصلوں سے معمور اور دلولوں سے لبریز ہوتے ہیں ٹیگور ایسا ہی ایک فن کار ہے۔ نیازؔ ٹیگور سے بے حد متاثر تھے۔ اُس کا رنگ شاعری ان کے فن میں بھی بخوبی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ تخیل کی رنگینی، زبان کا ترنم و سادگی، زبان کی حلاوت اور الفاظ کی شیرینی کو نیازؔ شاعری کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ خوبیاں مشرق میں اگر کسی فن کار کے ہاں اُنہیں نظر آتی ہیں تو وہ ٹیگور ہے۔ ٹیگور کی نظموں کا پہلا حُسن اُس کی موسیقیت ہے۔ وہ فطری موسیقی جو نہ صرف انسان بلکہ ہر ذی روح کا خمیر اولین ہے۔ نیازؔ کہتے ہیں کہ ایک روز وہ گیتانجلی کا انگریزی ایڈیشن لئے اکبر آلہ آبادی کے پاس بیٹھے تھے تو اُنہوں نے ٹیگور کی تصویر دیکھ کر کہا کہ کھماج راگنی کی تصویر بالکل اسی طرح بنائی جاتی ہے۔ چنانچہ ٹیگور کی کوئی نظم ایسی نہیں،

---

[1] مقدمہ گیتانجلی، ص ۹ ۱۹۱۴ء جمال پریس دہلی

...ں مترنم زبان، نغمہ و سرور، ربط و لے سے ادائے مطلب میں استفادہ نہ کیا گیا ہو۔ ان ...ھانے سے نیازؔ بے حد متاثر ہوئے چنانچہ اُنہوں نے اس کا ترجمہ کرنے کی ٹھان لی۔ اُن کا ...ہنا ہے کہ موسیقی اگر کوئی زبان اختیار کر سکتی اور اظہار جذبات کا ذریعہ ہو سکتی ہے تو وہ ٹیگور ...کی گیتانجلی ہے۔ اس کے عنوان "عرض نغمہ" کا ذکر کرتے ہوئے نیازؔ لکھتے ہیں :-

"ٹیگور نے خود گیتانجلی" کو SONG OF OFFERING یعنی عرض نغمہ ظاہر کیا ہے۔ انداز بیان کا عجز، لہجہ کی فتادگی، الفاظ میں ایک خاص سکنت، یہ سب مل کر کچھ ایسی رقت پیدا کر دیتے ہیں کہ بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں اور کچھ ایسا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جیسے کوئی فقیر لذت موسیقی سے سرشار کوئی چیز تنہا جنگل میں بیٹھا ہوا گا رہا ہے۔ اور خود بھی کبھی کبھی پڑھ پڑھ کر ...

...بت کی اسی سچائی اور جذبات کی شدت و گہرائی سے نیازؔ بہت متاثر تھے۔ موسیقی کی زبان ...ی اظہار جذبات کے ساتھ ساتھ ٹیگور نے رنگ و تعقل سے بھی اپنی دلبستگی کا ثبوت دیا ہے ...مناظر قدرت میں جذب ہو جانے والی نگاہ اور اُن کی رنگینیوں میں ڈوب جانے والا دل ...ے کر آیا تھا۔ اُس کے الفاظ اصل رنگ میں ذہن کو مسحور کر لیتے ہیں۔ نیازؔ نے ترجمہ کرتے ہوئے ...ن سب باتوں کا خیال رکھا ہے کہ گیتانجلی "کا اصل رنگ روپ اپنی تمام تر آب و تاب ...کے ساتھ برقرار رہے۔ ترجمے میں فن پارہ کی اصل رُوح صاف ترجمانی، مجلسی دکھائی دے۔ چنانچہ ...یازؔ الفاظ کی گہرائیوں میں گم ہو کر فن کار کے تجربے کو اُسی انداز میں محسوس کرنے کے بعد اپنے الفاظ ...میں ڈھالتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی زبان سے نکلا ہوا لفظ لفظ دل میں اُتر جاتا ہے۔ مثالاً ...ترجمے کا ایک ٹکڑا انگریزی متن کے بالمقابل اس جگہ درج کیا جاتا ہے۔ ذرا اِن دونوں پر ...بیک وقت نظر ڈالیئے :-

---

[1] مقدمہ "گیتانجلی" ص ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء نگار پاکستان کراچی نمبر ۳

اُردو	انگریزی
پھندے اُستوار ہیں لیکن	Obstinate are the trammels, but
میرا دل برابر دُکھتا ہے جب میں	myheart aches when I try to
ان کو توڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔	break them.
میں صرف آزادی چاہتا ہوں لیکن	Freedom is all Iwant' but to
اس کی آرزو کرتا بھی شرماتا ہوں۔	hope for it I feel ashamed.
مجھے یقین ہے کہ یہ بے بہا دولت	I am certain that priceless wealth
تیرے اندر موجود ہے۔ اور یہ کہ	is in thee, and that thou art my
تُو میرا بہترین دوست ہے۔ لیکن	best friend, but Ihave not
مجھ میں اتنا دل نہیں کہ ان نمائشوں کو	the heart to sweep away the
دُور کردوں جو میرے کمرے میں بھری پڑی ہیں۔	tinsel that fills my room.
وہ چادر جو مجھے ڈھکے ہوئے ہے	The shroud that covers me is a
خاک وفنا کی چادر ہے۔ میں	shroud of dust and death. I
اُس سے نفرت کرتا ہوں۔ تاہم محبت سے	hat it, Yet thug it in love.
اُسے لپٹائے ہوئے ہوں۔ میرا قرض	My debts are large, my failures
کثیر ہے۔ میری ناکامیاں عظیم اور میری شرم	great, my shame secrt heavey,
پوشیدہ و گراں۔ تاہم جب میں اپنی بھلائی	Yet when I come to ask for
مانگنے آتا ہوں تو اس خوف سے کانپ	my prayer be granted.
اُٹھتا ہوں کہ کہیں میری التجائیں قبول نہ ہو جائیں۔[1]	

سلہ: "گیتانجلی" ص ۴۸، نگار پاکستان، کراچی۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء

میں ایک بھکاری لڑکی کی طرح	I sat like a beggar maid,
منہ پر آنچل ڈالے بیٹھی ہوں۔	drawing my skirt over my face,
اور جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں	and when they ask me, what
کیا چاہتی ہوں تو میں اپنی آنکھیں	it is I want, I drop my eyes
جُھکا کر رہ جاتی ہوں۔ اور اُنہیں کوئی	and answer them not.
جواب نہیں دیتی۔ اور آہ حقیقتاً میں	ah, how, indeed, could I tell
اُن سے کہہ بھی کیسے سکتی ہوں کہ مجھے تیرا	them that for thee I wait, and
انتظار ہے۔ تُو نے آنے کا وعدہ	that thou last promised to
کیا ہے۔[1]	come.

اس ترجمے میں نیاز نے ٹیگور کی شاعری کی رُوح کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ٹیگور کی شاعرانہ تخیل و عظمت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ اس کا حُسن دوچند ہوگیا ہے۔ نیاز نے ترجمہ کرتے ہوئے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ کوئی لفظ بغیر ترجمے کے نہ رہ جائے۔ اور کوئی ترکیب چھوٹنے نہ پائے۔ مکمل الفاظ میں تغیر نہ ہو۔ جو جدّت و نُدرت، انگریزی زبان میں موجود ہے اُس کے استعمال میں کوئی خرابی واقع نہ ہو۔ ساتھ ہی اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ترجمہ حد درجہ سادہ و دل نشین ہو اور اس میں وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک پیراگراف کا ترجمہ دیکھئے۔

میں تم سب کے سامنے جُھکتا	I have got my leave. Bid me farewell
ہوں سب مجھے خدا حافظ کہو،	my brothers! I how to you all and
اور روانہ ہوتا ہوں۔	take my departure.

سلہ: "گیتانجلی" ص ۵۵

Here I give back the keys of my door	اپنے دروازہ کی ساری کُنجیاں
and I give up all claims to my	واپس دیتا ہوں اور اپنے مکان کے
house. I only ask for last	سارے دعوے ترک کرتا ہوں۔ اَب میں
Kind words from you.	تم سے مہربانی کے آخری الفاظ سُننا چاہتا ہوں
We were neighbours for long but	ہم تم عرصہ تک ہمسایہ رہے ہیں لیکن
I received more than I could	مجھے ہمیشہ اُس سے زیادہ ملا جتنا میں نے
give. Now the day has downed	دیا۔ اَب دن نکل آیا ہے۔
and the lamp that lit dark	اور چراغ جو میرے تاریک
corner is out.	گوشہ کو منور رکھتا تھا گُل ہو گیا ہے۔
A summons has come and I	پیامِ طلب آ گیا ہے اور اَب
am ready for my journey.	مَیں سفر کے لئے آمادہ ہوں[1]

بیان کی سادگی و روانی کا یہ رنگ ہر جگہ موجود ہے۔ کہیں کہیں عربی کے مشکل الفاظ بھی موجود ہیں مثلاً "زائم المجدت" "وسیع البسط" وغیرہ ممکن ہے۔ نیازؔ کو مجبوراً ایسا کرنا پڑا ہو۔ بہرحال عرض نغمہ ٹیگور کی "گیتانجلی" کا نہایت کامیاب و خوب صورت ترجمہ ہے۔ اور نیازؔ نے اس کے ذریعے ٹیگور کی شاعری سے اُردو خواں طبقے کو متعارف کرانے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

نیازؔ ہندی بھاشا پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے ہندی بھاشا کے بعض اجزا کو بھی اُردو میں منتقل کیا۔ اس کے لئے اُنہوں نے مختلف ہندی شعراء کے دوہوں کا انتخاب کیا، اور "جذباتِ بھاشا" کے نام سے ایک مختصر سی کتاب کمال درجہ کی خوب صورتی سے اُردو

[1] "گیتانجلی" ۔ ص ۹۱

کر دی ہے۔ وسعتِ زبان کے لئے بہت گنجائش ہے۔ دوسری زبانوں کے نزاکت معنوی اور نُدرتِ بیان سے اُردو کا دامن مالا مال ہو سکتا ہے کہ ساخت کے اعتبار سے اِس زبان میں بہت لچک ہے۔ اور ہر زبان کے الفاظ اپنے اندر کھپانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہندی شاعری کے جذبات و اثرات، اور ترنم و موسیقیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اِس میں کلام نہیں کہ بھاشا کی شاعری جذبات و اثرات سے مالا مال ہے اور جس قدر ترنم اور موسیقی اِس زبان میں ہے کسی دوسری زبان کو میسّر نہیں اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا عاشق اِس زبان کی شاعری کو ملا کسی اور زبان کو نصیب نہیں ہُوا[1]۔"

ہندی شاعری کے اِسی حُسنِ جمال، نرمی و نزاکت اور ترنم و موسیقیت نے نیازؔ کے دل و ذہن پر گہرا اثر کیا۔ اور اُنہوں نے منتخب دوہوں کو اُردو میں منتقل کرنا ضروری خیال کیا۔ چند دوہوں کے ترجمے بطورِ مثال اِس جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔

ے
سجن سدھارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی کیجیو کہ بھور کبھو نا ہوئے

"صبح کو میرے "پی" جانے والے ہیں اور اِس لئے جو حالت میری آنکھوں کی (کثرتِ اشکباری سے) ہونے والی ہے۔ ظاہر ہے سو بار خدایا اِس رات کو اِس قدر طویل کر دے کہ صبح ہی نہ ہو۔ ہائے کیا سادگی تمنا ہے۔ اِس کہنا ہی جو سے جس قدر محبت ٹپک رہی ہے اس کے اظہار کے لئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے[2]۔"

[1] "جذباتِ بھاشا" ص ۲۵، دسمبر ۱۹۴۹ء ادارہ ادب العالیہ کراچی ۱۸

[2] " " " " " ص ۳۳

ے کت درگ بھرے سُبال، مم آیو بھایو نہیں
ڈالے درگن کھپال مِن لسیے تو دررشن بن

"اِس دوہے کے پہلے مصرعہ میں خطاب کرنے والا مَرد ہے۔ اور دوسرے میں عورت کی طرف سے اِس کا جواب ہے۔ شوہر جو عرصے کے بعد پردیس سے لوٹ کر آیا تو فرطِ مسرت سے اُس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس کی حالت دیکھ کر شوہر چھیڑتا ہے کہ: تمہاری پُر آب آنکھیں (کیوں) جس سے (معلوم ہوتا ہے) میرا آنا شاید ناگوار ہوا ہے وہ جواب دیتی ہے کہ (یہ بات نہیں بلکہ) میری آنکھیں جو تمہارے فراق میں بیمار ہوگئی تھیں (آج تمہارے آنے سے صحت یاب ہوئی ہیں) یہ اُن کا غسلِ صحت ہے۔"[1]

ے پچھوات چنچل مَین بچ گھونگٹ پٹ جھین
مانہو سُر سرتا بمل جل اُچھلت جُگ مین

"اُس کی چنچل آنکھیں، باریک گھونگھٹ کی اوٹ میں ایسی نظر آتی ہیں گویا گنگا کے صاف و پاک پانی میں دو مچھلیاں اُچھل رہی ہیں۔ ہندی زبان میں آنکھوں کو مچھلیوں سے تشبیہ دینا عام ہے۔ اُردو فارسی میں میری نگاہ سے نہیں گزری ممکن ہے کہ ہو مگر میرے علم میں نہیں۔ میری رائے میں آنکھوں کی بے چینی و بے قراری دیکھتے ہوئے اُن کو مچھلی کہنا نزاکت کی بات ہے اور خاص کر جب دو سپید مگر باریک ریشمی ساری کے گھونگھٹ

[1] "جذباتِ بھاشا" ص ۷۰

میں ہوں۔ اِس کے لئے ضرورت کہ پہلے انسان اُس وقت کی حالت کو پیشِ نظر رکھے اور پھر اُس کا لُطف اٹھائے۔"[1]

یُوں نیازؔ نے محض خیال کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ہی منتقل نہیں کر دیا بلکہ اصل اشعار کی باریکیوں اور گہرائیوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ ترجمے میں اگر اصل خیال کی لطافتیں اور نزاکتیں باقی نہ رہیں تو یہ اصل شعری تجربے کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہے۔ نیازؔ نے ہر دوہے کے نقشِ مضمون کو اپنی رُوح کا جزو بنائے بغیر کوئی بات نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے تراجم میں دلکشی کا عنصر ہر جگہ موجود ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ نیازؔ نے نثری تراجم کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ باقاعدہ ترجمہ کی جانے والی تصانیف میں "اصحابِ کہف" "جھانسی کی رانی" اور "مسئلہ شرقیہ" خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

"اصحابِ کہف" پانچ ایکٹ کا حُزنیہ ڈرامہ ہے، جو مصری انشاپرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہلِ کہف" کا ترجمہ ہے۔ نیازؔ نے ۱۹۳۶ء میں اِس کا ترجمہ کیا۔ اصل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے "اصحابِ کہف" کی روایت پر عاقلانہ تبصرہ کیا ہے۔ تمثیل کی جان وہ حصہ ہے جہاں موضوعِ محبت پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور اِس کی عظمت و ابدیت کو نہایت اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مشلینا، مرنوش، یملیخا، پریسکا، غالیاس، اور اُن کا کتا حقیقی کردار ہیں۔ پریسکا اور مشلینا کی محبت ایک ابدی سچائی ہے۔ نیازؔ اِس میں جذبے کی شدت کو شامل کر کے، ایک تاریخی اور مذہبی حقیقت میں، انسانی و فطری رنگ بھر دیا ہے۔ وہ سچی و منطقی کہانی جس کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ نیازؔ کے زورِ قلم سے مذہبی و تاریخی حقیقت نہیں بلکہ ایک رُومانی داستان اور دلکش و دل آویز کہانی بن گئی ہے۔ اِس کہانی کو نیازؔ نے جامع اور خوب صورت انداز میں اُردو میں منتقل کیا ہے اگر نیازؔ پیش لفظ میں خود نہ بتا دیتے کہ یہ ترجمہ ہے تو کسی کو گمان بھی نہ ہوتا اِس لئے کہ اِس میں تخلیقی رُوح پوری طرح موجود ہے۔ سادگی اور روانیِ تحریر اِس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہی ترجمے

[1] "جذباتِ بھاشا" ص ۹۲

کا فن ہے کہ کہیں یہ محسوس نہ ہو کہ زبان اُدھار لی گئی ہے۔ لفظ لفظ نیاز کی تحریر کا حصّہ بن کر عجیب لطف دیتا ہے:۔

"تم اِسی خواب وحقیقت میں مُبتلا رہو، مجھے تو اَب موت کا کوئی ڈر نہیں رہا کیونکہ میرا دل پہلے ہی مرچکا ہے۔ تم مجھے دھوکہ دے سکتے ہو کہ یہ حقیقت نہیں، خواب ہے۔ عقل بھی دھوکہ دے سکتی ہے۔ کہ یہ سب کچھ سراب ہے لیکن میرا دل مجھے کیونکر دھوکہ دے سکتا ہے۔ وہ مرچکا ہے۔ ایک حقیقی موت اُس پر طاری ہوچکی ہے اور اَب مَیں بھی مَرنا چاہتا ہوں۔"[1]

"جھانسی کی رانی" فلپس کاکس کا لکھا ہوا تین ایکٹ کا ایک خوب صورت، مؤثر اور تاریخی ڈرامہ ہے۔ جس کا ترجمہ نگار میں جولائی ۱۹۳۵ء سے لے کر نومبر تک مسلسل شائع ہوا "جھانسی کی رانی" ایک روایت و تمسیح بن چکی ہے۔ مرہٹوں کی تاریخ میں جھانسی کی رانی کو بہت اہمیت حاصل ہے جس نے انگریزوں کے خلاف جرأت وہمت سے کام لے کر اپنے آپ کو وطن پر قربان کردیا اِس ڈرامے سے نہ صرف ۱۸۵۷ء کے اُن واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا باعث ہوئے بلکہ راجاؤں کے اُن اندرونی حالات واختلافات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو ملک کو انگریز کے ہاتھ میں دے دینے کا سب سے بڑا سبب تھے۔ یہ ڈرامہ چونکہ برطانوی مصنّف کا لکھا ہوا ہے اور یقیناً بعض باتیں ایسی ہیں جو برطانوی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ اِس کا آخری منظر جس میں رانی کی زندگی کے آخری لمحات کا تذکرہ ہے خصوصیت سے قابلِ مطالعہ ہے نیاز، رانی کی جرأت وہمت اور فلپس کاکس کی حقیقت پسندی سے بہت متاثر ہوئے چنانچہ نیاز نے اپنے قلم کی روانی سے اِس میں وہ جوش وخروش بھر دیا ہے کہ جیسے خالق وہ خود ہیں، اور کوشش یہ کی ہے کہ بہتر سے بہتر لفظ لائیں اور اپنی اِس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے اِن

[1] "اصحابِ کہف" ص ۱۰۳، ادارہ فروغ اُردو لاہور

کے وہ حصّے جو زیادہ تر تاریخی ہیں۔ نیاز وہاں ایک حقیقت پسند مؤرخ کی طرح، صرف واقعات کی صداقت کو سامنے رکھتے ہوئے، سیدھے سادے لفظوں میں ترجمہ کردیتے ہیں۔ بلکہ بجنسہٖ لفظی ترجمہ ہے۔ مگر وہ حصّے جو شدید جذباتی کیفیات کو ظاہر کرتے ہیں وہاں نیاز کا رُومانی جذباتی حسّاس قلم فن کدۂ حیات میں چراغ سے چراغ اور خیال سے خیال روشن کرتا ہے۔ لفظوں کی اِس تابناکی میں لفظ وخیالات نیاز کے ذاتی محسوس ہوتے ہیں حالانکہ یہ محض اُن کی چابک دستی اور ہنرمندی ہے۔ اُن کی اِنشا پردازی نے ہرجگہ اُن کا پورا پورا ساتھ دیا ہے۔

ادب وشعر سے ہٹ کر نیاز نے سیاسی، تاریخی اور مذہب سے متعلق کتابوں کے تراجم بھی کئے ہیں، اِس کی اہم ترین مثال "مسئلۂ شرقیہ" ہے۔ جو مصطفےٰ کمال پاشا کی تصنیف "المسئلۃ الشرقیہ" کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۹۸ء میں لکھی گئی۔ اِس کا موضوع تاریخ وسیاست ہے۔ یُونان اور حکومت عثمانیہ کے اختلافی مسائل، بڑی حکومتوں مثلاً روس، فرانس، انگلستان، اسٹریا، اور جرمنی کے شدید اختلافات اور پھر جنگ میں اُن کے اہم کردار کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ "مسئلۂ شرقیہ" دراصل اُس جنگ کی تاریخ ہے جو یونان اور ترکی کے درمیان ہوئی۔ اور بالآخر حکومتِ عثمانیہ کو فتح یابی ہوئی تاریخ اور سیاست سے متعلق کتابوں کے تراجم میں ایک آسانی یہ ہوتی ہے کہ زبان وبیان کی نزاکتوں اور لطافتوں سے الگ تاریخی حقائق کی طرف زیادہ توجہ کرنا پڑتی ہے۔ لب ولہجہ، الفاظ کی تاثیر کی اِتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی اِس کے فکری پہلو، نفسِ مضمون کی اور سب سے بڑھ کر منطقی ابلاغ کی ہوتی ہے۔ اِنشا پردازی اور لفظوں کے گورکھ دھندے سے ہٹ کر سادہ عام فہم طرزِ بیان اختیار کیا جاتا ہے، تاکہ عام قاری مسئلے کو پوری طرح سمجھ سکے۔ اور حقائق سے آگاہی حاصل کرسکے۔ نیاز اِس اُصول پر کاربند رہے ہیں۔ ترکی اور مصطفےٰ کمال پاشا سے برِصغیر کے مسلمانوں کو بہت عقیدت ومحبت تھی۔ ہر بڑے شاعر وادیب نے اِس عقیدت ومحبت اور حکومتِ عثمانیہ سے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ نیاز چاہتے تھے کہ اِس اہم ترین تاریخی مسئلہ کی گہرائیاں عام لوگوں تک بھی پہنچ جائیں۔ چنانچہ انہیں اِس سے بہتر اور کوئی طریقہ نظر نہ آیا کہ وہ "المسئلۃ الشرقیہ"

کو اُردو میں منتقل کر دیں۔ یہاں اُن کا اندازِ بیان رومانیت پسند فن کار کا نہیں بلکہ ایک عالم اور حقیقت پسند مؤرخ کا ہے۔ انہوں نے لُغت سے بھرپور استفادہ کیا ہے جو ایک اچھے مترجم کی بُنیادی صفت ہے۔ حاشیے میں نامانوس الفاظ اور اصطلاحات کے لئے انگریزی میں مستعمل الفاظ بھی دیئے ہیں تاکہ بات، پوری طرح قاری تک پہنچ سکے۔ بطورِ مثال صرف ایک اقتباس دیکھئے اس سے ترجمے کی زبان و بیان کا اندازہ ہو سکے گا:۔

"یورپ کے بہت سے رجالِ سیاست اور اربابِ قلم نے اِس حقیقت کو محسوس کیا ہے کہ حکومتِ علیہ کا بقاء توازنِ عمومی کے لئے لازمی ہے۔ اور یہ کہ اِس کا زوال بڑے بڑے خطرات کا باعث ہو گا۔ اور اِس سے ایسے شعلے بھڑکیں گے جن کی لپٹیں تمام اقطاعِ ارض کو شرقاً غرباً اور شمالاً جنوباً گھیر لیں گی اور اِس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ جو اسلام کا عَلم اُٹھائے ہوئے ہے اگر اِس کو مٹا دیا گیا تو مسلمانوں میں ایک عام بغاوت پیدا ہو جائے گی۔ اور اِس سے ایسی خُون ریز لڑائیاں جاری ہوں گی جن کے مقابلہ میں پچھلے حروبِ صلیبیہ کا تماشہ بچّوں کی لڑائی سے زیادہ نہ رہے گا۔"[1]

نیاز کے بے قاعدہ تراجم میں "محمد قاسم سے حملۂ بابر تک" "صحابیات" اور "ترغیباتِ جنسی یا شہوانیات" شامل ہیں۔ نیاز نے انہیں باقاعدہ طور پر تو دوسری زبانوں سے اُردو میں منتقل نہیں کیا یعنی اِن کا مواد نیاز کے ذہن و فکر کا تراشیدہ نہیں ہے بلکہ یہ دوسری کتابوں سے ماخوذ و مستفیض ہے۔

"محمد قاسم سے حملۂ بابر تک" خالصتاً تاریخی کتاب ہے۔ جو ۹۲ھ/۷۱۱ء، محمد قاسم کے حملۂ سندھ سے شروع ہوتی ہے۔ سلاطینِ دہلی، سندھ میں مسلمانوں کی حکومت، عروج و زوال، خاندانِ غزنوی

---

[1]: "مسئلۂ شرقیہ" ص ۲، سلسلۂ مطبوعات صوفی نمبر: ۲، صوفی پرنٹنگ منڈی بہاؤالدین

خاندانِ غوری، خاندانِ غلاماں، خاندانِ تغلق، اودھی حکومت اور اُن کے عہد کی فتوحات و ناکامیوں پر مشتمل ہے۔ نیاز نے اس کتاب کے سلسلے میں کم و بیش ایک سو عربی، فارسی اور انگریزی میں لکھی جانے والی تاریخوں سے استفادہ کیا ہے۔ اِس سلسلے میں اہم ترین "آئینِ اکبری" "آثار الصنادید" "تاریخ آلِ سبکتگین" "تاریخ ناصری" "تاریخ فیروز شاہی" "تزکِ تیموری" "چہار مقالہ" "طبقاتِ اکبری" "طبقاتِ ناصری" "تاریخِ کامل" اور "فتوحاتِ فیروز شاہی" شامل ہیں۔ تاریخی کتب اکثر ماخوذ ہی ہوتی ہیں اور مؤرخ پہلے سے موجود تاریخوں سے استفادہ کرتے ہوئے منطقی و استدلالی فیصلے دیتا ہے۔ "محمد قاسم سے حملۂ بابر تک" کو ترجمے کے ضمن میں اِس لئے شامل کیا گیا ہے کہ نیاز نے اکثر واقعات عربی، فارسی، اور انگریزی تاریخوں سے ترجمہ کر دیئے ہیں۔ اِس کتاب کی اہم ترین خوبی اِس کی جامعیت ہے۔ نہایت اختصار سے تاریخ کی اہم ترین سچائیاں بے باکی سے منتقل ہو گئی ہیں۔

نیاز نے گو تاریخ کے بنیادی واقعات اہم تاریخی کتب سے لیے ہیں لیکن طرزِ بیان اور انداز اُن کا اپنا ہے۔ ایک خاص محققانہ انداز ملتا ہے جس کے تحت تاریخی صداقتوں کی چھان پھٹک بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ کی گئی ہے۔ نیاز نے مختلف فرمانرواؤں کے شجرہ ہائے نسب مختلف تاریخی نقشے بھی پیش کئے ہیں۔ حواشی کے مندرجات بھی حوالوں کے ساتھ ہیں اور نہایت کارآمد ہیں۔ نیاز نے ذاتی تبصرہ کا خاص انداز اختیار کرتے ہوئے اہم منطقی نتائج نکالے ہیں جن پر غور و فکر کرنا ضروری ہو جاتا ہے نمونے کے طور پر چند سطریں دیکھئے:۔

"یورپ جسے اپنی تہذیب و شائستگی پر اِس قدر ناز ہے اور جو مشرقی فرمانرواؤں کو جور و ظلم کا مجسمہ قرار دینے میں ذرا باک نہیں کرتا۔ کیا وہ اپنے عہدِ تہذیب و شائستگی کی کوئی ایسی مثال پیش کر سکتا ہے جس میں اس قدر رواداری سے کام لیا گیا ہو۔ جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان میں جو مظالم عورتوں اور بچّوں پر کئے گئے، اُن کا مقابلہ کرنا چاہیئے، شہاب الدین محمد غوری کی جنگ بنارس سے جس میں ایک عورت اور ایک بچہ ہلاک نہیں کیا گیا۔"

"صحابیات" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواجِ مطہرات، بنات طیبات اور اُن مقدس خواتین اسلام کا تذکرہ ہے جنہوں نے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جن کی زندگیاں ہر مسلم خاتون کے لئے قابلِ تقلید اور شمعِ ہدایت ہیں۔ نیاز کا کہنا ہے کہ ہمارے تمدن میں مسئلہ نسائیات اب اس قدر اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ پر اُس وقت تک مکمل بحث نہیں ہو سکتی جب تک خدا کی اس نازک مخلوق کا ذکر نہ کیا جائے کیونکہ معاشرہ کا کوئی پہلو عورت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ عورت کو ہمیشہ حقیر و کمتر سمجھا گیا۔ اسلام نے سب سے پہلے اس کی روحانیت کی طرف متوجہ کرایا اور اُسے بہت سے حقوق سے نوازا۔

"یوں تو کائنات کا ہر ذرہ انوارِ الٰہی کا مظہر ہے لیکن روحانیت قبول کرنے کے لئے عورت جس قدر موزوں پیدا کی گئی ہے ویسی کوئی دوسری مخلوق نہیں چنانچہ اسلام نے سب سے پہلے عورت کو جس طرف متوجہ کیا وہ اُس کی روحانیت ہی تھی۔"[1]

اسی روحانیت کو واضح کرنے کے لئے نیاز نے "صحابیات" مرتب کی۔ نیاز کوئی بات تحقیق کئے بغیر نہیں کہتے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سینکڑوں کتابوں سے استفادہ کیا۔ ان میں صحیح بخاری، طبقات، اسد الغابہ، ابوداؤد کتاب الادب، صحیح مسلم کتاب النکاح، موطائے امام مالک، مسند ابن حنبل، سنن نسائی، طبری، سیرت ابن ہشام اور دار المنثور شامل ہیں۔ اصولِ حدیث کا طریق کار یہ رہا ہے کہ واقعات کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ احتیاط اس لئے برتی جاتی ہے کہ واقعات میں کسی قسم کی غلطی کا احتمال نہ رہے۔ اور اصل راوی تک حدیث اپنے اصل متن کے ساتھ پہنچے چنانچہ نیاز نے بھی طریق کار اپنایا۔ اور عربی کتابوں سے واقعات کو ہوبہو ترجمہ کر دیا ہے لیکن محض پرستش

---

[1] "صحابیات" ص ۔۔ طبع اول اکتوبر ۱۹۵۸ء نفیس اکیڈمی کراچی

اختیار نہیں کیا بلکہ جو واقعہ بیان کیا ہے اُسے صداقت کی کسوٹی پر پرکھ کر صحت سے بیان کیا ہے اور جن کی تاریخ وفات یا دوسری معلومات ثبت تھیں یا مستند تھیں ان کا اضافہ حواشی کی صورت میں کیا ہے۔ حضرت فاطمہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت اُمِ سلمہؓ، حضرت خنساؓ اور حضرت سمیہؓ کے حالات خاص طور پر بہت مؤثر انداز میں بیان کئے ہیں جن سے نہ صرف مسلم خواتین بلکہ دُنیا بھر کی خواتین صالح اقدار کی تحصیل حاصل کر سکتی ہیں۔

"ترغیبات جنسی" یا "شہوانیات" ہیولاک ایلس کی کتاب جو ۳۰ سال میں لکھی گئی اور ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ کی تلخیص کہی جا سکتی ہے۔ یہ ہی کتاب ہے جس میں جنسیات پر نہ صرف تحقیقی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں ایک صحت مند اور مثبت نقطۂ نظر ملتا ہے۔ یہ مختلف انگریزی کتابوں سے ماخوذ ہے اس لئے اس میں نیاز کے اُسلوب کی جھلک مفقود ہے۔ اس کی اہمیت یوں ہے کہ جنس کے موضوع پر ایسی علمی تصنیف اس سے پہلے پیش نہیں کی گئی۔ طبع زاد نہیں لیکن اپنی مفید معلومات کی بنا پر قدر اور دلچسپی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

مختلف علوم و فنون خصوصاً مشرقیات سے متعلق تاریخ اور ادبیات پر مشتمل مضامین و کتب کو اُردو میں منتقل کرنے کا ذوق و شوق نیاز کو آخری عمر تک رہا۔ ۱۹۶۲ء میں پاکستان آجانے کے بعد انہوں نے قومی عجائب گھر کراچی کے کتب خانے میں عربی و فارسی کے جو مخطوطات موجود تھے اُن کا انگریزی میں ضروری معلومات کے ساتھ کیٹلاگ تیار کیا۔ یہ قدیم مخطوطے اس نوعیت کے ہیں کہ مولانا نیاز جیسا عربی، فارسی اور انگریزی پر یکساں دسترس رکھنے والا عالم ہی قلم اٹھا سکتا تھا۔ ان مخطوطات کا مفصل ٹائپ شدہ کیٹلاگ بہ زبان انگریزی قومی عجائب گھر کراچی کے کتب خانے میں ہنوز غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔

مولانا نیاز فتح پوری نے کراچی میں زندگی کے آخری دور میں اس سے بھی اہم تر کام یہ کیا کہ تھامس ولیم بیل کی مشہور کتاب An Oriental Biographical Dictionary کا اُردو ترجمہ کیا۔ یہ کتاب کم و بیش پانچ ہزار افراد کے مختصر حالات پر مبنی ہے۔ اور برِصغیر پاک و ہند

کی علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ابتداً ۱۸۹۴ء میں چھپی تھی اور باریک ٹائپ میں چار سو اکتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۱ء میں سندھ ساگر اکیڈمی سے دوبارہ شائع ہوئی۔ اور شاید جلد ہی فروخت ہوگئی کہ ۱۹۷۵ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن سامنے آیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب کتنی اہم ہے لیکن اُردو والوں کی نظر سے ہنوز اوجھل تھی۔ نیاز اگست ۱۹۶۲ء کے اوائل میں پاکستان آئے تھے اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو اس دشوار کام کو مکمل کر لیا تھا۔ گویا ایک سال کے اندر یہ ضخیم کتاب مع مقدمہ اُردو میں منتقل ہوگئی۔ یہ بات یوں بھی جا رہی ہے کہ اس کے دیباچہ کے آخر میں یوم جمعہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۳ء کی تاریخ دی ہوئی ہے۔

اس کتاب میں بہت سے ایسے شاعروں، ادیبوں، عالموں، آرٹسٹوں، امیروں، وزیروں اور بادشاہوں کا ذکر ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طور پر علم و ادب سے رہا۔ ان افراد میں مسلم و غیر مسلم مرد و خواتین دونوں قسم کے مصنفین و مترجمین شامل ہیں۔ مولانا نے اُردو ترجمے میں ایک مختصر سا دیباچہ بھی لکھا جس میں اصل کتاب، مصنف اور کتاب کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔ اور یہ بھی بتایا کہ اُنہوں نے اس کا ترجمہ کیوں کیا کہ اُنہیں تاریخ اور تاریخِ اسلام، تذکرہ اور تذکرہ نگاروں کے موضوعات سے خاص دلچسپی تھی۔ یہ مقدمہ مجھے نگار پاکستان مئی جون ۱۹۶۷ء کے مشترک خصوصی شمارے میں دیکھنے کو ملا۔

یہ کتاب ایک ایسے انگریز مصنف کی مرتب کردہ ہے جو برِ عظیم میں، خاص طور پر پاکستان کے کے علاقے میں ایک مدت تک رہا ہے اور اُس نے اپنی کتاب کے لئے مواد ذاتی کوششوں اور مستند ماخذوں کے ذریعے یکجا کیا ہے۔ کتاب میں ہر مصنف کے بارے میں اگرچہ بیانات مختصر ہیں جیسا کہ Biographical Dictionary کا فنی تقاضا ہے لیکن اہم اور ضروری باتیں جو کسی قدیم مصنف کے سلسلے میں لازمی ہو جاتی ہیں مثلاً اصل نام، ولدیت، سکونت، منصب تلمذ، سن ولادت، سن وفات، تصنیفات و تالیفات، اور دوسرے اہم کارناموں کا تذکرہ ملتا ہے، اور بہت سے ایسے افراد کے بارے میں معلومات ملتی ہیں جن کا ذکر برِ عظیم کی کسی

دوسری کتاب یا تذکرہ میں نہیں ملتا۔ اصل کتاب انگریزی حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے۔ مثلاً "ق" اور "ع" سے شروع ہونے والے سارے مصنفین کے ترجمے ایک ساتھ شروع ہی میں کر دیئے ہیں۔ اور "ذ" "ز" "ض" "ظ" سے شروع ہونے والے انگریزی حروف "جے" کے تحت درج کیے ہیں۔ نیاز نے اپنے اُردو ترجمے میں ناموں کو اُردو ردیف وار میں مرتب کیا ہے اور ناموں کے صحیح املا کے ساتھ افراد کو مناسب مقامات پر جگہ دی ہے۔ مولانا نے اس کتاب کو کس انداز میں ترجمہ کیا ہے بطور نمونہ "ق" اور "ے" کی ردیف کے چند ترجمے اصل کے ساتھ ملاحظہ ہوں:-

اُردو	انگریزی
آزاد بلگرامی : مدنپور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۷۸۴ء میں وفات پائی۔ مشہور مؤرخ تھے۔ "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" اُنہیں کی مقبول تصنیف ہے۔	Azad Bilgrami born in India Madanpur, and died in 1784 A . D. Famous Historian. Excellent History book is "Sizan - ul- Marjan Fi Asar India"
انوری :- اسد الدین۔ مشہور فارسی شاعر پہلے خاوری تخلص اختیار کیا۔ اور پھر انوری، وہ خراسان کا ملک الشعراء کہلاتا تھا۔ سنجر سلجوقی کا محبوب شاعر تھا۔ اس کا حریف رشید وطواط تھا جو اتسیز شاہ خوارزم کے دربار کا شاعر تھا۔ جب دونوں ملکوں میں جنگ ہوئی تو یہ دونوں اپنی اپنی نظمیں تیروں میں باندھ کر قلعہ کے اندر باہر پھینکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ نجومی بھی تھا	A famous persian poet surnamed Ashad-ddin. He formerly took for his patical name "Khafwari" from the superiority of his poetical talents he was called the King of the poets of Khurasan, was the favourite of sultan Sanjar Saljuki and the rival of the Pat Rashidi

Surnamed Watwat who espoused the cause of Atsiz the Sultan of Khurasan, whilst the two princes were engaged in war, the two poets assalied one another by shymes sent on the point of arrows. He is also said to have been the greatest astronomer of his age

ایک بار اُس نے ستاروں کی گردش کا حساب لگا کر پیش گوئی کی کہ فلاں وقت سخت طوفان آئے گا۔ جو پوری نہ ہوئی۔ اور وہ بلخ بھاگ گیا۔ جہاں بزمانۂ سلطان علاؤالدین تکش وفات پاگیا۔ (۵۹۱ھ/۱۲۰۰ء) خلاصۃ الاشعار میں سنِ وفات ۵۸۶ھ درج ہے بعض نے ۵۹۲ھ لکھا ہے۔

Yaqin the poetical name of Ina am-Ullah Khan, an urdu poet who has left a Diwan. He was the Son of Azhar uddin Khan Bahadur Mubarak jng, a grand son of the Mujaddid Alif Sani and a pupil of Mirza Janjanan Mazhar who, was so fond of him. He was Killed at the age of 25 Years in the time of Ahmed Shah by his own father because he brought disgrace on his family.

یقین

تخلص انعام اللہ کا (اُردو شاعر) صاحبِ دیوان۔ یہ اظہرالدین خان بہادر مبارک جنگ کا بیٹا مجدد الف ثانی کا پوتا۔ شاگرد میرزا مظہر جانجاناں۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یقین کے عاشق تھے۔ یقین کو خود ان کے باپ نے کسی نازیبا حرکت پر قتل کر دیا جب کہ ان کی عمر صرف ۲۵ سال کی تھی (عہد احمد شاہ)

Ya,qub Beg the son of Uzzan Hasan became the King of the Turkman tribes Called Aqqoinlu, or the white sheep. After his death he was succeeded by his son Alwand Beg, who was defeated about the Year A. D 1500 A. H. 996 by Shah Isma'il Safwi.

یعقوب بیگ

(پسر اوزون حسین) باپ کے بعد قیوتلو ترکمانی ممالک کا فرمانروا۔ (۸۹۲ھ/۱۴۷۷ء) اس کے بعد الوند بیگ (اس کا بھائی) تخت نشین ہوا جسے شاہ اسماعیل صفوی نے شکست دی۔ (۹۹۶/۱۵۰۰)

اس ترجمہ کا اصل مخطوطہ قومی عجائب گھر کراچی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اور اس کی ایک مکمل نقل ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے پاس ہے۔ یہ کتاب نہایت اہم معلومات پر مشتمل ہے لہٰذا اُردو میں فوراً شائع ہونی چاہیئے۔

ان تراجم کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیاز ایک کامیاب مترجم بھی ہیں۔ اس کی وجہ اُن کا مختلف زبانوں پر کامل عبور رکھنا ہے۔ لفظی ترجمہ کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے اپنی فنکارانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے اس لئے اُن کے اُسلوب نے ترجمے کے فن کو اِس کے دائرے سے بڑھاتے ہوئے اصل کا حُسن و دلکشی عطا کی ہے۔

باب

مقالہ نگاری

انسان اپنی ذات میں اِک جہان ہے، مکمل جہان، جس میں بلند پہاڑ، گھنے جنگل، اتھاہ گہرے سمندر، خشک و چٹیل میدان، برستے گرجتے بادل، طویل سراب صحرا، غرض کیا کچھ نہیں ہے مگر انسان اپنی زندگی عموماً دبیز نقابوں کی نذر کر دیتا ہے۔ حالانکہ انسان اور اُس کی زندگی دونوں برق رفتاری سے کسی انجانی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ قدم قدم پر تغیرات و انقلابات حیرت زدہ کر دیتے ہیں، لیکن وقت کے توہمات سے بغاوت کئے بغیر زندگی کی تاریخ کبھی آگے نہیں بڑھتی۔ تاریخ سماج کی اُن تبدیلیوں کا نام ہے جنہیں فن کار و دانش ور جنم دیتے ہیں اور اُن کے ذریعے وہ کرۂ ارض کی تہذیبی زندگی کو آگے لے جانا چاہتے ہیں دراصل زندگی کی یہی تبدیلیاں ادب و فن میں منعکس ہوتی ہیں اور یوں تہذیبی ارتقاء کا یہ سفر اپنی تکمیل کی منزل کی سمت جاری رہتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا یہی ذوقِ سفر ادیب و فنکار کے ذہن و تخیل کو نئے نئے پیراہن عطا کرتا ہے۔ انہی نئے رجحانات میں ایک کا نام "مضمون نگاری" ہے۔ جس کا رواج ہمارے یہاں ایک صنفِ ادب کی حیثیت سے پورے سو سال پہلے مغربی ادب کے زیرِ اثر ہوا۔

"ESSAY" فرانسیسی لفظ "ESSAI" سے نکلا ہے جس کے معنی کوشش، سعی یا ATTEMPT کے ہیں۔ چونکہ اس میں کسی موضوع کو منتخب کرکے ایک خاص نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جاتی ہے اس لیے اس کو "ESSAY" کہا جاتا ہے۔ "مضمون" عربی زبان کا لفظ ہے۔ لغوی اعتبار سے یہ "معنی" یا "مطالب" کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اصطلاحِ ادب میں مضمون نثر کی وہ صنف ہے جو مختصر ہوتے ہوئے کسی ادبی، فلسفیانہ، معاشرتی و سماجی موضوع پر شخصی یا تاریخی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالے یعنی مضمون نگار وہ مختصر فن پارہ ہے جو ہمیں کسی سوچ، کسی طرزِ فکر، کسی اُفتادِ ذہنی، کسی مسئلے کی طرف دیکھنے، گہرائی سے مشاہدہ کرنے، اور اس سے نتیجہ استخراج کرنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ مان تان MONTAIGEN نے ۱۵۸۰ء میں "اسائز" "EASSAIS" شائع کرکے ادبی دُنیا کی توجہ ایک نئے نثری سانچے کی طرف مبذول کی۔ اپنی تحریروں میں اُس نے ایک ادیب کے احساسات کو بطور انسان کے پیش کیا ہے۔ حقیقت میں مضمون کسی خاص موضوع سے متعلق لکھنے والے کے جذبات، احساسات اور خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ ترجمانی تفکر بھی رکھتی ہے اور خیالات کی رعنائی بھی۔ اس میں اُسلوب کا نکھار بھی ہوتا ہے اور تاثرات کی دل فریبی بھی۔ یہ عرفان و آگہی کا ذوق بھی دیتا ہے اور انبساط و مسرت بھی بخشتا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کا خیال بالکل درست ہے کہ:

"ایسے ہمارے ذہن کو ایک خاص ذوقِ آگہی بخشتا اور ہمارے جذبات میں انبساط پروتازگی اور تابناکی پیدا کرتا ہے۔ چاہے اس کا موضوع "آرائشِ خمِ کاکل" اور "اندیشہ ہائے دور دراز" کی قبیل کا ہو یا "مشاہدہ حق" کی گفتگو اور "بادہ و ساغر" کی نوعیت کا۔"[1]

بہرحال موضوع کے اعتبار سے مضمون کی صنف بے پناہ وسعتوں کی حامل ہے اور اس میں ذرّوں سے لے کر ستاروں تک کی دُنیا کے تمام موضوعات سما سکتے ہیں۔ مضمون کا مقصد ہمیشہ انسانی خیالات و

جذبات کا اظہار رہا ہے۔ چنانچہ یہ صنفِ ادب کبھی ذہنی و سماجی بیداری کے لئے استعمال ہوئی، کبھی انسانی جذبات کی رنگین تصویر کشی کے لیے، کبھی طنز و مزاح کے شوخ پھول کھلانے اور کبھی سنجیدہ و انقلابی افکار کو انگیز کرنے کے لئے۔

اردو میں "مضمون"، "مقالہ" اور "انشائیہ" کو بے احتیاطی سے عام طور پر ایک ہی معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان میں واضح فرق ہے۔ انشائیہ ہلکا پھلکا، پُر لطف، شگفتہ مضمون ہے جو تفریح و مسرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ "مقالہ" طویل و بسیط مضمون ہے جس میں کسی موضوع پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔ استدلال و گہرائی کی وجہ سے یہ مضمون سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ "مضمون" مقالے کی ابتدائی صورت ہے اور اس میں ضروری نہیں کہ جو خیال، سوچ، فکر، جذبہ یا احساس پیش کیا جا رہا ہے وہ مستقل یا مکمل شکل میں ہو۔ بلکہ زندگی کا کوئی خاص رُخ یا کوئی خاص پہلو ماحول سے منقطع کر کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ضروری نہیں کہ مضمون نگار کوئی حتمی نتیجہ یا فیصلہ پیش کرے۔ بلکہ قارئین کے علم و فکر پہ اعتماد کرتے ہوئے نتیجہ یا فیصلہ اُن کے سپرد کر سکتا ہے۔ "مقالہ" مضمون کی ارتقائی شکل ہے، اس میں مطلوبہ موضوع سے متعلق مکمل مواد اور تمام اہم معلومات کا تجزیہ بعد ازاں نتیجہ یا فیصلہ اخذ کرنا بھی ازبس ضروری ہے۔ "انشائیہ" "مضمون" اور "مقالہ" دونوں سے مختلف چیز ہے، اس میں ہلکے پھلکے، مزاحیہ و طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کمزور و منفی اقدار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ مقصد قاری کو محظوظ کرنا بھی ہوتا ہے اور خوشگوار فضا میں اصلاحی و سنجیدہ مقصد بھی پنہاں ہوتا ہے۔ گویا انشائیہ نگار کونین کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے۔ واکر نے اپنی کتاب "ESSAY AND ESSAYISTS" میں "مضمون" و "مقالے" کو باقاعدہ "مضمون" کا نام دیا ہے۔ انشائیہ میں وہ اعلیٰ سنجیدگی جو مضمون یا مقالے کا حصہ ہے، نہیں ہوتی۔ مضمون یا مقالے میں عام طور پر ایسے موضوعات کو پیش کیا جاتا ہے جو اجتماعیت کے حامل ہوں۔ مگر انشائیہ نگار خالصتاً ذاتی و انفرادی مسئلہ کو بھی پیش کر سکتا ہے۔ مضمون، مقالہ اور انشائیہ کے فرق کے سلسلہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب ان میں خلط مبحث کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ باایں ہمہ

بہت سے اہلِ قلم، ہنوز ان الفاظ کے استعمال میں احتیاط سے کام نہیں لیتے اور مضمون، مقالہ اور انشائیہ تینوں کو ایک ہی زُمرے میں رکھ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے "اردو مضمون کے ارتقاء" میں انشائیہ، مضمون اور مقالہ کو ایک ہی انداز میں پیش کیے، فرحت، رشید، زبون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، اور سنجیدہ لکھنے والے سرسید، حالی، شبلی، محسن الملک، وقار الملک کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

مضمون کا تعلق ادبیات قوت لئے ذہنی LITERATURE OF POWER سے ہے یعنی وہ معلومات بھی فراہم کرتا ہے اور یہ معلومات قوی، مؤثر اور نتیجہ خیز بھی ہوتی ہیں۔ بعض نقادوں نے جن میں جان ڈرنک واٹر بھی شامل ہیں، مضمون کو اعلیٰ درجے کی شاعری یا غنائی نظم سے بھی تشبیہ دی ہے۔ مضمون نگار کچھ بھی ہو وہ ہمارا دوست اور لفظوں کا فنکار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مضمون کی تمام تر افادیت اس کی سنجیدگی اور اختصار میں ہی پنہاں ہے۔ ایڈمنڈ گاس مضمون کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"مضمون عموماً ایک درمیانی طوالت کی نثری تحریر ہے جو ایک آسان اور سرسری انداز میں ایک موضوع سے صرف اُسی حد تک عہدہ برآ ہوتی ہے جس حد تک مصنف کی ذات اس سے متاثر ہوتی ہے"[1]

بغور دیکھا جائے تو اس جامع تعریف میں مضمون کے تمام تر فنی لوازم آ گئے ہیں۔ اوّل یہ کہ مضمون مختصر لکھا جائے، اس کے اختصار ہی میں اس کا حُسن ہے۔ مضمون نگار کے لئے ضروری نہیں کہ وہ متعلقہ موضوعات کے تمام پہلوؤں کی وضاحت و تشریح کرے، وہ اشارے دیتا ہوا گزر سکتا ہے۔ یہ بھی لازم نہیں کہ وہ خاص نتیجہ کی طرف لے جائے۔ قارئین اُس کے قلم اور لفظوں کے ساتھ ساتھ غور کرتے ہوئے اُس مقصد کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں جو مضمون نگار کے ذہن میں ہوتا ہے۔

ل۔ AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF LITERATURE

یعنی کبھی کبھی عدم تکمیل اور ناتمامیت میں بھی مضمون کا حُسن پوشیدہ ہے۔

دوسرے یہ کہ مضمون کا اندازِ بیاں بے تکلف و بے ساختہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ مقصد کا پورا پورا ابلاغ ہوسکے۔ یہ سادگی وسلاست خیالات میں بھی ہونی چاہیئے اور اُسلوبِ نگارش میں بھی۔ دلچسپی یُوں تو ہر صنفِ ادب کا بنیادی وصف ہے لیکن مضمون میں اِسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ مضمون لفظوں کا ایسا سحر وطلسم پیش کرتا ہے کہ یہ سحر انگیزی مضمون کے آخری لفظ پر ہی ختم ہوتی ہے۔ مضمون کو کارگر بنانے کے لیے مضمون نگار مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔ موضوع کی اہمیت، خیالات وجذبات کی نُدرت، اُسلوب کی دلکشی سے بھی وہ پڑھنے والوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتا ہے۔ چنانچہ شخصی میلانات وخیالات کا پیکر ہونے کے باوجود مضمون ذہنوں کو نئی بصیرت، شعور اور آگہی عطا کرتا ہے۔ موضوع کی انفرادیت اور مواد کی رنگا رنگی مضمون کے حُسن وافادیت میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

مضمون کا تعلق خارجی حالات وواقعات سے ہے۔ تاریخ، سیاست، مذہب، ثقافت ادب اور بدلتی زندگی کا رُخ اِس میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ مضمون نگار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اِن خارجی اور اجتماعی پہلوؤں کو اپنے ذاتی نقطۂ نظر سے دیکھے۔ مگر اس کے لئے اُس کا رویّہ انتہا پسندانہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ عقلی، حقیقی، علمی، عملی اور استدلالی ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو قبول کرسکیں۔ غصہ اور جُھنجلاہٹ کی فضا مضمون کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ مضمون نگار کا رویّہ فکری اور منطقی ہونا چاہیئے۔ اور اُسے متعلقہ موضوع سے متعلق پوری معلومات حاصل ہوں تاکہ علمیت کی گہری چھاپ، محققانہ انداز اور دلائل وبراہین قاری کو اپنی گرفت میں لے سکیں۔

گویا مضمون وہ صنفِ ادب ہے جو مختصر ہوتے ہوئے بھی لامتناہی وسعتیں رکھتی ہے۔ اِس میں تحقیق، تنقید، علم وفکر کی تجزیاتی گراں بار بحثوں کے باوصف، تخلیقی عمل کی وہ تمام قوتیں اور رعنائیاں موجود ہوتی ہیں جو جمود کو تحرک میں، پتھر کو پھول میں، اور بے نُوری کو نُور میں بدل دیتی ہیں۔
مضمون کی کئی قسمیں ہیں اور موضوع کے اعتبار سے اُنہیں متعدد خانوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

(۱) ادبی مضامین (۲) تنقیدی مضامین (۳) مذہبی مضامین (۴) سائنسی مضامین (۵) صحافتی مضامین
(۶) واقعاتی مضامین (سیاسی، سماجی، اخلاقی، فلسفیانہ)

مضمون نگاری کا آغاز سولہویں صدی میں اٹلی سے ہُوا۔ اِس کی ابتدائی شکل وہ درس وہ مواعظ تھے جو اتوار کو کلیسا میں دیئے جاتے تھے۔ اور بعد میں انہیں تحریری شکل میں پیش کردیا جاتا تھا۔ اس کو اوّلاً متعارف کرانے والا اطالوی ادیب مان تان MONTAIGEN تھا لیکن مضمون نے اپنے ارتقائی مراحل فرانس میں طے کیے۔ اور مونٹگنے کو موجودہ مضمون نگاری کا موجد مانا جاتا ہے۔ سنہ ۱۵۹۰ء میں مونٹگنے کے مضامین انگلستان میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے۔ اور اُن کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہوتا رہتا تھا۔ ان مضامین کا تعلق تقریباً تمام تر مسائلِ زندگی سے تھا۔ انگریزی میں سب سے پہلے اِس صنف کو فرانسس بیکن FRANCIS BACON نے اپنایا۔ بیکن کے مضامین کا پہلا مجموعہ سنہ ۱۵۹۷ء میں چھپا۔ اِس دوران میں وائیکونٹ سینٹ آلبینی VISCOUNT ALBANY اور بیرن آف ورولیم BARON OF VIRULAEM کا نام بھی مضمون نگاری کی صنف میں سامنے آتا ہے۔ اِن کے مضامین بھی گو اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کی طرزِ نگارش بیکن کی نسبت سادہ ہے۔ بیکن کا آخری مجموعۂ مضمون سنہ ۱۶۲۶ء میں چھپا۔ مگر طرز میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۔ سترھویں صدی میں مضمون نگاری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اِس دور میں ایک ہی نام سامنے آتا ہے۔ وہ نام ہے سر ولیم ٹیمپل کا۔ لیکن اُس کے مضامین کو مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ اٹھارہویں صدی میں "سپکٹیٹر" اور "ٹیٹلر" کی معرفت مضمون نگاری کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اِس صدی کو مضمون نگاری کی صدی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایڈیسن، اسٹیل اور سوئفٹ نے اپنی فطری، خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اِس صنف کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اِن کے مضامین میں بھرپور زندگی تڑپتی و مچلتی نظر آتی ہے۔ یہ لوگ ادیب و فن کار پہلے اور مصلح ومعلم بعد میں تھے۔ اُنہوں نے انگلستان کی معاشرتی، سماجی، مذہبی، ذاتی، اجتماعی، ادبی، تفریحی زندگی کو مکمل انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن یہ انداز، مزاح، طنز اور "تماشائی" کا سا ہے۔ کہ پڑھنے والے

پہلے محفوظ ہوں، اُن کے ذہنوں پہ خوشگوار اثرات مرتب ہوں، اُس کے بعد وہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کی اِصلاح کی طرف متوجہ ہوں، اُن کا نصب العین مقصدی، اِصلاحی رہی ہے لیکن اُنہوں نے مبلغ اور معلم بننا پسند نہیں کیا بلکہ فن اور فن کاری ہی اُن کے لئے باعثِ افتخار رہی ہے۔

اڈیسن وہ پہلا مضمون نگار ہے جس کے ہاں ایک واضح اور بے باک ذاتی نقطۂ نظر ملتا ہے وہ بیکن کی طرح معلمِ اخلاق نہیں بلکہ اپنے قاری کا ایک ہمدرد، مخلص و بے تکلف دوست اور رہنما ہے اڈیسن کے ہاں نفاست، بے تکلفی اور خلوص تو ہے مگر وہ جوش و خروش نہیں جو قارئین کو پرندوں کی طرح جال میں جکڑے۔ اسٹیل نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ اُس کے ہاں ایک خاص چمک ہے اور زندگی کی بھرپور گرم جوشی موجود ہے۔ سوفٹ کے ہاں وضاحت کا عنصر اور مزاح و طنز کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ گو کہیں کہیں طنز کی تلخی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اِسی زمانے میں جانسن، گولڈ سمتھ اور پوپ کے مضامین کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۷۹۸ء میں رُومانی تحریک کا آغاز LYRICAL BALLADS سے ہُوا۔ اِس تحریک کے زیرِ اثر جہاں ادب کی تمام اصناف نے چولا بدلا وہاں مضمون نگاری میں بھی ایک رُومانی تبدیلی رُونما ہوئی۔ اِسی زمانہ میں جو مضمون نگار اُفقِ ادب پر اُبھرے ان میں چارلس لیمب، لی ہنٹ، ولیم ہزلٹ، ڈی کوئنسی، ورڈزورتھ اور کولرج ہیں۔ ان کے مضامین انگریزی ادب کا شاہکار اور لازوال سرمایہ ہیں چارلس لیمب کے ہاں ایک خاص قسم کی نفاست، نزاکت، اور حقیقی احساس کی گہرائی ہے۔ اُس کی باتیں دل کی گہرائی سے نکل کر دل کی گہرائی میں جذب ہوتی ہیں۔ "انکشافِ ذات" خلوص اور انفرادیت کا وہ لافانی رویّہ جو چارلس لیمب کا حصہ ہے، ناقابلِ تقلید ہے اسی لئے اُس نے اپنے ہمعصروں پر گہرے اثرات نقش کئے۔ ولیم ہزلٹ کے مضامین میں خوبصورت اشارتی انداز موجود ہے۔ لیکن وہ معما گو نہیں اور نہ ہی قاری کو بھول بھلیوں میں اُلجھاتا ہے۔ بلکہ نازک اور لطیف نکتوں میں اپنا مقصد بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ کولرج اور ورڈزورتھ کے مضامین رُومانی اور جذباتیت کا مُنہ لئے ہیں۔ اِس کے علاوہ ناقد کا تجزیاتی انداز بھی موجود ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں انسانی زندگی سے گہری محبت

اور ہمدردی کا اِحساس ملتا ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخری دور میں کارلائل، نیومین، رسکن، اور آرنلڈ میکالے، کا نام مضمون نگاری کی صنف میں بہت نمایاں ہے۔ ان کے ہاں حد درجہ شگفتگی، اعتدال، توازن، تناسب، تکمیل اور گہری گرم جوشی ملتی ہے۔ بیسویں صدی میں اِس صنف کو اور بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ زندگی کی وسعتوں اور سماجی و معاشرتی مسائل کو پیش کرنے کا عام رواج پیدا ہُوا۔ چنانچہ ہڈسن، پریسٹلے، برنارڈ شا، گالزوردی اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اہم ترین مضمون نگاروں میں سے ہیں۔

اُردو میں مضمون نگاری کی صنف انگریزی سے ہی آئی ہے۔ انگریزی تسلط نے جہاں ہندوستان کی ثقافت و کلچر، تہذیب و تمدن کو متاثر کیا۔ وہاں ادب پر بھی ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے زندگی کی تبدیلیوں نے ادب میں بھی نئی جہتیں پیدا کیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے جہاں ہندوستان کو ایک تجارتی کمپنی کے رُوپ میں آنے والی قوم کا غلام بنا دیا، آزادی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بجھا دیا۔ وہاں مشرقی زندگی کو ایک نئی کروٹ لینے پر بھی مجبور کر دیا۔ اِس کروٹ نے خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہوئے مشرقی تہذیب و تفکر کے نظام کو بدل کر رکھ دیا۔ اِن اثرات نے معاشرتی، سماجی علمی اور ادبی زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالا، اور یہ نعرہ بلند کیا کہ ادب بے کاروں کا مشغلہ نہیں، یہ محض فرد کے دل کی سچی آواز، ذاتی تزکیۂ نفس یا کتھارسس Catharsis کے لئے نہیں اُٹھائی جاتی بلکہ قومی اجتماعی اِصلاح و ترقی کے لئے بھی اُٹھائی جاتی ہے۔ یہ ادب کی تقدیس کے سلسلے میں پہلی آواز تھی، جس کے تحت اُردو میں سوانح نگاری، ناول، افسانہ، تنقید، قومی شاعری اور مضمون نگاری کی اصناف وجود میں آئیں۔

اُردو ادب میں مضمون نگاری کی ترقی و ترویج کا سہرا سرسید احمد خاں اور اُن کے رفقا کے سر ہے یہ پودا اگرچہ دوسرے دیس کی بُو باس رکھتا ہے مگر اُن کے مالی سرسید نے اِس پودے کی تراش خراش اور اُسے دلکش و دلفریب بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دُنیا کے بڑے آدمیوں کی پہچان یہ بھی ہے کہ اپنے خیالات و استدلال، تفکر و تکلم کے گہرے اثرات دوسروں پر بھی چھوڑتے ہیں اور اپنے

جیسا جوش و خروش اُن میں بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ سرسیدؔ احمد خاں نے ادب کے اِصلاح و مقصد کی سنجیدگی اور تقدس کے لیے جو آواز بلند کی، اُس میں اُن کے رُفقا نے پورا پورا ساتھ دیا۔ اُن کے رُفقا میں الطاف حسین حالیؔ، شبلی نعمانی، نواب محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، سیّد محمود، مولوی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد شامل تھے۔ یوں "تہذیب الاخلاق" اور سرسید کے نامور رُفقا سے اُردو علم و ادب کی نشاۃِ ثانیہ کی ابتدا ہوئی۔ یہ عہد نثر کا عہدِ زریں ہے۔ اُنھوں نے قوم کو جینے کا حوصلہ دیا۔ قومیت کا تصور و تشخص پیدا کیا۔ مُردہ دِلوں میں زندگی کی رُوح پھونکی۔ زندگی کے ہر شعبہ کو نیا یا سنوارا۔ تعلیم، علم و ادب، زبان، سیاست، صحافت، مذہب، ثقافت، زبان و لسانیات سب کو جدید نقطۂ نظر سے دیکھا اور یہ تمام موضوعات اُس دَور کی مضمون نگاری کا اہم حصہ ہیں۔ سرسید احمد خاں جب ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے تو اُنھوں نے دیکھا کہ ایڈیسن اور اسٹیل کے "سپکٹیٹر" اور "ٹیٹلر" کی ادبی دُنیا میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ اِن کے مختصر مضامین میں انگلستان کی سوسائٹی کے کمزور پہلوؤں کو یوں اُجاگر کیا جاتا ہے کہ اربابِ ذوق کا حلقہ اُسے خوش دِلی سے قبول کرتا ہے اور اُنھیں اتنی مقبولیت حاصل ہے کہ لوگ ناشتے سے زیادہ "سپکٹیٹر" اور "ٹیٹلر" کے مضامین کو اہمیت دیتے ہیں۔ اُنھیں اس دَور کے انگلستان اور ہندوستانی معاشرہ میں خاصی مماثلت نظر آئی۔ چنانچہ وہ ایک عظیم الشان اِصلاحی مقصدی نصب العین اندھیر نگری میں دیئے جلانے اور دشت کی ویرانی کو پھولوں سے سجانے کا عزم لے کر وطن لوٹے۔ علی گڑھ تحریک کا مقصد ہی اصلاح و فلاح اور بدلتے ہوئے حالات کے تحت مسائل کا حل دریافت کرنا تھا بقول رشید احمد صدیقی:-

"قدیم اور جدید کے ناگہانی تصادم نے مسلمانوں کی قومی، ملکی اور تہذیبی زندگی میں طرح طرح کے جتنے پیچیدہ اور نازک مسائل پیدا کر دیئے تھے، اُن کا حل دریافت کرنا اور مسلمانوں کے لئے سلامتی اور سربلندی کا راستہ متعین کرنا۔"[1]

۱۔ علی گڑھ تحریک، مرتبہ نسیم قریشی ص ۳، مسلم پریس لکھنؤ ۱۹۶۰ء۔

سرسید ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت ہیں اور خلیل الرحمان اعظمی کے مطابق:-

"اُن کی بدولت اُردو زبان میں تاریخ، سیاست، مذہب، فلسفہ، انشائیہ، مکتوبات، افسانہ نگاری، تبصرہ نگاری، ادبی تنقید کا جو سرمایہ حاصل ہُوا۔ وہ اپنے مواد، اسلوب اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے ہمارے علمی، ادبی خزانے میں ایک نوعیت کا نیا اور منفرد اضافہ ہے۔"[1]

یوں تو جدید اُردو نثر کے اِس مردِ مجاہد کی عظیم الشان خدمات کا دائرہ بے حد وسیع ہے لیکن ادبی حیثیتوں میں سب سے نمایاں اور عظیم حیثیت مضمون نگاری و مقالہ نویسی کی ہے۔ اُنھیں اپنے دَور کا سب سے بڑا اور اعلیٰ مضمون نگار کہا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے بڑی محنت و کاوش، لیاقت و قابلیت اور تحقیق و تدقیق سے سینکڑوں مضامین و مقالے لکھے۔ ادب، سیاست، مذہب، تعلیم، تاریخ، معاشرت، سوانح، تنقید، صحافت، زندگی کا کوئی شعبہ اُن کے زورِ قلم کی جولانی سے نہیں بچا۔ اُنھوں نے نہ صرف مضمون نگاری کا اضافہ کیا بلکہ بے شمار مضامین لکھ کر اس صنف کو باقاعدہ رواج دیا۔ اُن کا کہنا تھا:-

"مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اُردو زبان میں نہ تھی۔ یہ اس زمانے میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی، جو اب حد سے زیادہ ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں سپکٹیٹر اور ٹیٹلر کی سی ہو جائیں گی۔"[2]

یہی روشن اور خوش آئند اُمیدوں کا پیغام، سرسید کا پیغام ہے۔ وہ سیاست، مذہب، سماج، معاشرت، تہذیب، ادب و زبان، زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمانوں کی اِصلاح و ترقی چاہتے تھے۔ "تہذیب الاخلاق

۱۔ نگار سرسید نمبر ۱۹۶۰ء ص ۲۶

۲۔ مقالات سرسید جلد دہم ص ۱۱۵، ۱۱۶، مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی طبع اول دسمبر ۱۹۶۲ء مجلس ترقی ادب لاہور۔

اس سلسلے میں ایک اہم و مؤثر کڑی ثابت ہُوا۔ نہ صرف ذہنی اصلاح و ترقی بلکہ اُس نے یہ بھی باور کرایا کہ اُردو زبان کم مایہ و کمتر نہیں بلکہ اس میں بہت وسعتیں اور گہرائیاں ہیں۔ اور اس میں ہر قسم کے مضامین و خیالات عمدگی، سادگی، سلیقہ اور حُسن سے ادا ہو سکتے ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" نے جتنے ہمہ گیر اثرات مرتب کئے وہ شاید کسی رسالے کا اب تک مقدّر نہیں بن سکے۔ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا کہنا ہے :-

"عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات "تہذیب الاخلاق" نے چھوڑے ہیں، ہندوستان برصغیر پاک و ہند کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے، اس رسالے کے اجراء سے موجودہ اُردو ادب کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اُردو نے اس رسالے بدولت اتنا فروغ پایا کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا۔ اُس دور کا کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جو "تہذیب الاخلاق" کے حلقۂ اثر سے متاثر نہ ہُوا ہو۔ دورِ جدید کے بلند معیار نے اس خوانِ نعمت سے لُقمے چُنے اور اسی حلقۂ اثر و نفوذ سے نقد و نظر کی نئی قدریں اور فکر و نظر کے نئے زاویے متعین ہوئے۔"[1]

سرسید نے کئی طرح کے مضامین لکھے۔ مثلاً خالص مذہبی و دینی مضامین، سیاسی مضامین، اصلاحی، تاریخی، سیاسی اور ادبی مضامین۔ یہ مضامین پورے اعتماد و یقین کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ان میں قوت، جوش، توانائی اور استدلال کا رنگ نمایاں ہے۔ تصنّع و بناوٹ ——— کی بجائے سادگی و خلوص ہے۔ وہی بات ہے جو دل میں ہے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ سرسید موجودہ مضمون نگاری کے بانی و امام ہیں بلاشبہ اُن کے مضامین اہم موضوعات اور سنجیدہ اُسلوب کی بنا پر اُردو کے

[1] پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ ص ۲۹۳ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ترجمہ ہلال زبیری کراچی یونیورسٹی شعبہ تصنیف و تالیف ۱۹۶۷ء

کلاسکس کہے جا سکتے ہیں۔

سرسید کے دستِ راست اور اُن کی تحریک کے سرگرم و مخلص رُکن مولانا الطاف حسین حالی نے یہاں جدید نقطۂ نظر کے تحت گرانقدر تصانیف پیش کیں، وہیں اُنہوں نے قوم کی دردمندی اور ہمدردی کے جذبہ سے سرشار ہو کر مذہب، اخلاق، تعلیمی، معاشرتی و سماجی اور سیاسی مضامین لکھ کر قوم کی اصلاح و ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔ حالی کے مضامین بحیثیت موضوع کے کئی خانوں میں رکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن بُنیادی طور پر ان کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی نصب العین تھا یعنی سرسید کے مقاصد کی تلقین، اور جدید نقطۂ نظر سے اُنہیں دوسروں کے لئے قابلِ توجہ بنانا۔ ان میں بعض مضامین علمی و ادبی اور سوانحی بھی ہیں لیکن زیادہ تر وہ قومی ہمدردی اور اخلاقیات ہی سے متعلق ہیں۔ سرسید کے بعد اگر کوئی قلم ہاتھ میں لے سکا ہے تو وہ حالی ہی ہیں جیسا کہ مہدی افادی کا قول ہے :-

"سرسید کے بعد اگر کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو وہ بوڑھے حالی ہیں۔ لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل، باتوں باتوں میں طے کر دیئے جائیں۔ یہ سلاست و نفاست، قدرتِ کلام کی آخری حد ہے جو سرسید کے بعد حالی کے حصے میں آئی ہے۔"[1]

مولانا شبلی نعمانی، سرسید تحریک کا روشن مینار دورِ جدید کے سب سے بڑے مؤرخ، منفرد انشاپرداز اعلیٰ درجے کے نقاد و مفکر ہیں۔ اُنہوں نے بے شمار مضامین و مقالات بھی لکھے ہیں۔ یہ مضامین آٹھ جلدوں میں اعظم گڑھ سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالات مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، تاریخی، فلسفیانہ اور اصلاحی و سیاسی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ شبلی کا بُنیادی مقصد اصلاحی تھا۔ وہ عالمانہ و محققانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ دلائل و استدلال پیش کرتے ہیں، لیکن قلم میں توازن و تناسب ہے اور اعتدال کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا ہے۔ جو بات کہتے ہیں بڑے وثوق اور اعتماد سے کہتے ہیں۔ سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ ہر

[1] افاداتِ مہدی۔ ص ۲۲۲، ۲۲۳، بار اوّل ۱۹۲۳ء سلطان بک ڈپو کالی کمان حیدر آباد دکن

جگہ موجود ہے۔ خواہ مخالفین کے اعتراضات کا جواب دے رہے ہوں یا اپنوں کے الزام کو رد کر رہے ہوں۔ شبلی کے ہاں قومی ہمدردی اور حُب الوطنی کا جذبہ ہر جگہ شدت سے کارفرما نظر آتا ہے ترکوں اور عربوں کی محبت سے اُن کا دل لبریز ہے۔ لیکن اپنے وطن کے لوگوں کے کارنامے بھی فخریہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اُنہوں نے معاشرت، ثقافت، تمدّن، عادات، اخلاق زبان سبھی موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کا کمال بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی [1]

"شبلی صرف ایک شاعر، ادیب، اِنشاپرداز، یا نقاد نہیں۔ وہ صرف ایک مضمون نگار اور مؤرخ بھی نہیں دراصل سرسیّد کے بعد وہ دوسرے آدمی ہیں جنہیں عالم کہا جا سکتا ہے [2]۔"

سرسیّد کے نامور رُفقا میں نواب محسن الملک، صحیح معنوں میں اُن کے جانشین ثابت ہوئے "تہذیب الاخلاق" کی مقبولیت میں اُن کا نمایاں حصّہ ہے۔ اور سرسیّد کے بعد سب سے زیادہ مضامین لکھنے والے بھی وہی تھے۔ محسن الملک کو قدرت کی طرف سے ادیب کا قلم اور فلسفی کا ذہن عطا ہُوا تھا۔ اِسی لئے وہ تقلید کی بجائے اجتہاد اور فکری تازگی کو اہم سمجھتے ہیں۔ وہ سائنس اور مادی ترقی کے مثبت پہلوؤں کا تو ساتھ دینے کو تیار تھے لیکن مغرب کی کورانہ تقلید کے مخالف تھے اُن کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو یہ سمجھے ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ کی تقلید چھوڑ کر ڈاروِن اور بریڈے کا پیرو نہیں بنانا چاہئے محسن الملک کے مضامین میں بھرپور علمیت اور تحقیق کا سنجیدہ انداز ملتا ہے۔ اُن کی فکر میں توازن و اعتدال پایا جاتا ہے۔ اُنہوں نے سرسیّد کی پیروی ہی میں عقلیت، نیچر، اجتماعیت، جدیدیت اور مقصدیت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اِس سے اُنہوں نے قوم کے علمی، اخلاقی، مذہبی، تعلیمی اور سماجی نقطۂ نظر کی اِصلاح کی بھرپور کوششیں کیں۔ زبان کی اہمیت پر اُنہوں نے خاص زور دیا۔ اور ثابت

---

[1]: مقدمہ شبلی ایک دبستان" ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ص ۲ ایجوکیشنل پریس کراچی

[2]: جلد ۱ ص ۴۰۰ مرتبہ فضل الدین کریمی لاہور مئی ۱۹۷۰ء طبع چہارم جولائی ۱۹۳۶ء

کیا کہ اُردو ایک زندہ زبان ہے، ہمیشہ زندہ رہے گی اور کبھی مر نہیں سکتی۔ اِن کا استدلال ہے کہ ہمارے بہت سے قومی مسائل کا حل علم و تعلیم کے حصول میں ہے۔ اپنے مضمون "قومی عزت" میں اُنہوں نے ثابت کیا ہے کہ قومی عزت کا اِنحصار تعلیم پر ہے۔ کیونکہ علم ہی عزت و ذلت کی کسوٹی ہے۔ مُلکی اقتدار اور قومی عزت تعلیم سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ مغرب کی دیگر منفی اقدار سے اپنی نوجوان نسل کو بچانا چاہتے ہیں۔ اُن کے قلم میں ایسی نرمی اور زبان میں ایسا لوچ ہے کہ سخت سے سخت دل بھی مسخر کر دیتا۔ اور بات دل میں اُتر جاتی۔ جو کچھ کہتے ایسی لطافت اور تاثیر کے ساتھ کہ لوگ سر دُھنتے۔ اُن کا اُسلوب تازہ و دلکش ہے۔ اُس میں سرسیّد کا تعقل حالی کا خلوص و محبت، اور شبلی کا جوشِ بیان و انشاپردازی ملتی ہے۔ تمثیل کا خوب صورت اور دلکش انداز بھی ہے۔ اِن کے مضامین میں غیر ضروری طوالت، مبالغہ، تصنّع و بناوٹ ہرگز نہیں ہے نواب وقار الملک۔ ایک ادیب و عالم سے زیادہ ایک مدبّر اور منتظم تھے۔ علی گڑھ تحریک کو اُن کی عملی اور دماغی صلاحیتوں سے بہت فائدہ پہنچا۔ تحریک میں بڑے جوش اور سرگرمی سے حصّہ لیتے ہوئے مقصدی و تبلیغی مضامین لکھے۔ اِن کے مضامین مذہب، قوم، شیریں زبانی، قومی ذہنی صحت مندی، اور مجلسی اخلاق کی تحسین سے متعلق ہیں۔ نواب وقار الملک مسلمانوں کی ترقی و عروج کے لئے تعلیم کو بہت ضروری خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی ترقی کا واحد زینہ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مضمر ہے لیکن اعلیٰ تعلیم اُن کے مطابق :۔

"اعلیٰ تعلیم سے جو مراد ہے وہ تعلیم ہے جس سے انسان کا دماغ روشن ہو۔ اور تمام قوائے ظاہری و باطنی میں شگفتگی اور خیالات سے وسعت پیدا ہو اور اپنی مذہبی تعلیم اور قومی تاریخ کے اثر سے اخلاقِ حسنہ طبیعت ثانیہ بن گئے ہوں [1]۔"

---

[1]: وقارِ حیات ص ۶۴۰، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۵ء

مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، اور سید محمود بھی سرسیّد کے ہم خیال اور "تہذیب الاخلاق" کے اہم ترین لکھنے والوں میں سے تھے۔ مولوی چراغ علی کے مضامین "نشورِ محمدی" اور "مخبرِ صادق" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ مولوی چراغ علی عقلی توجیہہ کے دلدادہ، غیر متعصب، اور روشن خیال تھے۔ مشرقی اقدار کا پاس رکھتے ہوئے، اُنہوں نے علمی، ادبی اور مذہبی موضوعات پر اصلاحی و مقصدی مضامین لکھے۔ "اسلام کی دنیوی برکتیں" میں اُنہوں نے مذہبِ اسلام کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے غلامی کو ممنوع قرار دیا "احسانِ عام" "قرآن مجید کی نیچرل فلاسفی، محاسن کائنات، اور حقائق موجودات سے متعلق اُن کے مضامین بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے استدلال سے ثابت کیا کہ اسلام ایک ترقی پسند ترقی پذیر مذہب ہے۔ جو مانع ترقی نہیں بلکہ موافق ترقی ہے۔ ان کے مضامین سادہ، سلیس ہونے کے باوجود اپنے اندر بے پناہ گہرائی اور اثباتی قوت رکھتے ہیں۔

مولوی ذکاء اللہ نے بھی مشرقی روایات و اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے مذہبی، دینی اور اصلاحی مضامین لکھے جو طرزِ تحریر کی سادگی، اور موضوع کی اہمیت کی وجہ سے قابلِ توجہ ہیں۔ سید محمود بھی اہم مضمون نگار ہیں۔ گو اُنہوں نے کم لکھا تاہم اُن کے مضامین پختہ، اور سلجھے ہوئے تفکر کا پتا دیتے ہیں۔ مثلاً "شدتِ افکار دوستی کا برتاؤ" میں وسعت، دلکشی اور تروتازگی ہے۔ جن سے سرخوشی، اور انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ قلم محتاط اور حدود شناس ہونے کے باوجود بات پیدا کرنے کا نرالا انداز جانتا ہے۔

مولوی نذیر احمد اور سرسیّد کے نظریات میں بھی ہم آہنگی ملتی ہے۔ وہ مسلمانوں میں قومی تشخص اور قومیت کا احساس پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی اپنی انفرادیت و عظمت ہے جسے برقرار رکھنا اُن کا فرض اور دین ہے کیونکہ،

"گنگا اور جمنا کا سنگم ہو سکتا ہے اور نہیں ہو سکتا تو ہندو اور مسلم کا۔

جب تک ہندو، ہندو ہے اور مسلمان، مسلمان"[1]

اسی نظریے کے پیشِ نظر اُنہوں نے مقصدی و اصلاحی مضامین لکھے۔ انہیں جدید علوم کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ تھا۔ اور وہ قدیم تعلیم کی فرسودگی کا پورا احساس رکھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ جن قدیم علوم کو ہم علم سمجھتے رہے ہیں وہ محض الفاظی اور خیالی مفروضات ہیں۔ اپنے مضامین کے ذریعے اُنہوں نے قوم کو جدید علوم کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ اور اس میں وہ نہایت کامیاب رہے۔ نذیر احمد کے مضامین "توحید" "انسان کی زندگی" "قرآن اور مسلمان" "لفظِ اسلام اور اس کی حقیقت" "اسلام فطرت کے مطابق ہے" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یوں اُنہوں نے اس دور کے مسلمانوں کی ذہنی تعمیر نو میں بھرپور حصہ لیا۔

سرسیّد کے رُفقاء اور اُردو کے عناصرِ خمسہ میں مولانا محمد حسین آزاد صحیح معنوں میں ایڈیسن اور اسٹیل کے پیرو دیکھے جا سکتے ہیں۔ جنہوں نے اُن کی نگارشات سے متاثر ہو کر اُن کے خیال سے اپنے خیال کا چراغ روشن کیا ہے۔ اُن کے مضامین گرچہ ترجمہ ہیں لیکن ہر جگہ لطافت، نزاکت اور اصلیت کو برقرار رکھا ہے۔ "نیرنگِ خیال" کے یہ مضامین تمثیلی کہانیوں کی صورت میں لکھے گئے ہیں اور آزاد اِن مضامین کے علاوہ کچھ اور نہ بھی لکھتے تو بھی اُردو کے بہترین انشاپرداز ہوتے۔ اُن کی انفرادیت کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے اصلاح و مقصد کو ادب و انشاء کے تابع رکھا ہے۔ یوں اخلاق کی براہِ راست تبلیغ جو سرسیّد اور اُن کے رُفقاء کا خاصا ہے، آزاد کے ہاں خوشگوار و دلکش انشاپردازی کا رُوپ دھار لیتی ہے۔ ان مضامین کا انداز افسانوی ہے۔ حیرت و تحیر کی اس فضا میں قاری اپنے آپ کو گم ہوتا محسوس کرتا ہے۔ "گلشنِ اُمید کی بہار" "سیرِ زندگی" "شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار" اہم ترین مضامین، جنہیں اُردو کے بہترین مضامین بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آزاد کے جادوگر قلم نے لفظوں کے وہ رنگین و شوخ پھول کھلائے ہیں کہ تازگی و شادابی کا احساس ہمیں فطرت کے

---

[1] نذیر احمد۔ لیکچروں کا مجموعہ۔ جلد اوّل ص ۲۳ مرتبہ مولوی بشیر الدین ۱۹۱۸ء

اور بھی قریب کر دیتا ہے۔

سرسیّد اور اُن کے ہمعصر رُفقا نے مضمون نگاری کو ایک نہایت جاندار اور مقبول عام صنفِ ادب بنا دیا۔ چنانچہ اُن کے بعد کی نسل کے ادیب خاص طور پر اس جانب متوجہ ہوئے۔ ان میں جن لوگوں نے نام پیدا کیا اور بحیثیت مقالہ نگار ممتاز ہوئے، اُن میں اکبرؔ الٰہ آبادی، علامہ اقبال، پنڈت برجموہن، نادرؔ کاکوروی، مولوی سیّد احمد دہلوی، شادؔ عظیم آبادی، وحیدالدین سلیمؔ، ابوالکلام آزادؔ، راشدؔ الخیری، محفوظ علی، محمود شیرانی، سیّد سلیمان ندوی، مہدیؔ افادی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین زورؔ، نصیرالدین ہاشمی، عبدالقادر سروری، اور مولانا نیازؔ فتح پوری شامل ہیں۔ ان مضمون نگاروں نے مذہب، سیاست، تعلیم، تاریخ، فلسفہ، اور سماجی و معاشرتی موضوعات پر مضامین لکھے۔

مولانا وحیدالدین سلیمؔ کے مضامین مذہبی، اخلاقی، سیاسی و اصلاحی ہیں۔ انہوں نے ہر موضوع پر ایک عالم کی حیثیت سے قلم اُٹھایا اور لیاقت و قابلیت کا اعلیٰ معیار پیش کیا۔ شبلیؔ کے جانشین سیّد سلیمان ندوی نے زبان، تاریخ زبان، سیرت، ادب و شاعری پر اعلیٰ درجے کے مضامین لکھے "نقوشِ سلیمانی" کے مضامین اپنی وسعت و گہرائی کی وجہ سے ہمیشہ توجہ سے پڑھے جاتے رہیں گے۔ مہدیؔ افادی کے مضامین اُس عہد کے اُبھرتے ہوئے رُجحانات کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ مضامین میں رُومانیت، احساسِ حُسن اور شعریت موجود ہے۔ ان مضامین میں جمالیاتی انداز اور زندگی سے لُطف اُٹھانے کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ یُوں مہدی افادی نے ادبِ لطیف کے رنگ کو نکھارا۔ "آرزوئے شباب"، "خوابِ طفلی"، "فلسفۂ حُسن و عشق" خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق، سرسیّد اور حالیؔ کے تربیت یافتہ ہیں جو اُردو کے عظیم محسن، اُردو کی فکر میں عمر بھر جاگتے اور اس کی خاطر جنگیں لڑتے رہے۔ اُنہوں نے شعر و ادب، تاریخ و سیاست، فلسفہ و نفسیات، علم و فن، اُردو زبان، اس کی تاریخ اور لسانی مسائل پر ایسے جاندار مقالے تحریر کئے جن کا جواب شاید ہی پیش کیا جا سکے۔

حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین زورؔ، نصیرالدین ہاشمی، اور عبدالقادر سروری نے اُردو زبان، اس کی تاریخ اور لسانی مسائل پر اعلیٰ درجے کے مضامین لکھے۔

یُوں نیازؔ فتح پوری تک پہنچتے پہنچتے مضمون نگاری ایک خاص رُخ و سمت اُستوار کر چکی تھی۔ اور اس کا دائرہ عمل مکاں سے لامکاں تک پہنچ چکا تھا۔ زندگی کے تمام تر گوشے خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، مذہبی ہوں یا ثقافتی، علمی ہوں یا ادبی، تحقیقی ہوں یا تنقیدی اس صنف میں جگہ پا چکے تھے۔ لیکن جب نیازؔ کے جادو نگار قلم نے انہیں ہاتھ لگایا تو اُس کی گوناگوں رنگارنگی کچھ اور بھی جاذبِ نظر ہو گئی۔ دُنیا میں کبھی کبھی ایسا قلم بھی پیدا ہوتا ہے جس سے پھوٹنے والے لفظوں کی کونپلیں کھلا ہوا پھول بنتا تو جانتی ہیں مگر مرجھانا اور مرنا نہیں جانتیں۔ اس قلم کی حیات ماہ و سال سے نہیں بلکہ اس سے نکلنے والے لفظوں کی حیاتِ جاوداں سے کی جاتی ہے۔ نیازؔ کے لفظوں کی یہی صورت ہے۔

نیازؔ کے مضامین کو بہ اعتبارِ موضوع ہم مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ مذہبی مضامین ۲۔ تاریخی مضامین ۳۔ علمی، ادبی و تنقیدی مضامین۔

مذہبی مضامین میں خاص احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا بُنیادی مقصد عقائد پر روشنی ڈالنا، غلط فہمیوں کو دُور کرتے ہوئے مختلف نظریوں میں سے ایک صحیح و روشن راہ ڈھونڈھنا ہے۔ جس دَور میں نیازؔ نے مضامین لکھنے کا آغاز کیا اُس میں کوششیں یہ کی جا رہی تھیں کہ مذہب کو تعقل و منطق کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اور بہت سی باتیں جو محض روایاتی طور پر مذہب کا حصّہ بن چکی ہیں اُن کو دَرایت و دلائل سے غلط یا صحیح ثابت کرتے ہوئے مذہب اور سائنس، اور مذہب و بدلتی ہوئی سماجی و معاشرتی اقدار میں ہم آہنگی تلاش کی جائے۔ اس کا آغاز گرچہ سرسیّد اور اُن کے رُفقا کر چکے تھے۔ مگر نیازؔ نے خالصتاً تفکر و تعقل کی راہ اختیار کی ہے۔ اور مولویوں کے بنائے ہوئے مذہبی عقائد کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔ بغاوت کا یہ جذبہ اتنا شدید ہے کہ اُنہوں نے بعض اوقات خدا کے وجود کو بھی عقل سے سمجھنے اور ثابت کرنے کی کوشش میں خدا کے وجود، اثبات و عدمِ اثبات پر بحث کی ہے جو بات کہتے ہیں، بلا خوف و تردّد اور بیباک ہو کر کہتے ہیں۔ وہ خوف زدہ

نہیں۔ اُن کے قلم میں کہیں بھی لرزش نہیں۔ ایسے ہی مباحث کی وجہ سے اُنہیں زندیق، کافر ملحد کہا گیا۔ لیکن اُن کا قلم رُکا نہیں۔ وہ بڑی رَوانی سے مذہبی اِصلاح کی خاطر آخری دَم تک چلتا رہا۔ اُن کے مذہبی مضامین میں "خدا ہے یا نہیں" "نظریۂ اسلام" "ہمارے علمارِ کرام کا دینی نظریہ"۔ "مذہب والحاد" "خدا نے دُنیا کو کیوں پیدا کیا؟" "عالمگیر مذہب" "قرآن کے کلامِ خدا ہونے کا صحیح مفہوم" "مذہبی عقائد اور سائنس" "خدا، قرآن اور محمدؐ اور محمدؐ، قرآن اور خدا" نہایت اَہم ہیں۔

نیاز نے مذہبی اِعتقادات کی عقلی نقطۂ نظر سے تاویل پیش کرتے ہوئے خاص مفکرانہ نتائج پیش کئے ہیں۔ نیاز کی خواہش تھی کہ وہ غلط اور ضعیف روایات جو مذہب کا حصّہ بنا دی گئی ہیں اُن کو ختم کیا جائے۔ اور عقائد جن میں قیامت، جنت و دوزخ، معجزات، فرشتے، اِن سب کو تعقّل کی روشنی میں پرکھا جائے۔ لیکن ہمارے عُلمار کی توجہ اِس زاویۂ نگاہ سے نہیں پڑتی۔ وہ خدا، عبادات عقائد کو محض خارجی وظاہری نظر سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی رُوح تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ عبادات کو فرض سمجھتے ہوئے اُن کی ادائیگی پر تو زور دیتے ہیں لیکن اُن کی تہہ میں جو رُوحانی پاکیزگی کا اعلیٰ ترین مقصد پنہاں ہے اُسے نظر انداز کر دیتے ہیں جیسا کہ اپنے مضمون "انسانی زندگی کا معیار اور ہمارے علمارِ کرام" میں لکھتے ہیں :۔

"اِسلام نے عبادت کو محض عبادت کے لحاظ سے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اُس نے نماز کی تعلیم دی صرف اِس لئے کہ باہمی اتحاد وتعاون پیدا ہو۔ اُس نے روزہ فرض کیا محض اِس غرض سے کہ ہم میں ابنارِ جنس کے اقتصادی مشکلات کا اِحساس پیدا ہو۔ اُس نے حج کی ہدایت کی صرف اِس مقصود کے ساتھ کہ اِسلام کو بین الاقوامی چیز بنایا جائے۔ اُس نے ادائے زکوٰۃ لازم قرار دیا فقط اِس مدعا کے ساتھ کہ قوم کا ایک مرکزی بیت المال قائم رہے[1]"۔

[1] "من ویزداں" حصّہ اوّل ص ۲۰، بار دوم فروری ۱۹۰۰ء نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

نیاز کا کہنا ہے کہ ہمارے عُلمار نے تعلیماتِ اِسلامی میں نماز وروزہ کو تو لے لیا لیکن اُس جوش عمل اور اُس ولولۂ ترقی کو نظر انداز کر دیا جس کے پیدا کرنے کے لئے اطاعت وعبادت کی پابندیاں پیدا کی گئیں۔ اخلاقی پاکیزگی اور رُوحانی صفائی کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ اور یُوں جس نے اِس دُنیا میں اندھوں کی طرح زندگی بسر کی وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔ مذہب اِسلام دینِ فطرت ہے۔ اور بدلتے حالات میں جو مذہب وقت کا ساتھ دے سکتا ہے، وہ اِسلام ہی ہے۔ لیکن افسوس اُس کی اصل رُوح کو پیش نہیں کیا گیا :۔

"اگر شخص ثالث کی حیثیت سے فیصلہ کیا جائے تو اِس سے اِنکار ممکن نہیں کہ موجودہ مذاہب میں صرف اِسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو زمانے موجودہ انقلاب میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے بشرطیکہ اُس کی اصل رُوح کو پیش کیا جائے۔ اور ظاہری شعائر ومراسم کی پابندی پر زور نہ دیا جائے[1]"۔

نیاز کا کہنا ہے کہ مذہب کی اصل رُوح اِنسان اور اِنسانیت کو زندہ رکھنا ہے۔ لیکن آج اِنسان آگے بڑھ رہا ہے لیکن اِنسانیت پیچھے ہٹ رہی ہے۔ دماغ ترقی کر رہا ہے لیکن رُوح تنزل کر رہی ہے۔ آج کا اِنسان ایک ایسا فلسفی ہے جس کے سامنے دریا جاری ہے اور وہ پانی پینے کے لئے آزاد لیکن اُس کی رُوح جس چیز کے لئے بیتاب ہے اُس کا کہیں پتا نہیں۔ دُنیا کے تمام مذاہب اپنی "فردوسِ گم گشتہ" کو ڈھونڈھ نکالنا چاہتے ہیں لیکن :۔

"خدا ایک ہے اور اُس کا پیغام بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ وہ پیغام ہمیشہ سے ایک صدقِ بسیط، ایک حقیقتِ مستدام، ایک صداقت لازوال، ایک قطعیت غیر فانی رہا ہے۔ اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ خواہ اس کے

[1] "گزشتہ وآئندہ" "من ویزداں" ص ۲۵۰

پہنچانے والے کسی ملک و قوم اور کسی رنگ و نسل کے ہوں[1]۔"

نیاز کا کہنا ہے کہ اسلام ایک مکمل مذہب ہے۔ اب نہ مذہب کے لحاظ سے کسی اور مذہب کی ضرورت ہے اور نہ مبلغ کی حیثیت سے کسی اور ہستی کے رونما ہونے کی حاجت۔ "خدا ہے یا نہیں" اس فلسفہ پر گفتگو کرتے ہوئے اُن کا مدعا یہ ہے کہ خدا شہ رگ سے قریب، خون میں جاری ساری روح و قلب میں جاگزیں ہے۔ سورج کے طلوع و غروب، چاند کے ایاب و ذہاب، آبشاروں کی روانی، دشت و صحرا کی ویرانی، پہاڑوں کے سکوت، دریاؤں کے شور، بہار و خزاں کا ظہور، دنیا نباتات کی بوقلمونی و حوش و طیور کی طبعی زندگی میں وہ جلوہ گر ہے جس کے لئے نہ دلیل و برہان کی ضرورت ہے اور نہ کسی حجت و توجیہہ کی۔ پھر بھی اگر کوئی یہ سوال اُٹھاتا ہے تو یہ اُس کی سوچ و سمجھ کا قصور ہے

"آفتاب طلوع ہوتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ صبح کو پھول کھلتے ہیں اور سارا گلشن نکہت سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو آپ اپنی برہان ہے یہ وہ صداقت ہے جو آپ اپنی مصدق ہے۔ اگر ہم اس سے ناواقف ہیں تو کس کا قصور ہے[2]؟"

نیاز کا موقف ہے کہ ایسے مباحث سے ہٹ کر ہمارا فلسفہ و نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ تمام انسان ایک ہیں اور انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب ہے۔ جس کی خدا نے بھی تلقین کی ہے۔ نام، لباس، رنگ و نسل کی سب تفریق مٹا دی جائے۔ آسمانی رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوگا اور تب ہی دنیا میں حقیقی امن و سکون قائم ہو سکتا ہے۔ کلام پاک اور منشاء خداوندی یہی ہے کہ ساری دنیا ایک جماعت، ایک اُمت ہو کر زندگی بسر کرے۔ اور جو لوگ اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقتاً فطرت کی مخالفت کرتے ہیں۔ ایک غیر مسلم جو نماز، روزہ کا پابند

---

[1] "آہ زعمرے کہ گزشت ایچنیں" من و یزداں، ص ۱۲

[2] "خدا ہے یا نہیں" من و یزداں، ص ۹، ۱۰

نہیں لیکن مکارم اخلاق اور محاسن فطرت سے آراستہ ہے۔ نیاز کے خیال میں اُس مسلمان سے بہتر ہے جو نماز، روزہ کا تو پابند ہے لیکن انسانیت و اخلاق حسنہ سے اُس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مسلمان ہونا باعث افتخار نہیں ہے۔ باعث افتخار یہ ہے کہ آپ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ سچے انسان بھی ہوں۔ یہ وہ درجہ کمال ہے کہ انسان کو فرشتوں پر بھی برتری حاصل ہوئی وہ اُس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ مسلمان کا اپنے آپ کو برتر سمجھنا اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو کمتر اور حقارت سے دیکھنا بالکل غلط ہے کیونکہ بقول نیاز،

"آپ اگر اپنی حُرمت چاہتے ہیں تو دوسروں کی حُرمت کیجئے۔ یہ عام اصول اخلاق ہے۔ اس لئے اگر آپ اپنے مذہب کا وقار قائم کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مذہب کی بھی عزت کیجئے۔ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا ورنہ تو تو جبر سے کوئی مذہب اشاعت پذیر ہو سکتا ہے۔ تلوار ایک آدمی کا نام تو بدل سکتی ہے۔ وضع معاشرت میں تبدیلی تو پیدا کر سکتی ہے لیکن دل کو نہیں پھیر سکتی۔ دماغ کو مجبور نہیں کر سکتی۔ اطمینان نفس، طمانیت روح، لطف و راحت، محبت و شفقت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے[1]۔"

نیاز کے مطابق اسلام مسجد و مندر کی تفریق سے بے نیاز ہے۔ زنار و تسبیح کے امتیاز سے بالاتر ہے وہ اخوت و مساوات کا مبلغ ہے اور یہی انسانیت کا نصب العین ہے۔ "ہمارے علمائے کرام کا دینی نظریہ" میں اُنہوں نے تنگ نظر علماء پر کڑی تنقید کی ہے۔ جو مذہب کی صحیح غایت اور اصل رُوح کو نہیں پہچانتے۔ اُنہوں نے مذہب اسلام اور اخلاق حسنہ کو علیحدہ علیحدہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں یہ ایک ہی ہیں۔ نیاز کا فلسفہ یہ ہے کہ بدکردار مسلمان ناری ہے اور ایک نیکوکار برہمن یقیناً ناجی ہے۔ نیاز قرآن کے اس سبق پر کامل یقین رکھتے ہیں لیس الانسان الا ما سعے

---

[1] [illegible] ص ۳۲

یعنی اِنسان کو اُتنا ہی ملے گا جتنی اُس نے کوشش کی ہے، اور وہی ملے گا جو اُس کے اقتضاء ہے نیاز نے ایسی عادات جو مسلمانوں میں معنوی یا رُوحانی تبدیلی پیدا نہیں کرتیں اس کو بھی شرک و کفر ہی سمجھا ہے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک عبادتیں خدا سے تعلق نہیں بلکہ خود ہماری فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا اثر ہماری ہی زندگی پر پڑنا چاہیئے:۔

"اگر کوئی مسلمان باوجود نماز، روزہ و دیگر احکام کی شریعت کی پابندی کے اپنے اندر کوئی معنوی یا رُوحانی تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ صرف ان اعمالِ شعائر کی پابندی اس کی نجات کے لئے کافی ہے۔ جیسا کہ ہمارے علماء کرام نے اپنے فتاوے میں ظاہر کیا ہے۔ تو میں اس کو بھی شرک و کفر ہی قرار دوں گا۔ اور ایک بدکار بُت پرست کے مقابلہ میں اُس کو ترجیح نہیں دے سکتا کیونکہ ان دونوں کے درمیان سوائے اس کے کوئی فرق نہیں ہے کہ ایک نے بُت پتھر کا بنا لیا ہے اور دوسرے نے وہم و خیال کا۔"[1]

نیاز کا کہنا ہے کہ مذاہب عالم میں اسلام ہی صرف ایسا مذہب ہے جو وقت اور زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے۔ اور یہی ایک تنہا مسلک ہے جس نے اخوتِ عامہ اور انسانیت کبریٰ کو حقیقی منزل قرار دے کر ساری دُنیا کو اشتراکِ عمل کی دعوت دی ہے۔ نیاز کہتے ہیں کہ دُنیا میں کوئی چیز بذاتِ خود نہ بُری ہے نہ اچھی؛ اس سے اچھائی اور بُرائی کا تعلق اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب اُس کا استعمال کیا جائے۔ ایک زنگ خوردہ لوہے کا ٹکڑا کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اگر اس سے زخم پہنچایا جائے تو لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں گے۔ مذہب نے ہمیشہ محبت، اُمن، شانتی کا درس دیا ہے۔ اپنے مضمون "مذہب و الحاد" میں مذہب کی ماہیت و معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

[1] "ہمارے علماء کرام کا دینی نظریہ" من و یزداں ص ۶۹

"مذہب نہ کوئی معمّہ ہے نہ دقیق علمی مسئلہ، نہ وہ کوئی خیالی چیز ہے نہ فطرت کا عمیق راز، نہ وہ شاعری ہے نہ محض لفاظی ــــ مذہب نام ہے انسان میں احساسِ انسانیت کا۔"[1]

نیاز کے مطابق جب تک کوئی مذہب احساسِ انسانیت کو بیدار نہ کر سکے۔ ہم اُسے امن و سکون کا ضامن نہیں کہہ سکتے۔ اسلامی تہذیب بھی گزشتہ تمام تہذیبوں میں اس لئے ممتاز حیثیت رکھتی ہے کہ اُس نے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا جو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی کا بھی ضامن تھا بلکہ اُس کی تمام مادی ترقیاں صرف اخلاق کی بلندی پر منحصر ہیں۔ "خدا نے دُنیا کو کیوں پیدا کیا" اس مضمون کی بنیاد اُنہوں نے اس فلسفہ پر رکھی ہے کہ خدا تمہاری عبادت سے خوش نہیں ہوتا بلکہ اصلاح و ترقی سے خوش ہوتا ہے۔ مذہب اسلام نے عملی زندگی کو سامنے رکھ کر سوسائٹی کے اُصول مرتب کئے ہیں۔ اُن کے خیال میں مذہب کی سب سے خطرناک تعلیم یہی ہے کہ دُنیا فانی ہے انسان فانی ہے۔ اور بقا اُس زندگی کو حاصل ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوگی۔ اور اُسی کو سنوارنے کی ضرورت ہے۔ گویا انسان کا یہ اجتماع سرائے کے مسافروں کا اجتماع ہے جسے صبح و شام منتشر ہو جانا ہے۔ جب یہ تعلیم ہو تو دُنیا کی اصلاح و ترقی کے لئے بھلا کون سا جذبہ قائم کر سکتا ہے۔ نیاز کی رائے ہے کہ مذہب کے فلسفہ میں اُلجھنا اور اُس کی گتھیوں کو سُلجھاتے رہنے میں مگن رہنے سے بہتر ہے کہ انسانیت اور امن و سکون کی خاطر تدابیر اختیار کی جائیں:۔

"گھر میں جس وقت آگ لگتی ہے تو اس کا سبب دریافت کرنے سے پہلے اس کے بُجھانے کی فکر ہوتی ہے۔ اس لئے وہ لوگ جو حقیقی معنی میں نوعِ انسانی کے خیر خواہ ہیں اُن کو نہ خدا کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور نہ یہ سوچنے کی کہ اس نے دُنیا کو کیوں پیدا کیا۔ بلکہ صرف ان تدابیر پر

---

[1] [illegible] ۱۹۱، ۱۶۲

غور کرنے کی کہ تمام انسان باہم مل کر صلح و آشتی کی زندگی کیونکر بسر کرتے ہیں[1]۔

نیاز کے مطابق انسان انفرادی حیثیت سے فانی ہے لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کو بقائے دوام حاصل ہے۔ انسان کی موجودہ صورت بدل سکتی ہے اُس کے عادات و اطوار میں تغیر ہو سکتا ہے اس کے افراد یقیناً فنا ہوتے جائیں گے لیکن انسان بہرحال باقی رہے گا۔ کرۂ ارض پر نہ سہی کسی اور کرہ میں زندگی حقیقتاً نام ہے صرف اُس توازن کا جو فطرت کی تعمیری و تخریبی دو متضاد قوتوں میں پایا جاتا ہے۔ فطرت کی تعمیری قوت ہمیں قائم رکھنا چاہتی ہے اور تخریبی قوت مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔ جب تک ان دونوں میں توازن و تناسب ہے ہم صحیح و توانا کہلاتے ہیں۔ لیکن جب رفتہ رفتہ تخریبی قوت غالب آنے لگتی ہے تو ہم ضعیف و کمزور ہو جاتے ہیں۔ تخریب و تعمیر کا عمل ساری زندگی جاری رہتا ہے۔ انسان اس دُنیا کا ایک جزو ہے اور اسی کو آباد کرنے کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ قُدرت نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ وہ یہاں مفلوج و عاجز، بیکس و مفلس، محتاج و بیمار بن کر زندگی بسر کرے۔ دُنیا خدا کا ایک باغ ہے جس کو اُس نے پھولنے اور پھلنے کے لئے بنایا تھا نہ کہ ویران و برباد ہونے کے لئے۔ جن لوگوں کو چشم بصیرت عطا ہوئی ہے وہ اونچ نیچ، تعمیر و تخریب کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اصلاح، ترقی اور خوشحالی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ جس سے اُنہیں مادی خوشی بھی حاصل ہوتی ہے اور رُوحانی مسرت بھی۔ بقول نیاز:۔

"اس دُنیا میں ایک متشائم (Pessimistic) قوم کو زندہ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ وہ جماعت جو اپنی کاہلی اور قوتِ عمل کے فقدان کو "تقدیر و توکل" کے نام سے موسوم کر کے گدایانہ زندگی بسر کر رہی ہے وہ یقیناً ہلاک ہو کر رہے گی۔ اور اُسے ہلاک ہو جانا چاہیئے[2]۔"

---

[1]:۔ "خدا نے دُنیا کو کیوں پیدا کیا؟" من یزداں۔ ص ۳۶۵

[2]:۔ "خودنمائی خدا شناسیہاست" من یزداں ص ۳۳۳

نیاز کا موقف یہ ہے کہ مختلف قوموں نے اپنی بے عملی، سُستی اور کاہل الوجودی کے لئے توہم کے مختلف بُت تراش رکھے ہیں جن کو وہ تقدیر و توکل کا نام دے کر اپنی منفی حرکات و سکنات پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اور مسلمانوں کو تو اس طرح کی ذہنیت سے اور بچنا چاہیئے اس لئے کہ اسلام ہی وہ تنہا مذہب ہے جس نے بُت شکنی میں خاص شہرت حاصل کی ہے ایک کا مقصود لات و ہبل کی مورتیوں کو ہی مسمار کرنا نہیں بلکہ اُس ذہنیت کو منہدم کرنا تھا جو انسان کے اندر بے عملی اور غلامانہ تذلیل پیدا کرتی ہے۔ یُوں مذہب، دین اور دُنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

اس کا اظہار نیاز نے اپنے اہم معلوماتی مضمون "مذہبی عقائد اور سائنس" میں کیا ہے۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا تذکرہ کرتے ہوئے مذہب اور سائنس کے درمیان اہم تعلق اور ہم آہنگی کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تاکہ وہ لوگ جن کا مذہبی اعتقاد، علوم حیاتیات کے ماہرین کے نظریات سے کچھ متزلزل ہو رہا ہے اُن کو غور و فکر پر آمادہ کیا جائے۔

نیاز کا استدلال ہے کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں سارا ارتقائی عمل کائنات اور انسان دونوں میں یکساں رہا ہے۔ پہاڑ کی چوٹیوں کی برف چشمہ کی شکل میں بہہ نکلتی ہے اور پھر یہی چشمے بڑے دریاؤں کی شکل میں بہتے ہوئے سمندر میں مل جاتے ہیں یہ وہ قانونِ کشش کی بنا پر نشیب کی طرف بہتے ہیں لیکن چشمۂ حیات راہِ ارتقاء میں کبھی نیچے کی طرف نہیں بہتا بلکہ اوپر کی طرف جاتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اب تک زندگی کا دریا اوپر ہی چڑھ رہا ہے۔ جس کی ابتداء بے شکل مادہ سے ہوئی اور انتہا غور و فکر کرنے والے اور ضمیر سے متصف انسان پر۔ یُوں انسان کی یہ ارتقائی صورت مذہب سے اپنا ناطہ جوڑے ہے اور وہ لوگ جو انسان کی سیاہی منفیت اور شر کو بھی خدا سے منسوب کرنا چاہتے ہیں اُن کے استدلال کا جواب دیتے ہوئے نیاز لکھتے ہیں:۔

"ارتقاء کی ابتدائی ساری ترقیوں کا انحصار خدا کی ذات پر تھا، لیکن جب سے اُس نے انسان کو ضمیر اور عقلِ سلیم عطا کی تب سے یہ بار ہمارے کاندھوں پر

آفتاب کی زرپاشیاں، چاند کی نور افشانیاں، شاہدِ مقصود کے مختلف مظاہر و آثار PHENOMENA ہیں جو ہم کو عینِ ذات NEDMENON کی طرف بلاتے ہیں۔ خزاں کی سوگواری، بہار کی نشاط انگیزی، دریا کی روانی، پہاڑ کی استقامت اور ان کو بھی جانے دیجئے۔ خود انسان کے نتائجِ عمل جو سر بفلک عماروں، محیر العقول ایجادوں اور زر و سیم کے انبار کی صورت میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ سب ذریعے ہیں اصل منزل تک پہنچنے کی۔"[1]

نیاز کے دوسری نوع کے مضامین تاریخی ہیں۔ تاریخی مضامین میں جتنے وسیع مطالعے و معلومات اور محقق کی سچی اور گہری نظر کی ضرورت ہوتی ہے، اور طرح کے مضامین میں اس کی ضرورت شاید اتنی نہ ہو۔ نیاز کو قدرت کی طرف سے مورخ کا ذہن بھی عطا ہوا تھا۔ اس لئے انہوں نے بڑے جاندار مضامین و مقالے تحریر کئے ہیں۔ ان میں "علوم اسلامی پر ایک مورخانہ نظر"، "اندلس کے آثارِ علمیہ"، "فراعنۂ مصر کی خوابگاہیں"، "زنگاری یا حبشی جماعت کے دلچسپ حالات" بہت اہم ہیں۔ یہ دلچسپ معلوماتی مضامین ہیں، جن میں مختلف ادوار پر تاریخی نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ "اندلس کے آثارِ علمیہ" میں یہ ثابت کیا ہے کہ بہت سے علوم اور سائنس کی جدید ایجادات کو منظرِ عام پر لانے والے مسلمان تھے۔ علم کی سچی تڑپ اور لگن اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ "فراعنۂ مصر کی خوابگاہیں" مصر کے فرعونی دور کے تہذیبی و سماجی اقدار کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ عیش و عشرت اور دولت کی فراوانی میں یہ خوابگاہیں ایسے دلکش مناظر پیش کرتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ہیرے جواہرات موتی، زمرد و لعل سے سجی یہ خوابگاہیں ایک سنہری و قیمتی دور کی نمائندہ ہیں۔

"علومِ اسلامی پر ایک مورخانہ نظر" میں اسلام اور اسلام سے قبل علوم پر ایک تاریخی نظر ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ اسلام سے قبل خصوصیت سے چار علوم کا زیادہ رواج تھا (۱) علم الانساب۔

---

[1] آہ وہ زہرے کہ گزشت ایجنیہ، من و یزداں ص ۱۹

(۱) تاریخ (۲) تعبیر الرؤیا (۳) علم نجوم۔ حیرہ کے تاجدار امرالقیس نے جو عظیم شاعر بھی تھا، فنِ تحریر کو سب سے پہلے رواج دیا۔ علم الانساب کے علاوہ قبل ظہورِ اسلام قیافہ گوئی کا بھی کافی ذوق پایا جاتا تھا۔ پھر اسلام، عہدِ رسالت و خلفائے راشدین، عہدِ بنو امیہ، عہدِ بنو عباس، میں علوم کی ترقی و ترویج پر تاریخی انداز سے روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح تاریخ، جغرافیہ، ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ نے جنم لیا۔ مذہب اور ان میں پوری ہم آہنگی ملتی ہے جو لوگ ان کا دائرہ کار الگ کرتے ہیں وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔

ان تاریخی مضامین میں شخصی رنگ ہے۔ اور تفتیش کا انداز پایا جاتا ہے۔ جو نیاز کی علمی دلچسپیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ان مضامین سے ہٹ کر، مذہبی مضامین کے بعد، نیاز کے جن مضامین کو اہمیت حاصل ہے وہ علمی، ادبی، اور تنقیدی مضامین ہیں۔ علمی مضامین میں نیاز نے بعض انکشافات و ایجادات پر بحث کی ہے۔ مثلاً "دنیا کی سب سے بڑی دوربین"، "شاعروں کے حیرت انگیز کمالات"، "داستانِ ابر و باد"، "مغرب کا نظامِ تعلیم"، "اسلام کا نظریۂ جمہوریت" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلے تین مضامین کو ہم سائنسی مضامین بھی کہہ سکتے ہیں، جن میں نیاز نے کچھ ایجادات کی کہانی سنائی ہے۔ ان کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ اردو مضمون نگاری کی دنیا میں یہ ایک نیا انداز و رویہ تھا۔

"مغرب کا نظامِ تعلیم"[1] میں انہوں نے جرمنی اور فرانس کے نظامِ تعلیم پر روشنی ڈالی ہے۔ تعلیم ہر شخص کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ یہ فرد کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے۔ ایسا قابلِ عمل انسان جو ملک و ملت کے لئے قیمتی سرمایہ اور باعثِ افتخار ہے۔ جرمنی اور فرانس میں جہالت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہاں تعلیم کو ہر فرد کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے ابتدائی تعلیم بالکل مفت ہے۔ مدارس کی حالت قابلِ رشک ہے۔ مدارس کے نصف مصارف

---

[1] مطبوعہ نگار، اکتوبر ۱۹۲۳ء

خود حکومت ادا کرتی ہے۔ یوں وہ تعلیم یافتہ لوگ اپنے ملک و قوم کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں "اسلام کا نظریۂ جمہوریت"[1] میں منطقی و استدلالی انداز اختیار کرتے ہوئے، اسلام میں جمہوریت کے تصور کو پیش کیا ہے۔ نیاز کا کہنا ہے کہ قبل از اسلام جمہوریت کا تصور محض قومی اور جماعتی اقتدار کا تصور تھا۔ جامع بشری کی اصلاح و ترقی کا کوئی سوال اس کے سامنے نہ تھا۔ چونکہ اسلام کا خطاب بلا امتیاز ملک و ملت ساری دنیا سے تھا۔ اور اس کی بنیاد اخلاقیات پر رکھی گئی اس لیے اس کا تصور جمہوریت ایک عالمگیر اخلاقی جمہوریت کا تصور ہے۔ ظہور اسلام سے قبل دنیا اخلاقی انحطاط کا شکار تھی۔ یورپ، عرب، چین اور ہندوستان اخلاقی پستی کی آخری حد تک پہنچ چکے تھے۔ قتل و غارتگری، مے نوشی، قمار بازی، عصمت فروشی، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، نہ کوئی دنیاوی قانون تھا اور نہ اخلاقی پابندی۔ اسلام نے اعلیٰ اخلاقی و روحانی نظام پیش کیا۔ اور مذہب کی تبلیغ اخلاق و کردار کی عظمتوں سے ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین تک کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا کہ مسلم افواج نے محض اشاعت اسلام یا توسیع حکومت کے لئے کسی قوم یا ملک پر حملہ کیا ہو۔ نیاز کے مطابق جمہوریت اسلام کے چار بنیادی اصول ہیں۔

(۱) ملک کو خدا کی ملکیت و امانت سمجھنا اور ایک دیانت دار امین کی طرح اس کی حفاظت کرنا۔

(۲) رعایا کو اظہار رائے کی پوری آزادی دینا۔

(۳) ملکی انتظامات اور وضع قوانین میں اہل ملک سے مشورہ۔

(۴) انسانی حیثیت سے حاکم و محکوم کا ایک سطح پر آنا۔ اور عدل و انصاف میں دشمن و دوست کا امتیاز مٹا دینا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق رض، حضرت عمر رض، حضرت عثمان رض اور حضرت علی رض نے عملی طور پر جمہوریت کا نفاذ کیا۔ اور آج بھی ہمیں ایسے ہی جمہوری نظام کی ضرورت ہے

(۱) مطبوعہ نگار مئی ۱۹۶۱ء شمارہ ۵

نیاز کے ادبی و تنقیدی مضامین کی اہمیت مسلّم ہے۔ گرچہ تنقید کے سلسلے میں وہ زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہاں مضامین کی حیثیت سے ان پر سرسری تبصرہ کرتی چلوں گی۔ نیاز نے نہ صرف اردو زبان و ادب کی طرف توجہ کی ہے بلکہ ان کی انفرادیت اس میں ہے کہ انہوں نے عربی، فارسی، ہندی، جرمن اور دوسری مغربی زبانوں کے ادب لطیف، شاعری اور مختلف اصناف سے متعلق اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے مضامین "مغربی زبانوں کے ادب لطیف پر ایک سرسری تبصرہ" "فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر" "ہندی شاعری کی تاریخ" "اردو غزل گوئی اور ترقی زبان پر عہد بہ عہد تبصرہ" "غالب کی مثنوی نگاری" "کلام مومن پر ایک طائرانہ نظر" خاص طور پر اہم ہیں۔

"مغربی زبانوں کے ادب لطیف پر ایک سرسری تبصرہ"[1] علمی و معلوماتی مقالہ ہے جس میں چاسر سے بیسویں صدی تک کی انگریزی زبان کے تغیرات اور شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیاز بتاتے ہیں کہ ادب لطیف FINE LITERATURE کی اصطلاح انگریزی زبان میں سب سے پہلے ڈین سوفٹ مصنف "سفر نامہ گولیور" نے استعمال کی۔ تاریخی حیثیت سے انگریزی ادب چھ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(۱) قدیم ترین زمانہ سے لے کر چاسر تک

(۲) چاسر سے عہد نشاۃ الثانیہ تک

(۳) عہد الزبتھ

(۴) دور بازگشت یا RESTORATION

(۵) اٹھارہویں صدی

(۶) انیسویں مابعد

(۱) مطبوعہ نگار [illegible] ۱۹۳۳ء، جلد ۲۳، شمارہ ۴، ۵

شاعری میں چاسر، ملٹن، شیکسپیر، ورڈز ورتھ، کولرج، کیٹس، شیلے، بائرن، کا تذکرہ کرتے ہوئے نیاز نے پھر نثر کی طرف توجہ کی ہے۔ سر والٹر سکاٹ، جین آسٹن، ڈکنس، تھیکرے، جارج ایلیٹ، تھامس ہارڈی، اڈگر ایلن پو کا فنی اعتبار سے مرتبہ متعین کیا ہے۔ مقالے کا دوسرا حصہ جو "نگار" مئی ۱۹۳۳ء میں شائع ہُوا، اس طور پر اہم ہے کہ اُس میں ادبیاتِ فرانسیسی پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

نیاز نے ثابت کیا ہے کہ ادبیاتِ فرانسیسی کی ابتدا گیارھویں صدی سے ہوئی۔ بارھویں صدی میں نظم نگاری کی طرف توجہ کی گئی۔ تیرھویں صدی میں تاریخ نگاری کو فروغ حاصل ہُوا۔ چودھویں صدی قصہ کہانی کی صدی ہے۔ پندرھویں صدی میں تھیٹر کی ابتدا ہوئی۔ سولھویں صدی میں نئی و جدید شاعری کی تحریک شروع ہوئی، اور مضمون نگاری کی صنف کا آغاز ہُوا۔ سترھویں صدی میں ادب اور فلسفہ کی ہم آہنگی کا رواج ہُوا۔ اٹھارھویں صدی میں سائنس سے متعلقہ مسائل کو سہل و آسان زبان میں بیان کرنے کا آغاز ہُوا۔ اور اب موجودہ دور میں سماجی و تہذیبی مسائل کی طرف توجہ کی جا رہی ہے۔ بقول نیاز:

"موجودہ ادبیاتِ فرانس سے جہاں تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رُومانیت اور مادیت دونوں سے لوگ بیزار ہیں اور غالباً کوشش یہ ہے کہ دونوں کے امتزاج و اعتدال سے ایک نئی چیز پیدا کی جائے۔ لیکن ابھی یہ کوشش بارآور نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے ادبیاتِ فرانس نے کوئی مخصوص ہیئت ابھی تک اختیار نہیں کی ہے۔"[۱]

"فارسی زبان کی پیدائش پر ایک مؤرخانہ نظر" علمی و تحقیقی مقالات میں بہت اہم ہے۔ ایران کی تاریخ، تہذیب، ثقافت، نظامِ سلطنت، آب و ہوا، اور ماحول کے اثرات کا تذکرہ

۱۔ "نگار" مئی ۱۹۳۳ء، ص ۲۳، جلد ۲۳، شمارہ ۵

کرتے ہوئے فارسی زبان کی حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالی ہے۔ نیاز کا کہنا ہے کہ جس طرح امتزاجِ عناصر سے دُنیا میں نئی نئی چیزیں پیدا ہو کر نشو و نما پاتی اور فنا ہو جاتی ہیں اسی طرح دُنیا میں قومیں بھی نشو و نما پا کر اوجِ اقبال کو پہنچتی اور مُردہ ہو جاتی ہیں۔ عروج و زوال کا یہ منظر ہر قوم نے دیکھا ہے۔ ہندوستان اور ایران کی تہذیبی و ثقافتی اقدار میں بہت مماثلت ہے۔ ہندوستان میں ہولی منائی جاتی ہے تو ایران میں ایک تہوار "آتش سوز" ہے کہ آگ جلا کر اگنی دیوتا کی پرستش ہوتی ہے۔ ہندوستان میں "دیوالی" اور "بسنت" ہے تو ایران میں "چراغاں روزِ اسفند" اور "جشنِ گل کولی" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان و الفاظ و اصطلاحات میں بھی بہت مماثلتیں ہیں۔ پہلوی زبان پارسیوں کے رسم الخط میں لکھی جائے تو وہ پہلوی ہے۔ اگر عربی رسم الخط میں ہو تو فارسی ہے بالکل اُسی طرح جیسے:

"مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کی جو فصیح ترین زبان خیال کی جاتی تھی، وہ برج بھاشا تھی جس کا اثر ہندوستان کی دیگر زبانوں پر پڑا۔ اور ان زبانوں نے عربی و فارسی کا اثر لے کر جدید لشکری زبان قائم کی۔ جس کو عرفِ عام میں اُردو کہتے ہیں۔ اِسی طرح فارسی، فارس کی زبان تھی جس کا دار الحکومت شیراز ہے اور ایران بھر میں یہیں کی زبان اِسی طرح ٹکسالی کہی جاتی ہے جیسے ہندوستان میں لکھنؤ اور دہلی کی بول چال۔"

اِن تحقیقی انداز سے قطع نظر، نیاز کے تنقیدی مضامین کے متعلق بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تاثراتی تنقید کے [illegible] کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ "فن برائے فن" اور "ادب برائے ادب" کے قائل ہیں۔ اُن کے تنقیدی مضامین عالمانہ شکوہ اور اعلیٰ ذوق کے مظہر ہیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر لفظیاتی مباحث ہیں۔ ظفر، بوش، فراق، مومن اور دوسرے موضوعات پر بھی جو

تنقیدی مضامین ہیں، وہ اُن کے شخصی جذبات و احساسات، نظریات و خیالات کے علمبردار ہیں بقول محمد خورشید عاصم:-

"تمام مضامین خواہ وہ مذہبی مضامین ہوں یا تنقیدی، نیاز کے ذاتی رجحانات و خیالات کے حامل ہیں۔ اور اس طرح جذبات، استدلال سے زیادہ کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ تنقیدی مضامین جو خالص ادبی ہوتے ہیں، اُن میں بھی نیاز اپنی رائے سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ موضوع خواہ غزل ہو یا عام شعر یا بذاتِ خود تنقید، وہ اپنی پسند و ناپسند کو سامنے رکھتے ہیں اور عام مروّجہ اُصولوں کی بہت کم پروا کرتے ہیں۔"[1]

نیاز نے ادب اور تنقید کا ایک نیا زاویہ پیش کیا ہے۔ ان مضامین کی اہمیت اس اعتبار سے بہت ہے کہ اس سے پہلے زبان، لفظ اور معنی کے رشتہ پر اتنی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ نیاز نے یہ واضح کیا کہ لفظ بھی انسان کی طرح جاندار ہوتے ہیں۔ یہ سانس لیتے، جیتے، بگڑتے یا گھٹے ہوئے اور مُردہ ہوتے ہیں۔ اس لیے اِن کے استعمال میں خاص احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ یہ بھی شیشے کے آبگینے ہیں جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ سکتے ہیں۔ نیاز نے اپنے تنقیدی ادبی پیمانے خود مقرر کیے ہیں۔ اور اُنہی کے مطابق فیصلے کیے ہیں، ان فیصلوں میں جذباتی جانبداری کا رویہ ملتا ہے جو ایک مضمون نگار کے ہاں نہیں ہونا چاہیے۔

نیاز نے متفرق موضوعات پر مضامین لکھے، جن میں فلسفہ، مابعد الطبیعیات، مناظرِ فطرت سیاسی و سماجی مسائل شامل ہیں۔ لیکن ان کی زیادہ تر اہمیت ان کے مذہبی، ادبی و تنقیدی مضامین کی وجہ سے ہے۔ یہ مضامین اپنے تمام تر فنی لوازمات کے ساتھ منظرِ عام پر آتے ہیں۔ ان مضامین کا اُسلوب برجستہ و رواں ہے۔ بے تکلفی و سادگی سے اپنے ذہن میں گزرنے والے تمام خیالات

[1]: "نیاز بحیثیت مقالہ نگار" نگار۔ نیاز نمبر حصہ اوّل ص ۲۶۷

کا اظہار کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ خیالات خالصتاً شخصی و انفرادی ہوتے ہیں لیکن نیاز ان کے اظہار میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے۔ ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی الفاظ کا خوبصورت برمحل استعمال ملتا ہے۔ کہیں کہیں مشکل الفاظ اور فلسفیانہ اصطلاحات بھی ملتی ہیں، جن سے نیاز کی علمیت کی دھاک تو بیٹھ جاتی ہے لیکن مطلب تک پہنچنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنی ذات اور علم کی برتری کا رُعب جمانا چاہتے ہیں چنانچہ یہ مضامین تشہیرِ ذات کا مظہر بن جاتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر انور سدید کی رائے ہے:۔

نیاز کے مضامین میں انکشافِ ذات کے بجائے تشہیرِ ذات کا زاویہ نمایاں ہے، وہ جذبے کی طغیانی صورت کو قاری پر آشکار کرنے کے آرزومند ہیں جس سے انشائیے کا مزاج دب جاتا ہے اور انشائے لطیف کی جذباتی طرز نگی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔"

(انشائیہ اُردو ادب میں: ص ۱۴۴۔ بار اوّل جنوری ۱۹۸۵ء مکتبہ فکر و خیال۔ لاہور)

یہ بات بہت حد تک درست ہے نیاز انشاپردازی اور لفظوں کے جادو میں مضمون کی اصل اہمیت و افادیت اور اُس کے صحیح و سچے مقصد سے ہٹ جاتے ہیں اور یہ انداز انشاپردازی کے اعتبار سے تو صحیح ہے لیکن مضمون نگاری کے فن کے منافی ہے۔ خیالات، لفظ کا جامہ اوڑھ کر دریا کی تُند و تیز رَو کی طرح بہتے چلے آتے ہیں:۔

"خدا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے مانگو، چاند کے ایاب و ذہاب سے پوچھو، آبشاروں کی روانی اور دشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو۔ پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔ موسموں کا باقاعدہ تغیر و تبدل، بہار و خزاں کا ظہور و خفا، نباتات کی بوقلمونی، وحوش و طیور کی طبیعی رنگینی، نوعِ انسانی کا قولِ منہ، فضائے بسیط کے ستارے کائنات کی لا نہایت وسعت، خور و شبنم، ذرہ و آفتاب اور ان سے

بھی فزو تر انسانی مساعی کی مختلف صورتیں، جن کا نام ہم نے علم طبقات الارض، علم النجوم، علم الافلاک، علم الکیمیا، علم وظائف الاعضاء، علم الحیات نفسیات وغیرہ رکھا ہے، بتا ہیں کہ کوئی ایسی قوت ہے جس کو سمجھنے کے لئے ہم اپنی عقل کو عاجز و بے بس پاتے ہیں۔"[1]

نیاز دلچسپی کے عنصر کو ہر جگہ برقرار رکھتے ہیں اور ہر بات نئے انداز میں کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیاز کے مضامین اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے بھی اور اسلوب کی انفرادیت و دلکشی کے باعث بھی۔ ان کے مضامین میں تبحرِ علمی بھی ہے اور بلند تخیل بھی۔ انشاپردازی کی شان بھی ہے، اور فن کی دلکشی و پختگی بھی۔ شاعر کا حساس ذہن بھی ہے اور فلسفی کا سنجیدہ تفکر بھی۔ جذبہ کا شور و تلاطم بھی ہے اور منطق کا وقار و متانت بھی۔ یہی وہ اوصاف ہیں جن کے سبب نیاز کے مضامین کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہی کی بدولت ان کا ماہنامہ نگار علمی و ادبی روایت کا امین و علمبردار قرار پایا۔ اور انہی کے سبب اُن کے قلم کو دنیائے فکر و فن میں مقام اعتبار و استناد حاصل ہوا۔

---

[1] لہ: خدا ہے یا نہیں، من یزداں ص ۹

باب ۹

نیاز کا مرتبہ اُردو زبان و ادب میں

نیاز فتح پوری، ایک ہمہ جہت اور رنگارنگ شخصیت کے مالک ادیب ہیں۔ بجائے خود انہیں فکر و شعور اور ذکاوت و ذہانت کی غیر معمولی قوتیں عطا کی تھیں۔ حق گوئی و بے باکی اُن کی شخصیت کے جوہر خاص تھے۔ اُنہوں نے عمر بھر عقلیت، روشن خیالی، آزادی رائے اور جدتِ فکر کی قندیل روشن کئے رکھی۔ جراتِ اظہار، وسعت مطالعہ اور تامل و تفکر نے اُن کی شخصیت کو ایک ادارہ، ایک تحریک اور ایک دبستان بنا دیا تھا۔ وہ فرد واحد نہیں بلکہ اپنی مختلف النوع صلاحیتوں کی بنا پر ایک انجمن تھے۔ ادیب ہی نہیں ادیب گر تھے۔ انہوں نے نوجوان نسل کے ادیبوں کی ایک بڑی کھیپ کو آگے لانے اور اُن کا حوصلہ بڑھانے میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ زندگی بھر تنگ نظری، توہم پرستی اور کٹھ ملائیت کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ اور تنگ نظری و جہالت کے ہر چیلنج کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے رہے۔ انہیں اپنے ذہن اور اپنی رائے دونوں پر طبعاً اعتماد تھا، ناموافق حالات اور مخالفتوں کے زور نے اس اعتماد کو کچھ اور طاقتور بنا دیا تھا۔

سرسیّد احمد خاں کے بعد نیاز اُردو کے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے اُردو زبان و ادب میں عالمانہ شان پیدا کی۔ اُنہوں نے اُردو میں مختلف علوم و فنون کا رس گھولا۔ کہ اُردو زبان میں وسعت و توانائی کے بالکل نئے آثار پیدا ہوئے، اور وہ دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے لائق ہوگئی۔ چنانچہ آج اس میں وہ لچک اور وسعت موجود ہے جو ترقی یافتہ زبانوں کا خاصا ہے۔

نیاز کے طویل ادبی سفر، افسانہ سے لے کر تنقید، مکتوبات، مقالہ جات، تراجم، تاریخ، مذہب، صحافت و انشاپردازی تک کے نشانات کو دیکھتے ہوئے ہم یہ نتیجہ بآسانی نکال سکتے ہیں کہ مجموعی طور پر نیاز کی تمام تر تحریروں کا موضوع زندگی، محبت، انسان دوستی، خوش آئند مستقبل کی تلاش، اس تلاش میں رجائیت کے سوا، مایوسی و افسردگی کا کہیں دخل نہیں ہے۔ اُن کے قلم میں ایسا جوش اور ولولہ موجود ہے جو پڑھنے والوں کو جرأت، جد و جہد اور زندگی کی پُرپیچ ناہمواریوں کو خوش اُسلوبی سے پھلانگنے کا درس دیتا ہے۔ زندگی کے سنگین حقائق کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے خواب، رُومان اور تخیّل کی دلکش دُنیا کے چمکتے رنگوں کو بھی پیش کیا ہے۔ یُوں زندگی اپنی تمام تر وسعتوں اور توانائیوں کے ساتھ نیاز کی تحریروں میں در آتی ہے۔ موضوع کی اس رنگا رنگی میں اُن کے یہاں، مذہب کو خاص اہمیت و عظمت حاصل ہے۔

نیاز کے تخلیقی سفر کی ابتدا شاعری اور افسانہ نگاری سے ہوئی۔ نیاز فتح پوری اوّل اوّل ایک رُومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔ قارئین اُن کے افسانوں کا شدت سے انتظار کرتے۔ رُومان اور عشق و محبت، عورت کے جسمانی و رُوحانی حُسن کا بیان، مرد اور عورت کی ایک دوسرے کے لئے کشش، جیسے موضوعات نے رُومانوی تحریک کو بہت تقویت بخشی۔ ان موضوعات کے ساتھ ساتھ نیاز نے یونان کی دیومالائی کہانیوں کو تخیّل اور حقیقت کے خوب صورت امتزاج کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان افسانوں میں حقیقت کا عنصر اس طور پہ ملتا ہے کہ ان کے کردار باوجودیکہ دیوی، دیوتا ہیں لیکن اُن کا عمل، حرکات و سکنات،

جذبات محبت کا اظہار، حسد اور رکاوٹیں، ہمارے عام سماجی رویوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔

نیاز نے ناولٹ کی صنف کو بھی متعارف کرایا۔ نیاز کے ناولٹ اور افسانوں میں مثالی اور تخیلاتی دُنیا کے ساتھ ساتھ گرد و پیش کی زندگی کے مسائل اور تلخ حقیقتیں بھی موجود ہیں۔ سماجی و طبقاتی ناہمواری، مذہب کے نام پر استحصال اور نفسیاتی اُلجھنیں ایک خاص سلیقے اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہیں۔ نیاز نے اپنی فطری شوخی سے ایک خاص کام لیا ہے اور اپنی انشائیہ نما تحریروں میں مُلاؤں پر طنز و تنقید کی ہے۔ ایسے مقامات پر اُن کے قلم میں تلخی اور حقیقت نگاری کا عنصر بھی ملتا ہے۔

نیاز نے انشائے لطیف کے فروغ میں بھی نمایاں حصّہ لیا۔ چنانچہ اُن کے اُسلوب میں ایک خاص طرح کی دلکشی، رعنائی، شگفتگی اور دل موہ لینے والی کیفیت ہے۔ لفظوں کے استعمال کا ایک خاص قرینہ۔ اس قرینے میں رُومان بھی ہے اور شعریت بھی۔ رنگینی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ نیاز کے افسانے موضوعاتی دلکشی کے ساتھ ساتھ اپنی خوب صورت انشاپردازی کے سبب بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ گو آج کے سائنسی، مشینی، مادی اور حقیقی دور میں دیومالائی اور تخیلاتی کہانیوں کا رواج نہیں رہا۔ رُومانیت سے زیادہ حقیقت پسندی اور علاقیت پہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود نیاز کے افسانے اپنے زندہ اُسلوب اور دلکش انشا کی وجہ سے کسی طور پہ بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ نیاز نے فنون لطیفہ کو فطرت کا حسین تحفہ قرار دیا ہے اس لئے کہ وہ رُوحانی، جمالیاتی اور جذباتی طور پر مسرت و تسکین بخشتے ہیں۔ اُن کا یہی نظریہ اُن کی تنقیدات میں تاک جھانک لگائے رہتا ہے۔

اُردو ادب میں نیاز سے پہلے مختلف علوم و فنون پر ناقدانہ نظر ڈالنے کا رواج خال خال تھا لیکن نیاز نے اس پہلو کو بطور خاص اپنایا۔ مختلف علوم و فنون، تاریخ، مذہب، اخلاقیات، عمرانیات، صحافت، تہذیب و کلچر، موسیقی و مصوری کے اُصول و ضوابط متعین کرکے ساتھ ساتھ اُن کے تدریجی ارتقاء کو بھی پیش کیا ہے۔ ویسے نیاز، خالص رُومانی و جمالیاتی

نقاد ہیں۔ وہ "ادب برائے ادب" یا "فن برائے فن" کے قائل ہیں۔ اسی لئے اُنہوں نے ادب کے ظاہری حُسن اور تاثراتی انداز کی طرف توجہ کی ہے۔ ادب، اجتماعی زندگی پہ جو دُور رس اور قوی اثرات و نتائج مرتب کرتے ہوئے زندگی کا رُخ بدلتا ہے، وہ اُس کے قائل تو تھے لیکن ادب کو محض اخلاقیات اور موعظہ و پند کا ذریعہ بنا دینے کو جائز نہیں سمجھتے۔ ادب کی سب سے بڑی خوبی اُن کے نزدیک یہ ہے کہ وہ انسانی جذبات میں تحریک پیدا کرے۔ اُن کے نزدیک شعر و ادب کسی نہ کسی پیغام کو تو ضرور پیش کرتے ہیں لیکن یہ لازمی نہیں کہ وہ پیغام مادی اعتبار سے بھی مفید اور ضروری ہو۔ گویا نیاز ادب کو محض عقلیت، مقصدیت یا افادیت کا ذریعہ قرار نہیں دیتے بلکہ اسے لذت اندوزی، سُرور و انبساط اور ذہنی تفریح کا وسیلہ سمجھتے ہیں چنانچہ اُن کی تنقید جمالیاتی و تاثراتی دبستان کے ضمن میں آتی ہے۔ جس میں حُسن آفرینی، حُسن کاری مسرت و جمالیات کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ نیاز، تنقید میں بھی جدت و ندرت کے قائل ہیں۔ اسی لئے کبھی کبھی ایسے علمی و ادبی انکشافات کرتے ہیں جو چونکا دینے والے ہوتے ہیں۔ نیاز کو تنقیدِ شعر سے خاص شغف تھا۔ اسی لئے اُنہوں نے تجزیاتی طریقِ کار اختیار کرتے ہوئے لسانی و معنوی تنقیحات کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ عصری ادب اور ہم عصر شعراء پہ بے لاگ و بے باک رائے دینے کا انداز بھی نیاز ہی نے اختیار کیا۔ نیاز کی زبان و لسانیات، اسالیب کے مزاج اور الفاظ کی صحت و عدم صحت پر گہری نظر تھی۔ اس لئے اُنہوں نے اپنی عملی تنقید کے ذریعے نہ صرف غالب اور مومن جیسے شعراء کی گرفت کی ہے بلکہ اپنے ہم عصر شعراء کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ حالانکہ ہم عصر شعراء کے کلام پر تنقید یقیناً ایک نازک اور مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ تنقید لسانی اور لفظیاتی اصلاح پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کی اہمیت یوں ہے کہ زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت، لفظوں کی صحیح شناخت و پہچان کے بغیر اعلیٰ ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ نیاز [illegible] سے معتبر ہیں

اُن میں اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن اس کے باوجود تفکر و تامل اور ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے۔

مکتوبات کی دُنیا میں بھی نیاز کو ایک منفرد اور اہم مقام حاصل ہے۔ اگرچہ ان خطوط کے تمام مکتوب الیہم واضح طور پر سامنے نہیں آسکے اور ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ کون سا خط کس کے نام لکھا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں نہ تو القاب و آداب اور دوسری معلومات مثلاً وقت مقام، اور تاریخ ملتی ہیں۔ اس کے باوجود اُن کے مکتوبات اپنی سادگی، بے ساختگی، شگفتگی معصومیت، علم افروزی، سنجیدگی اور شوخی کی وجہ سے اہلِ ادب کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ان کے خطوط میں پُرخلوص جذبات کی شدت، احساس کی گہرائی اور محبتوں کی خوب صورت کہانیاں ملتی ہیں۔ اپنی شعریت و رُومانویت، تخیل کی نزاکت، رعنائی اُسلوب و انشاپردازی کی وجہ سے ان خطوط میں افسانے اور شعر و نغمہ کا سا حُسن ہے۔ ان خطوط میں وقار، متانت و سنجیدگی بھی ہے اور شوخی و ظرافت بھی۔ ان میں نہ صرف ادب کی مختلف اصناف سے متعلق مشورے دیئے گئے ہیں بلکہ زندگی کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے خلاف کُھلا ہُوا اور باوقار احتجاج بھی کیا گیا ہے۔ اس احتجاج میں مزاح و طنز ہے لیکن اس طنز و مزاح میں بھی گہری سنجیدگی و تفکر ملتا ہے۔ موضوع کیسا ہی کیوں نہ ہو اُن کا اظہار بے ساختہ اور فطری ہوتا ہے۔ موضوع سے قطع نظر مکتوبات نیاز اپنے پُرکشش اُسلوب اور انشاپردازی کی وجہ سے بھی قابلِ توجہ ہیں۔ اُن کے قلم میں مصوّر کی سی نفاست و نزاکت ہے۔ لفظوں کے انتخاب میں خاص احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ سادگی و صنعت گری ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تاریخی حوالے و تلمیح اور لفظی پیکر تراشی عبارت کے حُسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ اشعار کے بے ساختہ اور برمحل استعمال نے مکتوبات کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں "قمر زمانی" کے خطوط خاص طور پر توجہ کے لائق ہیں۔

صحافت کی دُنیا میں بھی نیاز فتح پوری ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ بطور صحافی اُن کا قلم

ہمیشہ حقیقت نگار، بے باک، توانا، سچا اور غیر جانبدار رہا ہے"۔ "نگار" کے ذریعے صحافت میں وہ ایک ترقی پسند اور جرأت مندانہ روایت کو لے کر آگے بڑھے۔ نیاز صحیح معنوں میں ایک عالم تھے۔ فنونِ لطیفہ، ادب، سائنس، مذہب، فلسفہ، سیاست، اقتصادیات اور عصرِ حاضر کے مسائل پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اسی لیے اُن کی فکر انگیز اور معلومات افزا صحافتی تحریروں نے اہلِ علم و دانش کو چونکا دیا۔ روشن خیالی، وسیع النظری اور غیر جانبداری اُن کی صحافت کے ایسے اوصاف ہیں جنہوں نے "نگار" کو محض ایک ادبی ماہنامہ نہیں بلکہ ایک تحریک، ایک ادارہ اور ایک دبستانِ فکر بنا دیا۔ "ملاحظات"، "باب الاستفسار" اور "باب الانتقاد" جیسے اہم کالموں میں علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی، سائنسی، نفسیاتی اور معلوماتِ عامہ جیسے موضوعات زیرِ بحث آتے۔ اکثر قارئین انہی اہم کالموں کی وجہ سے حلقۂ نگار سے وابستہ ہوئے تھے کیونکہ نیاز نے روایاتی اور رجعت پسندانہ رویوں کے مقابلے میں ہمیشہ مثبت اور ترقی پسندانہ راہوں کو اپنایا۔ آزادیٔ رائے اور حریتِ قلم کی جیسی پاسداری اُنہوں نے کی ہے، ذرا کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں قومی تشخص، ذہنی بیداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے میں نیاز کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

"ملاحظات" یعنی "نگار" کے اداریوں کی مدد سے اُس دور کی سیاسی، سماجی، اور ادبی تاریخ بڑی آسانی سے مرتب کی جا سکتی ہے۔ نیاز کی خوبی یہ ہے کہ مسائل خواہ کسی بھی شعبے سے متعلق رہے ہوں، اُن کا قلم ہمیشہ معقول، معتدل اور متوازن رہا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم، اُس کا پس منظر، اسباب و محرکات، مدوجزر، بڑی طاقتوں کی سیاسی چالیں اور جنگ کے اثرات و نتائج بھی بہت بے باکی اور غیر جانبداری کے ساتھ "نگار" کا موضوع رہے۔ مختلف سیاسی و سماجی تحریکیں، اُن کے مثبت و منفی پہلو بھی منظرِ عام پر لائے۔ آزادیٔ رائے اور حریتِ قلم کا یہ اہم رویّہ "نگار" کے علاوہ اُس دور تو کیا آج بھی کسی ادبی رسالے میں نظر نہیں آتا۔ علاوہ ازیں "نگار" کے خاص نمبروں نے تحقیق و تنقید اور ادبی صحافت کا معیار بلند کیا۔

نئی نسل کے ادباء، شعراء اور مفکرین کی ذہنی تربیت میں "نگار" اور نیاز کے صحافتی قلم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ حریتِ قلم، آزادیٔ فکر اور جرأتِ اظہار کی جو بنیاد نیاز نے ڈالی تھی یہ اُسی کا فیضان ہے کہ "نگار" آج بھی ایک خاص معیار و مزاج کے لیے ہر ماہ پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ برصغیر کے رسائل و جرائد میں یہ افتخار بھی "نگار" ہی کو حاصل ہے ورنہ متعدد پرچے بڑی آن بان کے ساتھ شائع ہوئے اور نیاز جیسا مستقل مزاج اور قوتِ ارادی رکھنے والا مدیر نہ رکھنے کے باعث بند ہو گئے۔

نیاز، مقالہ نگار کی حیثیت سے بھی بہت کامیاب رہے۔ مذہبی، سماجی و تاریخی، علمی و ادبی ہر طرح کے مضامین میں اُنہوں نے خالصتاً تفکّر و تعقّل کو اپنایا ہے۔ اپنے مذہبی مضامین کے ذریعے اُنہوں نے نام نہاد عالموں اور "مولوی" کے خلاف بھرپور جہاد کیا ہے جنہوں نے مذہبِ اسلام کو محض روایاتی باتوں اور تنگ نظری کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے جن کا عقل و استدلال کی دُنیا سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسلام ایک ترقی پسند اور مکمل مذہب ہے جو ظاہری و خارجی عبادات سے زیادہ پاکیزگیٔ نفس، انسانیت اور اخلاقیات پر زور دیتا ہے۔ لیکن مُلّاؤں نے اس کی اصلیت کو خاصا مسخ کر دیا ہے۔ نیاز کے ترقی پسندانہ نظریات کو نئی نسل نے بڑی خوش دلی سے قبول کیا۔ اپنے مذہبی مضامین میں انہوں نے بڑے منطقی، سائنسی، اور فلسفیانہ انداز میں مختلف اختلافی مسائل پر بحث کرتے ہوئے مثبت اور کافی حد تک قابلِ قبول نتائج نکالے ہیں۔

نیاز اپنے تاریخی مضامین میں ایک کامیاب مؤرخ و محقق نظر آتے ہیں۔ علمی و ادبی مضامین میں سنجیدہ تفکّر ہے۔ وہ دلائل و براہین سے بات کرتے ہیں۔ تبحرِ علمی بھی ہے اور بلند تخیّل بھی۔ لیکن کہیں کہیں گہری جذباتیت اور خطابت کا جوش بھی ملتا ہے۔ سکون اور نرمی کے ساتھ ساتھ طنزیہ انداز بھی موجود ہے۔ ادبی و تنقیدی مضامین عموماً تاثراتی تنقید اور "فن برائے فن" کے نظریے کے تحت لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان کے نظریاتی مباحث میں

محققانہ شان بھی ملتی ہے۔
نیازؔ کے مضامین کا اُسلوب سادہ و رواں ہے۔ انگریزی، عربی، فارسی اور ہندی الفاظ
کا بے ساختہ اِستعمال کیا ہے۔ لیکن اکثر رُومانی اور جمالیاتی انداز بھی اختیار کرتے ہیں جس
سے نیازؔ اِنشا پردازی اور لفظوں کے جادو میں مضمون کی اصل اہمیت و افادیت اور اِس کے
صحیح و حقیقی مقصد سے ہٹ جاتے ہیں تاہم اُن کے مضامین کی اہمیت و افادیت سے
اِنکار نہیں کیا جا سکتا۔

زبان اور لسانیات، نیازؔ کا پسندیدہ موضوع تھا وہ نہ صرف اُردو بلکہ انگریزی، عربی
فارسی، ہندی اور تُرکی بھی جانتے تھے۔ اِس لیے اُنہوں نے دوسری زبانوں کے اعلیٰ
ادب پاروں کو اُردو میں اِس طرح مُنتقل کیا ہے کہ اُن کا اصل حُسن برقرار رکھا ہے بلکہ بعض
جگہوں پہ نیازؔ کا ترجمہ اصل سے بھی بڑھ گیا ہے۔ اِس میدان میں بھی اُنہوں نے اپنی ذہانت
فنکارانہ صلاحیت، سنجیدگی اور نُدرت کو منوایا ہے۔ اُن کے تراجم میں شاعری، مذہب
تاریخ، فلسفہ و نفسیات اور ادب و اِنشا ہر طرح کے موضوعات شامل ہیں۔ نیازؔ اصل
فن پارہ کی رُوح کی گہرائیوں کو محسوس کرنے کے بعد لفظوں میں ڈھالتے ہیں۔ اِس لیے اُن کا
لفظ لفظ دل و ذہن میں اُتر جاتا ہے۔ اِن تراجم کے ذریعے نیازؔ دراصل یہ ثابت کرنا چاہتے
ہیں کہ اُردو زبان اپنی ساخت کے اعتبار سے اِتنی وسعت اور لچک رکھتی ہے کہ
دوسری زبانوں کی موضوعاتی نزاکتوں اور بیان کی جدت و نُدرت کو اپنے اندر سمو سکے۔ اِس
سلسلے میں تھامس ولیم بیل کی An Oriental Biographical Dictionary
کا جو ترجمہ نیازؔ نے پیش کیا ہے، خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اہم کتاب ابھی تک اُردو
میں شائع نہیں ہوئی۔ یہ تراجم ثابت کرتے ہیں کہ نیازؔ مختلف زبانوں پر کامل عبور رکھنے کی
وجہ سے ایک کامیاب مترجم ہیں۔

نیازؔ فتح پوری اپنی رنگا رنگ شخصیت اور ہمہ جہتی ادبی حیثیتوں یعنی افسانہ نگار، نقاد،

صحافی، مقالہ نگار، مکتوب نویس، اور مترجم ہونے کے سبب بیسویں صدی کے مقبول ترین
ادیب ہیں۔ بحیثیت مجموعی اُن کی عظمت اِس میں ہے کہ اُنہوں نے اُردو زبان کو عالمانہ وقار
عظمت عطا کی ہے۔ اُنہوں نے مختلف علوم و فنون کا ادب سے گہرا رشتہ اُستوار کیا ہے۔ اِس
ضمن میں سرسیّد کے بعد اُن کی خدمات کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُنہوں نے مذہب
اور مذہبی اُمور کو خاص علمی اور ادبی انداز میں پیش کیا ہے۔

نیازؔ کے یہاں زندگی یک رُخی نہیں ہمہ رُخ ہے۔ ادب بھی زندگی کا ترجمان ہونے
کی حیثیت سے ہمہ جہت ہے۔ کوئی ادب پارہ زندگی کی جتنی وسعتوں اور گہرائیوں کو
اپنے اندر سموئے گا۔ اُسی نسبت سے اُس کی اثر پذیری میں وسعت پیدا ہوگی۔ نیازؔ بیسویں
صدی میں واحد ادیب نظر آتے ہیں جنہوں نے علم و فن کے مختلف شعبوں پر قلم اٹھایا اور
اِس انداز سے کہ صاحبانِ فکر و نظر اختلافِ رائے کے ساتھ ہی سہی، اُن کی تحریروں کی جانب
متوجہ ہوئے اور اِس توجہ نے اُردو ادب کو توسیع کا مزاج عطا کیا۔

صحافی، ادیب اور علمی مقالہ نگار تینوں حیثیتوں میں نیازؔ نے فکر و ذہن کی حریت کا پرچم
بلند کیا۔ جو کچھ جس طرح سمجھا من و عن اُسی طرح کاغذ پہ منتقل کر دیا۔ بعض رسائل میں اختلافِ
رائے ہُوا، شور مچا، کُفر کے فتوے صادر کیے گئے، قتل کی دھمکیاں دی گئیں نگار کی خریداری
رُکوا دی گئی لیکن اُنہوں نے قلم کی حریت اور آزادی پر حرف نہیں آنے دیا۔

ادیب و فن کار عام طور پر خالص ادب سے متعلق تحریروں میں دل کش اُسلوبِ نگارش
پیدا کرتے ہیں لیکن خشک موضوعات علمی، فقہی، تاریخی مسائل پہ گفتگو کرنا اور اپنے اُسلوب
خاص کی چھاپ ہر تحریر پہ لگائے رکھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ نیازؔ کے مکتوبات
افسانے، ادبی مقالات اور تنقیدات سے الگ اُن کی ساری تحریروں میں ایسی تخلیقی شان
ہے کہ ہر تحریر کو دلچسپی اور چٹخارے کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے
ابتدائی چند برسوں میں ملازمت کے بعد صرف ادب اور صحافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا

بنالیا۔ نگارؔ کی معرفت زندگی بھر قلم چلاتے رہے اور قلم کی ہی مزدوری کی۔ قلم کے اس دشوار گذار سفر میں خراب سے خراب حالات میں بھی انہوں نے نظریات، اُصول اور رعایت کا سودا نہیں کیا۔ نتیجۃً اپنے ہم عصر ادیبوں میں موضوع کے تنوع کے ساتھ ساتھ انہوں نے جس بڑی مقدار میں تحریری کارنامے یادگار چھوڑے ہیں، بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ٹھوس، علمی و ادبی موضوعات پر اتنا ڈھیر سا لکھا ہو۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں کی اچھی طباعت و اشاعت کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ چند کتابیں شائع ہوئیں وہ بھی بہت خراب صورت میں۔ نیازؔ کے کچھ اہم قلمی نسخے مجھے قومی عجائب گھر کراچی میں دیکھنے کو ملے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے :۔

۱۔ قواعدِ زبان ترکی :۔ یہ مختصر رسالہ ترکی زبان کی گرامر اور قواعد پر مشتمل ہے جو نیازؔ نے ۱۹۱۸ء میں مرتب کیا۔

۲۔ مجموعۂ مصادر فارسی مفرد و مرکب :۔ یہ مجموعہ مفرد و مرکب فارسی مصادر پر مشتمل ہے جو نیازؔ نے ۱۹۳۵ء میں مرتب کیا۔

۳۔ فرہنگِ فارسی :۔ یہ فرہنگ سولہ سو چونسٹھ (۱۶۶۴) الفاظ پر مشتمل ہے اور ردیف وار ۱۹۴۰ء میں مرتب کی گئی ہے۔

۴۔ رسالہ آئینۂ عروض :۔ اس مختصر رسالے میں عروض و بحور سے متعلق اہم معلومات ملتی ہیں۔ محیط، مختص، مضارع، متدارک، متقارب، متقارب مثمن، رجز، ہزج کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہ

رسالہ ۱۹۲۹ء کا مرتب کردہ ہے۔

۵۔ مختصرات :۔ یہ رسالہ ۱۹۵۰ء میں مرتب کیا گیا۔ اس مختصر رسالے میں علمی، ادبی، تاریخی، جغرافی و تصنیفی معلومات ملتی ہیں۔

علاوہ ازیں نیازؔ کی ایک مختصر بیاض بھی موجود ہے جس سے اُن کے شاعرانہ مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

نیازؔ کی تحریروں کا بڑا حصہ نگارؔ کے صفحات میں ہی بکھرا پڑا ہے۔ اور علم و فن کے مختلف موضوعات پر اگر اُن کے مقالات جمع کیے جائیں تو کئی درجن کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ گویا مقدار و معیار اور موضوع کے تنوع تینوں رُخوں سے نیازؔ نے اُردو کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اُن کے ہم عصروں میں اس باب میں شاید ہی اُن کا کوئی حریف کہا جا سکے۔

نیازؔ کی آزادیٔ فکر کا ایک قابلِ ذکر رُخ یہ تھا کہ وہ نئی نسل اور نئی تحریروں کی دل و جان سے قدر کرتے تھے۔ اُن کو آگے بڑھانے میں اُنہوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ نتیجۃً ہم عصر کے علاوہ اُن کے بعد کی نسل کے ادیب و شاعر خصوصاً وہ ادیب و شاعر جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ اور اُس کے زیرِ اثر سامنے آئے۔ وہ سب نیازؔ کی فکر اور تحریر سے متاثر ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے سارے بڑے ادیبوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر نیازؔ فتح پوری اپنے حق گو اور صداقت نگار قلم کے ذریعے برِصغیر کی فضا پر چھائے ہوئے تعصب، خوف، تنگ دلی، تنگ نظری، طبقاتی منافرت اور تمدنی ناہمواری کو پہلے ہی دُور نہ کر دیتے تو ترقی پسند تحریک اتنی تیزی سے آگے نہ بڑھتی۔ بلاشبہ علامہ نیازؔ فتح پوری ایک ہمہ جہت عظیم فن کار ہیں۔ اُردو زبان و ادب کی تاریخ اُن کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

کتابیات

مخطوطات

علامہ نیاز فتح پوری ۱۹۳۶ء

آئینۂ عروض رسالہ		
خطوط بنام مریم زت		
خطوط بنام فرمان فتح پوری ڈاکٹر		
خطوط بنام مالک رام		۱۹۳۰ء
فرہنگ فارسی	مرتبہ علامہ نیاز فتح پوری	
قواعد زبان ترکی		۱۹۱۹ء
مجموعۂ مصادر فارسی مفرد مرکب		۱۹۳۶ء
مختصرات		۱۹۵۰ء
مکتوبات قمر زمانی بیگم بنام دلگیر		۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۱ء

نگارشات علامہ نیاز فتح پوری

انتقادیات حصہ اول	طبع دوم ۱۹۵۱ء	مکتبہ معین الادب لاہور
انتقادیات حصہ دوم	طبع اول ۱۹۴۴ء	نگار بک ایجنسی لکھنؤ
اصحاب کہف	طبع اول ۱۹۳۶ء	ایضاً
ایک شاعر کا انجام	طبع اول ۱۹۱۳ء	ایضاً
تاریخ الدولتین	طبع دوم ۱۹۳۱ء	ایضاً
تاثرات نیاز	طبع دوم ۱۹۴۳ء	نگار بک ایجنسی لکھنؤ
ترغیبات جنسی	طبع دوم ۱۹۴۳ء	ایضاً
جذبات بھاشا	طبع اول ۱۹۴۹ء	ادارہ ادب العالیہ کراچی
جمالستان	طبع اول ۱۹۴۳ء	عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد
جھانسی کی رانی	طبع اول ۱۹۳۵ء	نگار بک ایجنسی لکھنؤ
چند گھنٹے حکمائے قدیم کی روحوں کے ساتھ	طبع اول ۱۹۳۶ء	ایضاً
حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے	طبع اول ۱۹۴۳ء	ایضاً
شبنمستان کا قطرۂ گوہریں	طبع اول ۱۹۶۰ء	ادارہ ادب العالیہ کراچی
شہاب کی سرگزشت	طبع دوم ۱۹۴۳ء	ایضاً

صحابیات	طبع اول ۱۹۵۶ء	نفیس اکیڈمی کراچی
عرض نغمہ	طبع اول ۱۹۱۶ء	جمال پریس دہلی
فراست الید	طبع اول ۱۹۲۶ء	نگار بک ایجنسی لکھنؤ
گہوارۂ تمدن	طبع اول ۱۹۴۵ء	دارالطبع الدین پریس لکھنؤ
مالہ وماعلیہ	طبع اول ۱۹۴۵ء	نگار بک ایجنسی لکھنؤ
مجموعۂ استفسارات وجوابات حصہ اول	طبع اول ۱۹۳۶ء	ایضاً
مجموعۂ استفسارات وجوابات حصہ دوم	طبع اول ۱۹۳۶ء	ایضاً
مجموعۂ استفسارات وجوابات حصہ سوم	طبع اول ۱۹۳۵ء	ایضاً
محمد بن قاسم سے بابر تک	۱۹۶۱ء	نسیم بک ڈپو لکھنؤ
مختارات نیاز	طبع اول ۱۹۲۶ء	نگار بک ایجنسی لکھنؤ
مذہب اور مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ	طبع اول ۱۹۴۳ء	ایضاً
مذاکرات نیاز	طبع دوم ۱۹۴۲ء	یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ
مسائل شرقیہ	طبع اول ۱۹۳۶ء	نگار بک ایجنسی لکھنؤ
مشکلات غالب	طبع اول ۱۹۶۲ء	نگار پاکستان کراچی
مکتوبات نیاز حصہ اول	طبع اول ۱۹۳۶ء	نگار بک ایجنسی لکھنؤ
مکتوبات نیاز حصہ دوم	طبع اول ۱۹۴۳ء	ایضاً
مکتوبات نیاز حصہ سوم	طبع اول ۱۹۴۵ء	ایضاً
من و یزداں حصہ اول	طبع دوم ۱۹۴۷ء	نسیم بک ڈپو لکھنؤ
من و یزداں حصہ دوم	طبع اول ۱۹۵۰ء	نگار بک ایجنسی لکھنؤ
نقاب اٹھ جانے کے بعد	طبع اول ۱۹۲۶ء	ایضاً
نقش ہائے رنگا رنگ	طبع اول ۱۹۲۹ء	ایضاً
نگارستان	۱۹۳۹ء	ایضاً

دیگر مصنفین کی کتابیں

آفتاب احمد صدیقی	شبلی ایک دبستان	۱۹۷۰ء ایجوکیشنل پریس کراچی
آل احمد سرور	تنقیدی اشارے	۱۹۶۳ء اردو اکیڈمی سندھ کراچی
احسن فاروقی ڈاکٹر	ناول کیا ہے؟	طبع دوم ۱۹۶۲ء ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
اشتیاق حسین ڈاکٹر	پاک و ہند کی ملت اسلامیہ	شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی کراچی

8620

امداد صابری	تاریخ صحافت اردو جلد چہارم پنجم	طبع اول ۱۹۷۳ء یونین پریس دہلی
امیر چند بہار	نسیم مغرب	طبع اول ۱۹۶۷ء انجمن ترقی اردو ہند دہلی
امیر عارفی ڈاکٹر	نیاز فتح پوری	طبع اول ۱۹۷۵ء انجمن ترقی اردو ہند دہلی
جمیل جالبی ڈاکٹر	ارسطو سے ایلیٹ تک	طبع اول ۱۹۷۵ء نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی
رابندر ناتھ ٹیگور	گیتان جلی	لندن ۱۹۳۴ء
سجاد حیدر یلدرم	خیالستان	دسمبر ۱۹۶۸ء مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
سیدہ جعفر ڈاکٹر	اردو مضمون کا ارتقا	طبع اول ۱۹۷۲ء نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد
ظہیر الدین مدنی ڈاکٹر	اردو ایسیز	طبع اول ۱۹۷۲ء دائرہ سر ابراہیم لمیٹڈ بمبئی
غلام حسین ڈاکٹر	اردو خطوط	طبع اول کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی
عبدالسلام خورشید ڈاکٹر	کاروان صحافت	طبع اول ۱۹۶۳ء انجمن ترقی اردو کراچی
عبدالقادر سروری	دنیائے افسانہ	طبع اول ۱۹۵۱ء مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد
عتیق صدیقی ڈاکٹر	یادوں کے سائے	طبع اول ۱۹۷۸ء مکتبہ جامعہ دہلی
فرمان فتح پوری ڈاکٹر	اردو افسانہ اور افسانہ نگار	۱۹۸۲ء اردو اکیڈمی سندھ کراچی
فرمان فتح پوری ڈاکٹر	قمر زمانی بیگم	طبع دوم ۱۹۸۱ء اردو اکیڈمی سندھ کراچی
کلیم الدین احمد	اردو تنقید پر ایک نظر	۱۹۶۵ء عشرت پبلشنگ ہاؤس کراچی
گوپی چند نارنگ ڈاکٹر	اردو افسانہ روایت و مسائل	طبع اول ۱۹۸۱ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ
مجتبیٰ حسین	ادب و آگہی	طبع اول ۱۹۷۸ء مکتبۂ افکار کراچی
محمد حسن ڈاکٹر	جدید اردو ادب	طبع اول ۱۹۷۵ء مکتبہ جامعہ نئی دہلی
محمد حسین آزاد	آب حیات	طبع ہفتم ۱۹۵۰ء سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
محمد علی ردولوی	گویا دبستان کھل گیا	۱۹۶۷ء اردو اکیڈمی سندھ کراچی
محمد ہادی حسین	مغربی شعریات	طبع اول ۱۹۶۸ء مجلس ترقی ادب لاہور
معین الدین احمد انصاری	خطوط شبلی	۱۹۶۷ء اردو اکیڈمی سندھ کراچی
وقار عظیم	فن اور فنکار	طبع اول ۱۹۶۶ء اردو مرکز لاہور
وقار عظیم	فن افسانہ نگاری	طبع اول ۱۹۳۹ء سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد
وقار عظیم	ہمارے افسانے	۱۹۶۶ء ساقی بک ڈپو دہلی

اردو ادب کی تحریکیں

ڈاکٹر انور سدید

یہ ڈاکٹر انور سدید کا ایک تحقیقی اور تنقیدی مقالہ ہے جس پر انھیں پنجاب یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے، مقالہ نگار نے اس کتاب میں موضوعاتی اعتبار سے عالمی پس منظر میں ادبی تحریکوں کا جائزہ لیتے ہوئے اردو میں ان کی ابتدا اور ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے حضرت امیر خسرو، ریختہ کی تحریک، فورٹ ولیم کالج کا بطور تحریک خاص ذکر کیا ہے۔
علی گڑھ کی علمی و ادبی تحریک اور اس دور معاشرت پر پڑنے والے اس کے دوررس اثرات کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ انجمن پنجاب کی تحریک، علامہ اقبال کی ادبی و شعری تحریک اور رومانی تحریک سے وابستگی کو اُجاگر کیا ہے۔ مقالہ میں ترقی پسند تحریک کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا ہے جس نے اردو ادب اور معاشرت کو اپنے دور میں بہت متاثر کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق اور اس کی تحریکی اہمیت، تحریکِ ادبِ اسلامی اور پاکستانی ادب کی تحریک پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔
انجمن ترقی اردو نے پہلی بار اس مقالہ کو ۱۹۸۵ء میں شائع کیا تھا۔ طلبہ اور ادبی حلقوں کے مطالبے کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۹۹۱ء میں اسے پھر شائع کیا گیا۔ اس کا تیسرا ایڈیشن زیر طباعت ہے۔ چونکہ پہلے دونوں ایڈیشن کتابت شدہ مسودے پر مبنی رہے ہیں لہذا یہ سوچا گیا کہ نیا ایڈیشن لیزر کمپوزنگ کے ذریعہ چھاپا جائے، اس سے کتاب کی ضخامت میں کمی آئے گی اور اس کی دیدہ زیبی میں بھی اضافہ ہوگا۔

اردو کی ادبی تاریخیں

ڈاکٹر گیان چند

ڈاکٹر گیان چند اردو تحقیق کا ایک معتبر نام ہے، انھوں نے ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد "اردو کی ادبی تاریخوں کا جائزہ" کے موضوع پر ایک اعلیٰ تحقیقی اور علمی کام چار سال سے زائد کی مدت میں مکمل کیا ہے۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان دو جلدوں پر مبنی اس گراں قدر مقالہ کی طباعت کا اہتمام کر رہی ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے اس ادبی تحقیق میں ادبی تاریخ نگاری، اردو کی ادبی تاریخ کے ارتقا کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے آبِ حیات، شعر الہند، اردو ادب کی تاریخ، تاریخ نثر اردو، داستانِ تاریخ اردو، اردو کی ادبی تاریخ، تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، مختصر تاریخ ادب اردو، تاریخ ادب اردو، اردو شاعری کی مختصر تاریخ، اردو کی ادبی تاریخوں کا خلاصہ، جائزہ تاریخ اردو، تعارف تاریخ اردو، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مصنف نے رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب "اردو ادب کی تاریخ" گراہم بیلی کی اردو ادب کی تاریخ (انگریزی)، کلاسیکی اردو ادب (انگریزی) مصنفہ اینمیری شمیل، محمد صادق کی تحریر کردہ اردو ادب کی تاریخ (انگریزی)، علی جواد زیدی کی اردو ادب کی تاریخ (انگریزی) اور رالف رسل کا تحریر کردہ اردو ادب کا تعارف ایک منتخب تاریخ (انگریزی) وغیرہ کا جائزہ لے کر اردو کی ادبی تاریخوں کے ارتقا کے پس منظر میں مختلف علمی و ادبی حوالوں اور معلومات کو ادب کے قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے تاکہ ان علمی و تحقیقی تصانیف کے مرتبے کا صحیح تعین کیا جاسکے۔

نیاز فتح پوری

شخصیت اور فن

ڈاکٹر عقیلہ شاہین

انجمن ترقی اردو پاکستان

نیاز فتح پوری شخصیت اور فن
ڈاکٹر عقیلہ شاہین
انجمن ترقی اردو پاکستان